پُراسرار نمبر

دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

کراچی

سچی کہانیاں

35 سال

NOVEMBER 2018

ونرز

ٹرانسفر لیٹر — افتخار چوہدری

میم جی — فرزانہ نگہت

نادانیاں — مجید احمد جائی

- عامل کامل سچی کہانیاں کا نیا ہوشربا سلسلہ جو پڑھنے والوں کو جادو کی کالی دنیا سے آشنا کرائے گا
- املتاس نہایت دلچسپ اور پراسرار سلسلہ جس کی ہر سطر خوف اور دہشت میں ڈوبی ہوئی ہے
- مسئلہ یہ ہے آپ کے مسائل کا روحانی حل، سچی کہانیاں کا مقبول ترین سلسلہ

ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی

E-mail.pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ: منزہ سہام

مدیر: دانیال شمسی

نائب مدیرہ: ماہم اوزلین

MEMBER APNS CPNE — رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی — رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

منیجر مارکیٹنگ
زین شمسی
0331-8221212

منیجر سرکولیشن
آفتاب عالم
0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893121
021-35893123

خط و کتابت کا پتا: 88-C II فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 70 روپے — جلد: 35 - شمارہ: 11 — نومبر 2018ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس OB-7 تالپور روڈ، کراچی





بس ایک پھاٹک

کچھ خبریں ہم پاکستانیوں کے نصیب میں ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آرہی' جیسے بچپن سے سنتے آئے کہ ملک نازک دور سے گزر رہا ہے۔ گرمیوں میں قحط سالی کا خطرہ' سردیوں میں سیلاب کا ڈر' بجٹ میں مہنگائی کا خوف اور ہر گزرتے دن کے ساتھ روپے کی قدرو قیمت میں گرانی' آنے والی حکومت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے اور جانے والی حکومت کی عزت کی دھجیاں چوراہوں پر...... بھارت دشمن مگر بھارتی فلموں کا سرور سب پر' چائنا دوست مگر ہر دو نمبر چیز کے میڈ ان چائنا ہونے کا الزام' الیکشن میں دولہا نے ووٹ کاسٹ کیا تو دوسری جانب وہیل چیئر پر بزرگ حقِ رائے دہی کا مقدس فریضہ انجام دیتے ہوئے' شاہینوں نے کالی آندھی کے چھکے چھڑا دیے اور چھکے نہ مارنے پر قومی ٹیم لوگوں کے عتاب کا شکار...... پہلے بھی لوگ ٹرینوں میں سفر کرتے تھے اور جو ٹرین میں سفر نہیں کرتے تھے وہ ٹرین سے کٹ مرتے تھے۔ پہلے بھی ریلوے کراسنگ بنا پھاٹک تھی اور آج بھی بنا پھاٹک ہی ہے۔ تبدیلی کا نعرہ لگانے والوں سے صرف ایک التجا ہے کہ کہیں تبدیلی لائیں نہ لائیں مگر عام پاکستانیوں کی موت ضرور تبدیل کر دیں اپنے پیاروں کی لاشوں کے ٹکڑوں کو دور تک پٹڑیوں سے سمیٹنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ زندہ تو وہ ویسے بھی بمشکل ہی ہیں نہ بجلی ہے نا پانی نہ تعلیم نہ صحت کی سہولیات' گیس بھی ناپید' کم از کم ایک پھاٹک ہی لگا دیں زبانوں کے آگے نہیں ریلوے کراسنگ پر بس یہی التجا ہے۔

منزہ سہام

احوال

مدیرہ اعلیٰ

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

عزیز احوالیو! یقین ہے کہ آپ سب اچھے ہوں گے۔ پُراسرار نمبر 1 آپ کی خدمت میں پیش کر دیا، میں نے تو خوب محبت کی اب آپ لوگ بتائیں گے کہ اِس کو کیسا پایا؟ جن لکھاریوں کی تحریریں اس بار نہیں وہ مایوس نہ ہوں پُراسرار نمبر 2 میں وہ سب شامل ہیں جو انشاء اللہ فروری میں آئے گا۔ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ میرے کہنے پر آپ سب نے بہت قلیل مدت میں پُراسرار نمبر کے لیے اپنی نگارشات ارسال کیں اور خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آئندہ بھی اسی تعاون کی طلب گار ہوں، آیئے اب بڑھتے ہیں اپنے پہلے خط کی جانب......

➤ ایم یعقوب احمدانی بلوچ ڈی جی خان سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم پیاری بہنا منزہ سہام کیسی ہیں امید ہے خداوند کریم کے کرم سے خوش وخرم ہوں گی۔ بہت ہی شکریہ کہ اتنے مان سمان عزت بخشی وہ الفاظ نہیں جو پیاری بہن کا تھینکس کہوں۔ بہت ہی خوشی ملی کہ جب آفس سے کال آئی بہترین خط کا انعام مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میرے ٹوٹے الفاظوں کو اتنا سنوار دیا۔ پیاری بہنا جی کس کس عزت افزائی پر آپ کو داد دوں میرا قلم ساتھ نہیں دے رہا جو آپ کی شان عزت خلوص پیار ایثار پر چند الفاظ بیان کروں۔ بس دعا گو ہوں کہ میری ہر ایک خوشی آپ اور آپ کے خاندان کو ملے۔ اللہ میری عمر آپ کو دے۔ پیاری بہنا مجھے کچھ بھی صحیح طریقے سے لکھنا نہیں آتا۔ مگر میں آپ کی محبت خلوص میں کیسے لکھ پاتا ہوں کوئی غلطی ہوئی ہو تو چھوٹے بھائی کو معاف کر دینا۔ اب کچھ نظر ڈائجسٹ پر ڈالیں۔ بہن بھائی کا رشتہ اور باتیں تو کبھی ختم ہو نہیں سکتیں۔ جی آپی جی آج ہم خود اس فتنے کو آگے بڑھا رہے ہیں رشتوں کو دیمک چاٹ گئی ہے پیار عزت محبت کو کھو دیا ہے بزرگوں کی باتیں تو پرانی ہوئیں، سوشل میڈیا نیا ہے کچھ نیا کر کے دیکھا ہے کہ ہم کس طرح اپنے بڑوں کی تذلیل اور ان کی شان کو بہت بڑا کبیرہ گناہ بنا کر اپ لوڈ کر کے سرخرو ہو رہے ہیں اور عقل دے ہم کو کہ اس نشے سے باز آجائیں۔ غلام جو بنے سردار بہت ہی دل افزا سلسلہ ہے ایمان کی تازگی اور آپ ﷺ کی حدیث کا پتہ چلتا ہے۔ نعت خواں، آخری گھاؤ بیسٹ جاوید راہی صاحب، ٹرانسفر لیٹر افتخار چوہدری بہت خوب بڑی دیر کی مہرباں پیارے بھائی شاہد رفیق عمدہ، میں چھوڑ دسید ابو محمد آزاد، میم جی فرزانہ نگہت کمال، تعارف پیارے بھائی عبدالغفار عابد جی جسے میں یاد تک نہیں رہتا۔ ہانی اور شاہ مرید عاکف عثمان ستم گزیدہ عمران قریشی ریحانہ اعجاز ریت کی گود میں بجنود قلم منزہ سہام جی بہت ہی کمال، صائمہ صدیقی ممتاز احمد کیا کہنا آپ کا فوزیہ اختر ستارہ، فیصل مشتاق عابدہ مغل شمسہ قمر ساڈا حق بہت خوبصورت شاندار جوش جذبے سے سب نے بہت اچھا لکھا مبارکباد سب کو، اور عامل کامل الماس، مسئلہ یہ ہے، شعروسخن کی محفلیں بہت اچھی ہیں اللہ تعالیٰ سب کو ڈھیر ساری خوشیاں دے آمین بہنا میری پکچر آفس میں ہے کاشی چوہان کے دور میں ارسال کی تھی اور ان لوگوں سے گزارش ہے جو غائب ہیں ارم ناز ڈی جی کے سے سدرہ انور علی، فرح انیس، یوں محفل کو نہ چھوڑ و چند لوگ برے لگتے ہیں محفل میں، سب سے مل کر بہت مزہ آتا ہے اب اجازت۔

☆ یعقوب بھائی! ہم آپ سب کی بدولت ہی تو ہیں، آپ لوگوں کی سچی کہانیاں سے محبت قابل فخر ہے۔ تقریباً سب لوگ رابطے میں ہیں کچھ اپنی نجی مصروفیات کے باعث خط نہیں لکھ پاتے مگر دل اور سچی کہانیاں دونوں سے قریب ہیں۔

➤ نازیہ بتول رضا کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! بہت پیاری منزہ آپی کیسی ہیں؟ امید ہے اللہ پاک کے فضل وکرم سے مزاج بخیر ہوں گے آج کافی مہینوں کے بعد آپ سے مخاطب ہوں جس کے لیے معذرت خواہ وجہ مصروفیات اور طبیعت خرابی...... دو ماہ پہلے آپ سے فون پر بات ہوئی تھی تو آپ نے نومبر کے شمارے کے لیے پُراسرار کہانی لکھنے کا کہا تھا جو باوجود کوشش کے لکھ نہیں سکی تھی لیکن اب بہت قلیل وقت میں بھیج رہی ہوں امید ہے کہ گزشتہ سالوں کی طرح روایت کو برقرار رکھتے

ہوئے میری کہانی کو بھی جگہ دی جائے گی۔ آپ کو اپنا سمجھ کر ایک شکوہ کر رہی ہوں امید ہے کہ برا نہیں مانیں گی۔ منزہ آپی میں عرصہ دس سال سے سچی کہانیاں میں لکھ رہی ہوں اور ہمیشہ مجھے یہاں سے بہت محبت اور پذیرائی ملی ہے جس کی وجہ سے میں اب تک آپ کے ادارے سے جڑی ہوں اب پچھلے سال 2017ء کی ہی مثال لے لیں کہ میری پورے سال میں سات کہانیاں شائع ہوئیں جو کہ میرے خیال میں آپ لوگوں کی محبت ہے جو مجھے مزید لکھنے پر اُکساتی ہے لیکن معذرت کے ساتھ شاید اب میری کہانیوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے پتہ نہیں کیوں لیکن دل اس بات پر بہت دکھی ہے میں نے بارہا آپ کو یاد دلایا ہے کہ میری کہانیاں آپ کے پاس اشاعت کی منتظر ہیں آپ نے پڑھی بھی ہیں لیکن اب تک اشاعت سے محروم ہیں شاید اسی وجہ سے میرا قلم رک سا گیا ہے مزید لکھنے کا دل ہی نہیں چاہتا۔ منزہ آپی میں بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں لیکن پلیز صرف ایک نظر عنایت کر دیجیے اور میرے رُکے ہوئے قلم کو پھر سے رواں کر دیجیے۔ اب کچھ رسالے کے بارے میں بات ہو جائے کہانیاں ہمیشہ کی طرح بہترین ہوتی ہیں سارے سلسلے بہترین ہیں خاص طور پر تین انعام یافتہ کہانیوں کا سلسلہ بہت عمدہ ہے اس سے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو گی۔ آخر میں ان دوستوں کا بے حد شکریہ جو میری کہانیاں پسند کر کے اس پر تبصرہ بھی کرتے ہیں جزاک اللہ۔

☆ نازیہ مجھے اچھا لگا تم نے مجھے اپنا جان کر بہت مہذب انداز میں شکوہ کیا یقین کرو تم نے ثابت کیا کہ تم رائٹر ہو میں ان لوگوں کی قدر کرتی ہوں جو خط کے ذریعے اپنی شکایت یا رائے لکھ کر ارسال کرتے ہیں۔ ماضی میں شاید یہ طریقہ رہا تھا کہ فون پر بہت باتیں ہوتی تھیں تو دیکھ لو سچی کہانیاں کی کیا حالت ہو گئی تھی میں پوری توجہ پرچوں کو دیتی ہوں اور بذریعہ خط یا احوال جواب دیتی ہوں تمہاری کہانیاں اگر میرے پاس ہیں تو ضرور شائع ہوں گی اطمینان رکھو۔

ارشد اقبال چوہان فیصل آباد سے لکھتے ہیں۔ پیاری بہنا السلام علیکم! سب کے لیے بہت سی دعائیں آپ نے جب مجھے نمائندہ کا اعزاز دیا تو آپ نے لکھا تھا کہ کئی کم ظرف لوگوں کے فون آئیں گے۔ مگر مجھے تو ابھی تک ایسا کوئی فون نہ آیا ہے۔ اگر کسی نے ایسی کوشش بھی کی تو اللہ کے فضل سے مجھے جواب دینا آتا ہے۔ ویسے مجھے انتظار ہے کہ کاش کوئی ایسا کرے...... پھر......؟ میں نے ایک علیحدہ خط سرکولیشن منیجر صاحب کے نام لکھا ہے مہربانی فرما کر یہ اُن کو دے دیں...... اب شمارہ کی طرف ایک نظر...... جاوید راہی صاحب کی آخری گھاؤ میں مرد کے ازلی ظلم کے بارے میں جو تحریر ہے۔ اللہ ایسے مردوں کو عقل دے جو عورت کو اُس کا ٹھیک مقام نہیں دیتے حالانکہ عورت ہی وہ مخلوق ہے جس نے نبیوں پیغمبروں اور ولیوں کو جنم دیا۔ ٹرانسفر لیٹر بہت اعلیٰ تحریر ہے کاش ہمارے افسران صفدر حیات صاحب جیسے بن جائیں۔ آمین منصور بلوچ صاحب کی نازو کہاں چلی گئی محبت کی لازوال مثال ہے۔ فرزانہ نگہت صاحبہ کی میم جی اس بات کا ثبوت ہے کہ سچ کا انعام اللہ ضرور دیتا ہے۔ عبدالغفار عابد صاحب کا تعارف بہت خوب ہے۔ میں اُن کے خیال سے پورا اتفاق کرتا ہوں کہ غلط کو غلط کہنے کا بندے میں ضرور حوصلہ ہونا چاہیے۔ اس طرح ہی ہم ایک اچھا معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ شکریہ عاکف عثمان کہ آپ نے ہمیں ہمارے بلوچستان صوبے کے لوک کلچر سے آگاہی دی۔ اچھی روایت ہے۔ 6 ستمبر ہمارے ملک وقوم کے لیے ایک یادگار دن ہے کہ ہم 70 سال میں اگست 1947ء اور ستمبر 1965ء کو ہی ایک قوم بنے ورنہ تو ہم بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہیں۔ اللہ ہمیں دوبارہ ایک قوم بنا دے آمین۔ ریت کی گود میں بہنا آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ خدارا ہمارے لیے کبھی کبھی ایسے ہی وقت نکال لیا کریں۔ بہت شکریہ' غفلت کے پردے صائمہ صدیقی صاحبہ واقعی عورت کی سب سے بڑی دشمن عورت ہی ہے۔ ارد گرد نظر ڈالیں۔ نند' بھاوج' ساس' بہو اور ثنا کی بہن نورین جیسی بے حس...... یہ کردار عورت کے ہی ہیں اور مرد اپنا کردار ادا کرنے میں عموماً ناکام رہتا ہے کہ ہر مہرے کو زندگی کی بساط پر اُس کے خانے میں رکھنا یہ مرد کی ذمہ داری ہے۔ لیکن اگر عورت ساتھ دے تو ہی ایسا ممکن ہے۔ خدانخواستہ میں معاشرہ میں عورت کے رول کی خامی نہیں بیان کر رہا۔ بلکہ اُس کو اُس کے اصلی کردار ادا کرنے کی درخواست کر رہا ہوں۔ بچے کی تربیت کا اسکول سب سے پہلا ماں کی گود ہی ہے۔ شمسہ قمر صاحبہ کی ساڈا حق ایتھے رکھ میں تصور صاحب جیسے لوگ نہ جانے یہ کیوں بھول جاتے ہیں اگر عورت نہ ہو تو مرد کہاں سے آئیں گے پھر ہمارا دین تو ہماری خواتین کو بہترین مقام دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ ہمیں نہ جانے کیا کچھ کہتے ہیں مگر یہ انعام ہی ہے جو عورت کو تعلیم کا سبق دیتا ہے۔ جو یہ ثابت کرتا ہے کہ اگر عورت علم حاصل کرے گی تو آگے تعلیم دے گی اور عورت اگر تعلیم یافتہ ہو تو بہترین معاشرہ جنم لے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جو عورت کو خاوند اور باپ کی جائیداد سے وراثت دیتا ہے ہم میں سے ہر آدمی اگر اپنا احتساب بشمول حکمران خود کرے آج بھی ہم دنیا پر حکومت کر سکتے ہیں۔ اللہ ہمیں اچھا مسلمان اور ایک اچھا انسان بہترین پاکستانی بننے کی توفیق دے آمین۔

دعائے مغفرت

حریم ادب میگزین کی ایڈیٹر عالیہ شمیم صاحبہ کی ساس قضائے الٰہی سے رخصت ہوئیں اللہ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

☆ارشد بھائی! آپ نے جس دلچسپی اور اپنایت کا ثبوت دیا مجھ سمیت ادارہ آپ کا مقروض ہوگیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی طرح دیگر نمائندے بھی اپنے فرائض منصبی پر توجہ دیں گے۔ آپ کا خط زین صاحب کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ امید کرتی ہوں کہ وہ جلد آپ سے رابطہ کریں گے۔ سچی کہانیاں کی کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ پُر اسرار نمبر جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا میں آپ کی رائے کی شدت سے منتظر رہوں گی۔

☆ایم حسن نظامی قبولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ قابل قدر منزہ سہام صاحبہ! اسلام خلوص امید ہے آپ اور سچی کہانیاں کے بھی احباب خیریت سے ہوں گے نومبر کا پرچہ ہاتھوں میں ہے اس میں آپ اور رائٹرز حضرات کی بیکراں محبتوں' کوششوں اور الفتوں کے سبھی رنگ جھلکتے نظر آرہے ہیں۔ اداریے میں آپ نے جس طرف توجہ مبذول کروائی واقعی انسانی زندگیاں مردہ سی ہو کر رہ گئی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اب شرم و حیا پر بے شرمی غالب سی ہوتی جا رہی ہے۔ ہم نے والس اپ پردہ کارنامے دیکھے ہیں کہ خدا کی پناہ' بس انہیں اتنا ہی کہوں گا کہ اب بھی وقت ہے ذرا ہوش کے ناخن لو اور توبہ کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا یہ نا ہو کہ اجل آپ کے بھی در بند کر دے اور پھر معافی کی مہلت بھی نہ ملے۔ بہت خوب باجی آپ نے کوزے میں دریا بند کر کے کتنے منفی چہروں کی منفی سوچ کے پرخچے اڑا دیے۔ احوال کی محفل میں پرنس صاحب کرسی صدارت پر محو گفتگو پائے مبارکباد قبول فرمائیں جی۔ نفیسہ فضل محمود' مہر پرویز احمد دولو' حمیرا وحید' ایم اے خالق بھٹی' حافظ مون شاہ' اردشے خان عروش' فیصل مشتاق' ارشد اقبال چوہان' عامر شہزاد' نعمان احمد' عبدالغفار عابد اور سعدیہ بھی نے عمدہ معیاری اور مدلل گفتگو کی اور من بلیوں اچھلنے لگا۔ ڈاکٹر محمد امین قتال اور پیر نوید شاہ کی پرچے کی اس محفل میں آمد پر ویلکم (اب آتے رہنا جی) خواجہ حسن جی ہم بھی آپ کے اس دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ محسن علی طالب یاد رکھنے اور بیکراں خلوص پر ڈھیروں شکریہ' میں نے بھائی ریاض حسین شاہد سے پرچے میں آمد پر گزارش کی تھی۔ فریدہ جاوید بہن' خدا آپ کو جلد تندرستی جیسی نعمت سے نوازے آمین۔ خولہ عرفان کے سسر انیلا حمید کے شوہر اور چیف ایڈیٹر الیاس شاکر کی اموات پر دلی دکھ ہوا۔ خداوند کریم مرحومین کو اپنی جوار رحمت میں جگہ خاص عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ تبصرے کے بھی ونرز کو مبارکباد قبول ہو۔ اور جن احباب نے میری نگارشات کو سراہا اُن کا ڈھیروں شکریہ امید ہے وہ آئندہ بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ پُر اسرار نمبر کے لیے چند ماہ قبل خونی ہوس ارسال کر چکا ہوں اب نئی تحریر زیر قلم ہے جلد ارسال کر دوں گا۔ اس ماہ کی تحریروں میں غزالہ عزیز کا ایمان افروز سلسلہ من کو بھا گیا۔ قاری محمد عثمان اور عبدالغفار عابد کا تعارف بہتر رہا۔ ویسے بائی داوے بھائی عبدالغفار عابد ہاتھ ذرا ہولا رکھیں ادب اور ادیب کی توہین نہ کریں۔ معیاری ادب اور پرچے پر دھیان دیں۔ سر جاوید راہی نے فرعون نمرود اور شداد جیسے ملعون لوگوں کا تذکرہ بہت ہی معیاری انداز سے کیا۔ افتخار چودھری نے بھی تحریر میں خوبصورت سچی سین اور عمدہ کرداروں سے نکھار پیدا کیا۔ شاہد رفیق سہو نے الفت جیسے لازوال جذبے پر عمدہ قلم چلایا۔ مقصود احمد بلوچ بھی منجھے ہوئے لکھاری ہیں ان کے لکھنے کا انداز دلچسپ رہا۔ سید ابو محمد آزاد نے روزمرہ کے نجی رویوں سے پردہ اٹھایا شنو جیسے کردار آج بھی معاشرہ میں اکثر ملتے ہیں۔ میم جی عاکف عثمان نے حجاز سے حقیقت تک کا عکس دکھا دیا ویلڈن جی...... ریحانہ اعجاز نے بھی محبتوں کی حقیقت عیاں کی۔ عمران قریشی کے ستم گزیدہ میں مراد کے فیصلے پر عمدہ تاثر دیا۔ پیر شاہ محمد قادری اور شازلی سعید مغل کی تحریریں عمدہ تاثر دے رہی ہیں غفلت کے پردے' ڈکیتی کی واردات' ممتاز احمد نے بھی موبائل کے غلط استعمال پر اچھا تاثر دیا۔ فوزیہ اختر اور فیصل مشتاق کے قلموں میں بھی نکھار پایا۔ دونوں تحریریں ایک دوسرے کے مقابل ٹھہریں۔ شمسہ قمر حقوق نسواں پر محو گفتگو ہوئیں۔ یعقوب احمدانی نے بھی معیاری لکھا۔ پاکستانی شوبز' آپ کی ڈائری اور شعر و سخن بھی سلسلے سراہنے کے قابل ہیں۔ اس طرح اکتوبر کا پرچہ بیسٹ پایا۔ آپ اور لکھاری ساتھیوں کی بیکراں محنتوں کو سلام آخر میں بھی احباب خوش رہیے اور ایک دوسرے میں مسرتیں شیئر کرتے رہیے۔ آخر میں آپ بھی کی نذر

محبتوں کے سفر میں ہیں

زمانے کی نظر میں ہیں
پکاریں جب بھی حسن کو
تمہارے ہم عمر میں ہیں

☆حسن بھائی! آپ کی تحریر شمارے میں موجود ہے۔ کیسی ہے یہ تو پڑھنے والے رائے دیں گے۔ مگر پُراسرار نمبر آپ نے کیسا پایا ضرور بتایئے گا۔

غلام مرتضٰی علوی گوجرہ سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! کے بعد عرض ہے تازہ شمارہ بروقت ملا۔ اور بہت اچھا لگا۔ شمارہ کھولا حسب معمول سب سے پہلے محترمہ منزہ سہام صاحبہ کا کالم پڑھا بہت عمدہ تھا۔ احوال کی محفل میں یوں تو سب ہی خط اچھے تھے مگر ابھی تک جو جو خط پڑھے ہیں ان میں جناب پرنس افضل صاحب' محترمہ نفیسہ صاحبہ' مہر پرویز صاحب کا خط (مہر صاحب سے عرض ہے میری کہانی ایک سچی داستان ہے اور یہ میں نے واقعہ دس سال قبل دیکھا تھا جس کردار ہمارے شہر کے دو دوست تھے جن سے میں بھی واقف تھا۔ یہ کہانی میرے ان واقف افراد کی ہے جب میں نے ان سے کہا کہ میں آپ پر سچی اسٹوری لکھنا چاہتا ہوں تو انہوں نے کہا تھا کہ لکھ لو مگر ہمارے نام بدل دینا۔ یوں میں نے اس اسٹوری میں اپنے واقف افراد کے نام کی جگہ اپنا اور عامر کا نام لکھا لیکن یہ واقعہ میرے ساتھ نہیں پیش آیا تھا بلکہ مجھے صحافتی مجبوری کے تحت اس داستان کے اصل کرداروں کے نام تبدیل کر کے اسٹوری کو لکھنا پڑا۔ کیونکہ جن افراد کے ساتھ یہ ہوا تھا انہوں نے مجھے اس شرط پر اپنی داستان لکھنے دی کہ میں ان کا نام نا لکھوں) باقی خطوط میں ملازم بھائی حافظہ مون صاحبہ' فیصل مشتاق صاحب' ارشد اقبال صاحب' عامر شہزاد' اور پیر نوید صاحب کے خطوط بہت مزہ دے گئے۔ ابھی تک جو جو تحریریں پڑھی ہیں ان میں آج کا نعت خواں' نمبر ون رہی باقی میں خالہ تندور والی' غلام جو بنے سردار' نادانیاں بھی بہت اعلیٰ لگیں۔ باقی ابھی پڑھ رہا ہوں تو ان کے بارے میں رائے نہیں دے سکتا۔ اور اس خط کے ساتھ میں اپنی ایک تحریر (سچا واقعہ) ارسال کر رہا ہوں۔ ساتھ ایک شاعری کی چھوٹی سی کاوش بھی ارسال ہے میری' امید ہے میری سچی تحریر اور شاعری کو اگلے کسی شمارے میں ضرور جگہ ملے گی۔ میری ایک انتخاب و ترجمہ شدہ تحریر پہلے سے آپ کے پاس ہے امید ہے وہ بھی جلد شائع ہو گی۔ اس کے علاوہ میں آج کل دو خوفناک کہانیاں بھی لکھ رہا ہوں جو دسمبر تک ارسال کر دوں گا تاکہ وہ 2019ء کے پُراسرار نمبروں میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ فی الحال تو 2018 کے پُراسرار نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔ آخر میں میری اپنے قارئین اکرام سے خاص دعا کی اپیل ہے میرے ماموں جان ماسٹر عبدالمجید علوی اور ماسٹر غلام رسول علوی صاحب کی صحت و تندرستی کے لیے سب دعا کریں۔

☆بھائی غلام مرتضٰی! اللہ آپ کے ماموں کو مکمل صحت عطا فرمائے پُراسرار نمبر 2 انشاء اللہ فروری میں آئے گا لہٰذا جو کہانیاں اس بار رہ گئیں ہیں وہ اگلی بار ضرور شائع ہوں گی۔ بشمول آپ کے بھی...... بالکل آپ کی تحریر میرے پاس ہے۔ انشاء اللہ جلد جگہ بنالے گی۔

حمیرا وحید واہ کینٹ سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! آپی کیسی ہیں آپ اس دفعہ پُراسرار نمبر کے لیے ایک کہانی بھیج رہی ہوں امید کرتی ہوں آپ کے معیار پر پوری اتری تو آپ ضرور پُراسرار نمبر کے لیے شامل کریں گی۔

☆اچھی حمیرا! تمہاری تحریر شمارے میں شامل ہے دیگر افسانے بھی ارسال کر سکتی ہو...... بطور ایڈیٹر تحریر کو اگر ضرورت ہو تو کانٹ چھانٹ میں خود ہی کر دیتی ہوں اور شاعری اس ماہ سے شگفتہ شفیق صاحبہ دیکھیں گی لہٰذا بے فکر ہو جاؤ۔ کسی قسم کا بھی معاوضہ ارسال کرنے کی ضرورت نہیں ہم وہ اساتذہ ہیں جو فیس نہیں لیتے۔

ڈاکٹر طارق محمود آکاش ڈسکہ سے لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے تمام لکھنے اور پڑھنے والوں کو اور آپی منزہ سہام اور ساری ٹیم کو ڈاکٹر طارق کی طرف سے محبتوں بھرا آداب' قابل احترام بڑی بہن منزہ سہام آپ نے پچھلے ماہ کسی دوست کے خط کے جواب میں فرمایا کہ ہمیں بھی ڈاکٹر طارق کا انتظار ہے تو دل نے کہا کہ فوراً حاضری لگوائی جائے مگر ہمارے کچھ میڈیکل کیمپس چل رہے تھے تو دن رات مصروفیت کی وجہ سے خط لکھنے سے تاخیر ہو گئی۔ اس لیے معذرت...... مگر اس بار 12 اکتوبر کو ہی ڈائجسٹ منگوایا اور فوراً خط لکھنے بیٹھ گئے میں بہت مشکور ہوں آپ کی محبت کا کہ آپ نے ہمیں یاد کیا میں شکریہ ادا کرتا ہوں اپنی پیاری آپی فریدہ جاوید فری کا کہ وہ ہر ماہ مجھے یاد کرتی ہیں۔ اور پیاری آپی ہم بھی ہر نماز میں آپ کی صحت کے لیے دعا کرتے ہیں آپ کا انٹرویو ہمیں بالکل پسند نہیں آیا۔ ارے بھئی ہمیں آپ کا تفصیلی انٹرویو چاہیے۔ آپ کے لیٹر کی طرح مختصر نہیں اور ہمیں آپ کی نئی

کتاب کا بھی بہت انتظار ہے۔ میں شکر گزار ہوں پرنس افضل شاہین کا کہ انہوں نے ہمیں یاد کیا۔ تم نے دی آواز لو میں آ گیا۔ فیصل مشتاق خوش رہو چھوٹے بھائی آپ تو ماشاء اللہ سے سچی کہانیاں کے مستقل رکن بن گئے ہو۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ ہم آپ کو مزید ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں تمہارا قلم رُکنا نہیں چاہیے اور ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کا بھی خیال رکھنا۔ ہمارے محترم بڑے بھائی ممتاز احمد اپنی خوبصورت تحریر کے ساتھ حاضر ہیں۔ جناب آپ کی ہر کہانی عمدہ اور اعلیٰ ہوتی ہے۔ ہم آپ کو آپ کی نئی کتاب 'لاری اڈہ' کی اشاعت پر کہتے ہیں 'لکھ لکھ مبارکباں' محترم جناب حسن نظامی صاحب واہ جی واہ آپ کی تو کیا ہی بات ہے۔ آپ کے خطوط تو لاجواب ہوتے ہیں۔ خوش رہیے بابا جی...... اور ہمیں بھی یاد کر لیا کریں کبھی...... حاجی مجید احمد جائی صاحب ماشاء اللہ سے خوبصورت کتاب کی اشاعت پر مبارکباد آپ کی تحریریں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ خوش رہیے 'اروشے خان اور حمیرا وحید کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ محسن علی طالب بھائی کیسے ہیں آپ' کہانیوں میں جاوید راہی کی آخری گھاؤ مجید جائی کی نادانیاں فیصل مشتاق کی خواب زادی' اور ممتاز احمد کی قسمت کی لکیر بہت پسند آئیں۔ عابدہ مغل کی مینا تو جعلی ہے بہت اچھی لگی۔ سچی کہانیاں ماشاء اللہ سے روز بروز بہتر سے بہترین ہوتا جا رہا ہے۔ تمام دوست احباب بڑی محنت سے تحریریں لکھتے ہیں۔ اور آپی منزہ اُن کو خوبصورتی سے چھاپ رہی ہیں۔ خدا آپ کو مزید ترقی دے انشاء اللہ اگر خدا نے زندگی رکھی تو آئندہ مزید تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے نماز اور قرآن میں باقاعدگی ہر مسئلے کا حل ہے۔ خوش رکھیں خوش رہیں کسی کی بھی بات کا برا مت منائیں زندگی بہت تھوڑی ہے۔

☆ طارق بھائی! سب سے پہلے کتاب بھجوانے کا شکریہ...... آپ نے میری پکار کا جواب احوال میں شرکت کی صورت دیا بہت شکریہ' سچی کہانیاں آپ کا اپنا رسالہ ہے پابندی سے حاضری لگایا کریں۔

راکی ولسن لکھتے ہیں سچی کہانیاں کے تمام دوست احباب کو سلام عرض ہے میں کافی عرصہ بعد آپ کی محفل میں شامل ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں آپی منزہ سہام جس طرح سے سب کو خوش آمدید کہتی ہیں شاید ایسے کوئی دوسرا کہہ ہی نہیں سکتا۔ میں سچی کہانیاں کا پرانا قاری ہوں۔ مگر نجی معروفیات کی بنا پر کافی عرصے بعد لکھ سکا۔ مگر اب میں نے عہد کیا ہے کہ باقاعدگی سے لکھوں گا اور آپ کی بزم میں حاضری لگواؤں گا۔ ایک کہانی ارسال کر رہا ہوں امید ہے قریبی اشاعت میں جگہ ملے گی۔ میں اپنے دوستوں مجید احمد جائی' ممتاز احمد' فیصل مشتاق پرنس افضل شاہین اور ڈاکٹر طارق محمود آکاش کو سلام عرض کرتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو آئندہ بھی ملاقات ہوگی۔

☆ ولسن بھائی! میں آپ کو احوال میں خوش آمدید کہتی ہوں۔ بھائی معروفیات تو سب کے ساتھ ہیں مگر جو عزیز ہوتا ہے اُس کو تو وقت دینا ہی پڑتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ سچی کہانیاں آپ کو سب سے زیادہ پیارا ہے۔ آئندہ بھی آپ کی منتظر رہوں گی۔

رفعت خان کراچی سے لکھتے ہیں۔ بہت ہی پیاری منزہ سہام سہام کے نام آداب' کیسی ہیں آپ پیاری سی منزہ سہام اور باقی پورا اسٹاف آپ سب لوگوں کی بھرپور حوصلہ افزائی نے مجھے وہ خوشی دی ہے کہ جس کا کوئی حساب نہیں خاص طور سے منزہ جی آپ نے تو کمال ہی کر دیا کہ جب ستمبر میں اپنا خط اور نظم وحید مراد دیکھی تو میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ مجھے یہ اعزاز مل چکا ہے مزید براں اکتوبر میں اپنی کہانی وہ ایک ڈکیتی' دیکھی تو دل بلیوں اچھلنے لگا۔ سب نے یہ ریمارکس دیے کہ یہ رسالہ تو بہت اچھا ہے اب ہم بھی اسے ہر مہینے خرید کر پڑھا کریں گے دیکھا منزہ جی میری ایک کہانی سے کتنے لوگ سچی کہانیاں کے دیوانے ہو گئے۔ یہ بات بھی میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہے خدا نے چاہا تو یہ رسالہ اور ترقی کرے گا اور منزہ جی آپ کا اقتباس اتنا زبردست ہوتا ہے کہ کیا بتاؤں میں سب سے پہلے اُسے ہی پڑھتی ہوں میری ایک اور کہانی 'انمول محبت' وہ کب چھپے گی ابھی میں نے مزید دو کہانی اور کچھ نظمیں ارسال کی ہیں آپ مجھے بتائیں کہ وہ چھپنے کے قابل ہے کہ نہیں کیونکہ مجھے اتنا تو یقین سا ہو چلا ہے کہ آپ لوگ کم از کم کسی کی دل آزادی نہیں کرتے اور کوشش کرتے ہیں کہ سب کو اس کا حق ملے۔ واہ جی منزہ آپ کا جواب نہیں آپ نے مجھے ایک ایسی منزل پر لا کھڑا کیا ہے جہاں پر مجھے اپنے آپ کو تنقیدی طور پر جائزہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ سچی کہانیاں اور ادارہ اس مبارکباد کا بہت زیادہ مستحق ہے کہ لوگ اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کریں کیا پتہ پھر خدا بھی ہم پر مہربان ہو جائے اور بارش جیسی نعمت اور دیگر آسانیاں فراہم کر دے اس کے لیے ہم سب کو ایک ہونا پڑے گا کیونکہ اتحاد میں ہی تو برکت ہے اور پھر ہم سب تو امت محمدی ہیں اور یہ اعزاز ہمارے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے اور کیا کہوں لکھنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ ایک ساتھ تو بیان نہیں کیا جا سکتا نہ اب ہم سب کے سامنے آہستہ آہستہ جلوہ گر ہوں گے

مبارکباد

مریم شاہ بخاری کے صاحبزادے سید محمد حُر حسین کی آمد پر ادارہ مبارکباد پیش کرتا ہے۔

آیئے ہم سب مل کر دعا کریں کہ خدا ہم سب کی مشکلات آسان کرے اور سچا مومن بننے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

☆رفعت خط لکھنے کا شکریہ مگر سچی کہانیاں میں چھپنے والی کہانیوں اور دیگر سلسلوں پر رائے ضرور دیا کرو اس سے کامیاب تحریریں سلیکٹ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کہانیاں پڑھ کر تمہیں آگاہ کروں گی۔

◄فوزیہ اختر کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ السلام علیکم! امید ہے آپ بخیر و عافیت سے ہوں گی۔ دوشیزہ اور سچی کہانیاں میرے پسندیدہ ڈائجسٹ ہیں ایک عرصے سے ان کا مطالعہ کر رہی ہوں تمام کہانیاں اپنی جگہ بہترین ہیں۔ دوشیزہ کے لیے ایک افسانہ ارسال کر رہی ہوں امید کرتی ہوں آپ کو پسند آئے گا۔ ماہ ستمبر کا دوشیزہ ابھی زیر مطالعہ ہے اس لیے تبصرہ نہیں کر سکتی۔ سچی کہانیاں کے لیے ایک کہانی 'ستارہ' بھیجی تھی۔ کب تک شائع کریں گی۔

☆ڈیئر فوزیہ! کہانی آپ کی اکتوبر کے شمارے میں شامل تھی۔ 'ستارہ' امید ہے سچی کہانیاں کا پی آپ کو مل گئی ہو گی فروری کا سچی کہانیاں پُراسرار نمبر 2 ہو گا میری خواہش ہے کہ آپ کی تحریر اس میں شامل ہو۔

◄نفیسہ فضل محمد کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری بیٹی منزہ خوش رہو پُراسرار نمبر کے لیے یہ واقعہ جو سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے مگر بہت چھوٹا ہے بھیج رہی ہوں پرچہ میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں ساتھ ہی آپ کی ڈائری کے لیے اپنے اشعار بھیج رہی ہوں جو اپنی والدہ مرحومہ اور بھائی منیر جب بیمار تھے 18 برس پہلے لکھے تھے میری طرف سے ادارے میں سب کو دعا و سلام۔

☆نفیسہ آنٹی! آپ کی پُراسرار کہانی شمارے کا حصہ ہے اور اس بار ڈائری صفحات کی کمی کی وجہ سے شائع نہیں کی جا رہی۔ دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔

◄ایم اے خالق بھٹی رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ محترمہ باجی منزہ سہام صاحبہ' السلام علیکم! آپ کی بھرپور توجہ سے سچی کہانیاں میں رونق بڑھ رہی ہے آپ کا اعلان ماہ نومبر کا شمارہ پُراسرار نمبر ہو گا تو میں نے بھی جنات کے حوالے سے اپنی عزیزہ پر بیتا ایک واقعہ تحریر کر کے ٹی سی ایس کو بیز ڈاک کے سپرد کر دیا ہے جو یقیناً آپ کی ٹیبل پر ہو گا۔ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کی مصنفہ باجی خولہ عرفان کے سسر باجی انیلا حمید کے شریک حیات اور چیف ایڈیٹر الیاس شاکر کی وفات پر بہت دکھ ہوا ہے اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے آمین۔ باجی منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ خوب تھا واقعی ہم فیس بک وغیرہ کو تفریح اور مفاد عامہ کی بجائے منفی استعمال کر کے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اب کچھ ہیلو ہائے احوالیوں سے ہو جائے۔ پرنس افضل شاہین آپ نے سچی کہانیاں کی محبت میں اپنی نیند قربان کی ہے ہم آپ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ آپی نفیسہ فضل محمود کے دو خطوط شمارے میں شمارہ سے محبت کا بے مثل اظہار ہے ویلڈن آپی' مہر پرویز دولو اسلام سے دوری کے باعث ہم ڈھونگی پیروں اور عاملوں کے چنگل میں پھنس رہے ہیں۔ حسین خواجہ آپ کے ماموں اور دیگر عزیزوں کی وفات پر دکھ ہوا ہے۔ ملازم حسین شیرازی آپ کے تعارف کا ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔ سسٹر حمیرا وحید آپ کے شہر میں ہماری دبنگ باجی ماریہ عرفان رہتی ہیں ان کی خیریت سے ہمیں نوازیں' ڈاکٹر محمد امین آپ ادب کی دنیا میں واپس آئے ہیں تو انشاء اللہ آپ کو خوشیوں کی سوغات سے ساتھی نوازیں گے۔ حافظ مون شاہ منفی رویوں کے خلاف جنگ میں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں قدم بہ قدم' باجی تحسین جو نیجو ناغہ کیوں؟ سسٹر اردو شمے خان عروش بہاولپور کی میٹھی دھرتی سے قبل آپ کا تعلق کس علاقے سے تھا؟ محسن علی طاب' سسٹر فریدہ فری' فیصل مشتاق' ایم حسن ارشد اقبال چوہان' عامر شہزاد کو سلام پیش کرتا ہوں۔ پیر نوید شاہ ہمارے سینئر رائٹرز پیر سید مقیم نوشاہی آج کل سچی کہانیاں سے غائب ہیں آپ ہی انہیں آواز دیں نعمان احمد آرائیں اچھی تنقید باعث اصلاح ہوتی ہے گڈ برادر' عبدالغفار عابد آپ ہمارے سینئر رائٹر ہیں۔ آپ نے ایک ہفت روزہ صدائے ظفر کے ڈپٹی ایڈیٹر بن کر اور متعدد اعزازات حاصل کر کے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ آپ کا تعارف بھی خوب ہے صرف تاریخ پیدائش اور دیگر مشاغل کی کمی تھی۔ میری باجی منزہ سہام صاحبہ سے یہی درخواست ہے کہ تمام رائٹرز کے تعارف شائع کیے جائیں تاکہ ہم سب ساتھیوں سے متعارف ہو سکیں۔ باجی منزہ سہام بھی اچھی تحریر ریت کی گود میں لائیں تین بیٹیوں کا غم ہر ماں کے لیے ناقابل

برداشت ہی ہوتا ہے لیکن ایک ماں کو کیا معلوم چولستان یعنی ریت کی یہ سرزمین کتنی جانوں کو نگل کر بھی آنسوؤں سے عاری ہے۔ اپنی پسندیدہ رائٹر باجی فرزانہ نگہت کی تحریر میم جی پڑھ کر مزہ آ گیا انہوں نے کوئٹہ سے امریکہ تک سیر کرادی ہے ویلڈن سسٹر شازلی سعید مغل کی سلسلہ وار الماس کی قسط نمبر 12 اپنی دلچسپی کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور آئندہ قسط کا انتظار بھی' ونر حنا بشریٰ' مجمد شہزاد اور کوثر اسلام مبارکباد' مقصود احمد بلوچ کی تحریر نازو کہاں چلی گئی؟ ایک فوجی افسر کو اپنی محبت کو پانے کی خوشی اور جدائی کا غم لیے ہوئے ایک اچھی تحریر ہے۔ غزالہ عزیز کی حضرت خباب بن ارت کے واقعات ایک ساتھ پہلی مرتبہ زیر مطالعہ آئے ہیں شکریہ سسٹر غزالہ عزیز...... حافظ مون شاہ بخاری نے نعت خواں قاری محمد عثمان کا اچھا تعارف کرایا ہے۔ آخر میں میری قرۃ العین زینب ایڈووکیٹ' باجی رضوانہ کوثر' سرمد عباسی' ٹرپل اے' شانی خان' عمران رضا' مخدوم سسٹرز' پروفیسر منیبہ سلطانہ صاحبہ' باجی نجمہ حمید' ملتان اور مظفر گڑھ کی بہنوں سے گزارش ہے جلد تشریف لائیں ان رائٹرز کے قریب رہنے والے رائٹرز اور احوالیوں سے درخواست ہے کہ ان سے رابطہ کریں۔

☆ خالق بھائی! آپ نے تو سچی کہانیاں کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں کو آواز دے کر مجھے وہ سنہرا دور یاد دلا دیا جب دانش دیروی مرحوم اور شمیم نوید مرحوم جیسے بلند قامت ایڈیٹران سچی کہانیاں کی نوک پلک سنوارا کرتے تھے۔ آپ کی کہانی موصول ہوگئی ہے اور یہ میں نے پُراسرار نمبر 2 جو انشاء اللہ فروری میں آئے گا اس کے لیے سنبھال لی ہے۔

ملازم حسین شیرازی بھکر سے لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ السلام علیکم! لکھاری قاری اور ایڈیٹر کے درمیان محض دعا سلام کا رشتہ نہیں ہوتا بلکہ باہمی مشاورت' آراء' تجاویز پر سیر حاصل ادبی گفتگو پر عمل کر نا رشتہ استواری ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی بات ناگوار ناشائستہ برخلاف مزاج اسے ادبی رشتہ میں قابل گرفت یا دراثر نہ گردانی جائے بلکہ نیک نیتی پر معمول سمجھا جائے۔ جب آپ ملک سے باہر جائیں یا دیگر امور میں مصروفیات پیش ہوں تو اپنی ذمہ داریوں کو ملحوظ خاطر سمجھتے ہوئے اُن کی تکمیل احسن طریقے سے نبھائیں۔ ہمیں اس بات کا ادراک ہے کہ آپ سے بڑھ کر ادبی ذمہ داریوں کا کس کو احساس ہوگا بزرگوں کے نقش پا پر عمل پیرا ہونا آپ جیسی سعادت مند فرض شناس' اور نیک دل خاتون سے زیادہ کون ہوگا۔ سچی کہانیاں اور دیگر رسائل اور آپ لازم ملزوم ہیں۔ قارئین آپ کی عنایتوں کی طالب' چاہتوں کے متمنی اور آپ کی مہربان سرپرستی کا سایہ اپنوں کے سروں پر دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ شمارہ کی کمی بیشی کو بغور جانچنے اور پرکھنے میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں تحریری لغزش کی معذرت مختصراً تبصرے کی طرف آتے ہیں۔ تازہ شمارے کا سرورق زیادہ اثر انگیز نہیں شاید آپ کی عدم موجودگی میں متعلقہ افراد اپنی ذمہ داریاں عمدگی سے ادا کرنے میں پہلوتہی کرتے ہیں۔ اداریہ حالات حاضرہ کے پیش نظر دلوں کو گرماتا' ذہنوں کو جھنجھوڑتا موثر اداریہ' واقعی ہماری خوشی غم صرف ایک بٹن کے دبانے کی دوری پر ہے۔ ہماری عزتیں عصمتیں اپنی خود ساختہ اور بے مقصد لایعنی ترقی کی محتاج ہیں اپنوں سے دوری اور نئے رشتوں کی تلاش میں سرگردانی مطمع نظر ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ سب کہانیوں وخطوط پر سیر حاصل اور مفصل تبصرہ ہوتا کہ لکھیت حضرات اپنی صلاحیتوں' اہلیتوں کو جانچ سکیں۔ لیکن اگر اختصار سے لکھیں جائیں تو دیگر لکھاری حضرات کو لکھنے اور سچی کہانیاں میں شامل ہونے کے مواقع میسر ہوں گے۔ کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں محنت اور لگن سے تحریر کی گئیں۔ جاوید راہی' منزہ سہام' شاہد رفیق سہو' مقصود احمد بلوچ' مجید احمد جائی' ممتاز احمد' فیصل مشتاق' ودیگران کی تحریروں میں دلکشی و مقصدیت برقرار رہی مبارکباد' عبدالغفار عابد تعارف مختصراً لیکن آپ کے بارے میں معلومات اچھی حاصل ہوئیں۔ سب سے پہلے عبدالغفار عابد آپ کے خط کا انداز بیاں عمدہ لگا۔ اسی کے ساتھ میڈم نے آپ کو وارننگ دی ہے کہ اگر آپ اپنی پرانی روش پر قائم رہے تو اس کا علاج قینچی کی تیز طرار دھار...... اور میری طرف سے ایک بار پھر گزارش کہ کام جذبات کے ساتھ کریں جذباتی ہو کر نہ کریں' آپ میں بہت Potential ہے جو آپ کی مثبت سوچ کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ نفیسہ فضل آپ کے خطوط میں مٹھاس کی چاشنی اور خلوص کی مہک پائی جاتی ہے جو دلوں کو سکون وقرار دیتی ہے اپنا خیال رکھیں۔ پرنس افضل شاہین احوال نامے میں آپ کے خط سے ابتدا ہوئی تحریر اچھی لگی۔ مہر پرویز دولو آپ کی باتوں میں خاصا وزن ہوتا ہے انداز بیاں نہایت موثر ہوتا ہے سلام عرض' حسین خواجہ عرصہ بعد انٹری دی ہم آپ کے دکھ درد وغم میں برابر کے شریک ہیں۔ محسن علی طالب یاد کرنے کا شکریہ آپ کے مبارک نام کی طرح تحریر بھی عمدہ رہی سلام' فریدہ فری' آپ کا تحریر کردہ چند سطروں پر مشتمل ہے لیکن پسند آیا۔ فیصل مشتاق غزل خط بہترین قرار پانے پر مبارکباد آپ کا خط دل کو چھونے لگتا ہے۔ ایم حسن الفاظ کا چناؤ اور استعمال خوب کرتے ہیں۔ ذخیرہ الفاظ قابل تحسین ہیں۔ ارشد اقبال چوہان سچی کہانیاں سے آپ کی دلچسپی اور لگن داد کی مستحق

ہے عمدہ آراسے مستفید کرتے ہیں عامر شہزاد خوب صورت تبصرہ سے قارئین کو محظوظ کرتے ہیں ماشاء اللہ' نعمان احمد آرائیں میں نے عبدالغفار عابد ساحل ابڑو سے گزارش کی کہ وہ جھگڑے کی باتوں سے اجتناب کریں زیادہ طول نہ دیں آپ جیسے باصلاحیت لکھاریوں کو زیب نہیں دیتا۔ آپ سے بھی گزارش ہے کہ باتوں کی طوالت ادب کی خدمت نہیں اس کا اب خاتمہ ہونا چاہیے ہمیشہ کی طرح قارئین میں محبتوں اور ادب کے پھول نچھاور کرتے رہیں۔ ناراضگی معاف محترمہ منزہ سہام صاحبہ...... میں نے ستمبر 2018ء کے شمارے کے لیے خط ارسال کیا تھا شاید باہر جانے کی وجہ سے نہ مل سکا۔ وہ خط اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اگر کوئی سچی کہانیاں پر بے جا بے مقصد تنقید کرے تعصب اور جلاپے کا اظہار کرے تو اس کا جواب (اخلاقی اور ادبی قیدوضوابط میں رہ کر) دینا بہت ضروری ہے یہی گزارشات کی تھیں۔ حقائق سے آگاہی الاولی جذبات کا اظہار اہمیت رکھتا ہے۔ بہرحال بحیثیت چیف ایڈیٹر چیف مدیرہ اعلیٰ آپ کی اپنی صوبدید ہے۔ پُراسرار نمبر کے لیے اپنی سچی آب بیتی پر مشتمل بلائے جان ارسال کردی ہے۔ باقی کہانیاں آپ کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں امید ہے گرد آلود نہ ہوں گی۔ دو تین کہانیاں لکھ چھوڑی ہیں۔ بعد میں مذکورہ بالا شائع ہونے کے بعد بھیج دوں گا۔ آپ کی عنایتوں نوازشوں کا بہت بہت شکریہ اجازت چاہتا ہوں۔ وسلام امید ہے تعارف آپ کی فائلوں کے سب سے نیچے منتظر نہ ہوگا۔

☆ شیرازی بھائی! بالکل نہیں آپ کا تعارف دسمبر میں شائع ہونے کے لیے بالکل تیار ہے۔ عابد بھائی آج کل خاندان میں شادی میں مصروف ہیں اس لیے میری قینچی آرام کررہی ہے۔ آپ کی کہانی شمارے میں موجود ہے۔ اکتوبر کا سچی کہانیاں محرم کی چھٹیوں کی وجہ سے جلدی پریس چل گیا تھا اس لیے آپ کے خط کے ہمراہ کئی خطوط شامل ہونے سے رہ گئے اس بار ان سب کو رسید دے رہی ہوں...... پُراسرار نمبر پر رائے ضرور دیجیے گا۔

◆ ہاجرہ عمران لاہور سے لکھتی ہیں۔ اسلام علیکم۔ پیاری اپیا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری تحریر "نصیب" کو سچی کہانیاں کا حصہ بنایا۔ آپ کی محبت کہ مجھے شمارہ بھجوایا۔ اپیا منزہ، آپ کی تعریفیں اپنی لکھاری دوستوں سے سننے میں آتی رہتی ہیں اس پر الف کتاب پر آپ کا انٹرویو پڑھ کر بھی آپ کی شخصیت کے بارے میں جاننے کا نادر موقع ملا۔ آپ کی شخصیت نے کافی متاثر کیا اسپیشلی جب آپ نے ایڈیٹر کی پرسنیلٹی پر بات کی اس وقت میرے ذہن سے ڈائجسٹ رائٹر میں جو ایڈیٹر کا تصور تھا وہ زائل ہوگیا۔ اس کی جگہ اس ایڈیٹر نے لے لی جن کی تصاویر کچھ دن پہلے فیس بک پر اپنی دوست کی وال پر دیکھیں۔ اب میری نظر میں ایڈیٹر ایسی ہوتی ہے میم "منزہ سہام" جیسی۔ اس کا ذکر میں نے اپنے ایک افسانے میں بھی کیا ہے۔ اللہ آپ کو سدا سلامت اور خوش رکھے۔ اب میں اپنی بھیجی گئی تحریر کے بارے میں استفسار کرنا چاہوں گی؟ برائے مہربانی "عکسِ آئینہ" کے بارے میں بتا دیجیے کہ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں۔ بہت دنوں انتظار کر کے میں نے سوچا میل کر کے پوچھ لوں۔ بہت مہربانی اور کرم نوازی ہوگی اگر آپ اپنی قیمتی رائے سے مستفید کردیں۔ میری مزید تحاریر آپ کی عنایت اور توجہ کی منتظر ہیں۔

☆ اچھی لڑکی! تمہاری تحریر اچھی تھی اسی لیے سچی کہانیاں کا حصہ بنی مجھے خوشی ہوئی کہ تمہارے ذہن میں مدیرہ کی تصویر اب مثبت ہے تمہاری تحریر میرے پاس ہے کچھ وقت دو پڑھ کر آگاہ کروں گی۔ اور احوال میں شرکت کیا کرو ایک بات ذہن میں رکھو ایک ماہ کے اندر اندر ایک ہی کہانی دوسرے رسالے والوں کو دینا بہت غلط رویہ ہے اس طرح تمہاری تحریر شائع تو ہوجائے گی مگر کہیں بلیک لسٹ نہ ہو جاؤ لہٰذا جلد بازی مت کرو اور کہانی ارسال کر کے انتظار کیا کرو۔

◆ ریحانہ اعجاز کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم...... پیاری منزہ جگ جگ جیو...... سچی کہانیاں اکتوبر کا شمارہ مجھے ازحد خوشی سے دوچار کرگیا کہ اس میں پبلش ہونے والی میری کہانی میرے لیئے کسی سرپرائز سے کم نہ تھی، بے اختیار دل نے چاہا سچی کہانیاں کے لیئے اپنے دلی جذبات بیان کروں جو کہ خوشی سے بیان سے باہر ہیں، گو کہ سچی کہانیاں سے کافی عرصے کی آشنائی ہے، وقتاً فوقتاً زیرِ مطالعہ بھی رہا ہے لیکن اب یوں لگتا ہے اس سے مستقل ناتا جڑ گیا ہے، پہلی بار سچی کہانیاں کا شمارہ مکمل پڑھا اور بہت اچھا لگا، کبھی دعا کی تھی کہ میں بھی کچھ ایسا لکھ سکوں جو معیاری ڈائجسٹس کا حصہ بن سکے اور میری یہ دعا اللہ نے قبول کی" سچی کہانیاں" جیسے معیاری پرچے میں اپنا افسانہ دیکھنا ایک ایسی خواہش کی تکمیل ہے جس کی تمنا کوئی بھی قاری کرسکتا ہے، خدا کے بعد میں پیاری منزہ کی دل سے شکر گذار ہوں جن کی بدولت میرے الفاظ قارئین تک پہنچے، اب ایک نظر اکتوبر کے شمارے پر ،نعت خواں" قاری محمد عثمان" سے ملاقات پڑھ کر ان کی اس بات پر یقین کامل ہوا کہ "خدا کی قدرت پر یقین کا دوسرا نام دعا ہے" بہت سی ایمان افروز باتیں پڑھنے کو ملیں، بلاشبہ ثنا خواں بہت خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں اللہ اپنی ثنا کے لیئے منتخب کرتا ہے

،شمارے کی پہلی کہانی نے ہی دل درد وکرب سے بھر دیا، " آخری گھاؤ" پڑھ کر ایک عورت کی تذلیل پر دل خون کے آنسو رو اٹھا، لیکن مجھے ایک بات سمجھ نہیں ائی کہ جب ایک مرد دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اُسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی، کجا کہ بیوی کی اجازت۔؟۔۔ "فاروق" جیسا مرد جو مکمل طور پر آزاد و منش تھا، ہر کام کے لیئے آزاد، نہ ماں باپ کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ دنیا کا کوئی خوف، وہ بھلا دوسری شادی کے لیئے بیوی کی اجازت کا کیونکر منتظر تھا۔؟۔۔ اس قدر ظلم کہ دھرتی بھی کانپ اٹھے، ایک نہتی مظلوم عورت پر۔؟۔ کیا یہ انسانیت کی توہین نہیں۔؟۔۔ کیا مرد عورت کا ٹھیکیدار ہے جو جب چاہے اُسے بنا دے جب چاہے بگاڑ دے۔؟" ٹرانسفر لیٹر" نے زندگی کے تلخ ترین موضوع کے ساتھ دل میں گھر کر لیا، یہ چوہدری، یہ وڈیرے یہ لوگ دنیا میں خدا بنے پھرتے ہیں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ عبرتناک ہونا چاہیئے، مصنف نے کہانی پر مکمل گرفت رکھتے ہوئے بہترین پلاٹ ترتیب دیا، سسپنس اور بھرپور تجسس لیئے یہ کہانی بھی آنکھیں نم کر گئی کہ ہر طرف عورت کی بے حرمتی ہی دیکھنے کو ملتی ہے، ہر طرف گھاگ شکاری معصوم بیٹیوں پر اپنی نظریں گاڑے انسانیت سوز سلوک کرتے نظر آتے ہیں، ایسے میں ایس پی جیسے لوگ بند روزن میں ہوا کا تازہ جھونکا محسوس ہوتے ہیں، لیکن افسوس وہ بھی صرف " ٹرانسفر لیٹر " جیسے اقدام ہی کر پاتے ہیں، بہترین کہانی لکھنے پر مصنف افتخار چوہدری کو ڈھیروں داد...... بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے، ایک ہلکی پھلکی کہانی مزہ دے رہی تھی کہ انجام افسردہ کر گیا۔ " نازو کہاں چلی گئی" اچھی کہانی تھی، اور نادانیاں میں رئیس ماں باپ کی اولاد کو نادانیوں کی انتہا پر پایا جس نے اپنی دین و دنیا دونوں اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالے، " میاں چھوڑو" خالہ تندور والی" میم جی " اور دیگر تمام کہانیاں بہت اچھی لگیں خاص طور پر " ریت کی گود میں " پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے، منزہ جی یہ واقعہ جب پیش آیا تو ہر خبر کی طرح اس کے بارے میں بھی پڑھا تھا، لیکن آپ نے کہانی کی صورت بیان کر کے اس خبر کی تمام تر بدصورتی کو بڑی خوبصورتی سے الفاظ کا پیرہن عطا کیا جو سیدھا دل میں اتر گیا، "ہانی اور مرید شاہ" کی رومانوی داستان سحر انگیز رہی، جس میں آج کل کے تھرڈ کلاس عشق کی بجائے درویشانہ عشق کے تذکرے پڑھنے کو ملے، مجموعی طور پر پورا شمارہ بہترین تھا، تمام مستقل سلسلے بھی پسند آئے اور انشاء اللہ جلد ہی سب میں شرکت کا ارادہ ہے، شعروسخن میں اپنی نظم دیکھ کر ازحد خوشی ہوئی، منزہ جی جب جب ہم تنہا ہوتے ہیں تب آپ جیسے ادب سے وابستہ لوگوں کی بدولت ہماری تنہائی میں جو بہترین ساتھی ہمیں میسر آتے ہیں وہ بھی ہیں آپ کی محنتوں کے ثمر، وہ تمام ڈائجسٹ جو ہمیں تفریح کے ساتھ ساتھ اپنے دوست ہونے کا احساس بھی دلاتے ہیں اور دنیا کے اتار چڑھاؤ سے باخبر بھی رکھتے ہیں، دنیا میں پیش آنے والے حالات و واقعات سے نبرد آزما ہونے کی ہمت بھی عطا کرتے ہیں، بے شک مطالعہ ہماری زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے، اور اچھے ادب کا مطالعہ ہمارے کردار کو تراشنے میں بھی مدد دیتا ہے، اللہ آپکو اپنی امان میں رکھے جن کی بدولت ہمیں اچھا ادب پڑھنے کو ملتا ہے، دعا ہے اللہ سے کہ اللہ " سچی کہانیاں" کو بام عروج عطا کرے، قارئین اور مصنفین کے درمیان باہمی تعلقات اور مظبوط بنائے، آمین...!... انشاء اللہ جلد ہی سچی کہانیاں کے لیئے نئی کہانی لکھوں گی، شاد رہیئے آباد رہیئے...... آمین

☆ ڈیئر ریحانہ! تم جیسے اچھے لوگوں کا ساتھ ہی سچی کہانیاں کو درکار ہے۔ ادب سے جڑے لوگوں کو باادب ہونا چاہیے اور مدیر کو غیر جانبدار مگر ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے...... بہرحال میں امید کرتی ہوں کہ تم مجھے پُراسرار نمبر 2 کے لیے زبردست سی کہانی جلد ارسال کرو گی۔

◄ اروشہ خان عروش' بہاولپور سے لکھتی ہیں۔ اسلام علیکم! پیاری منزہ سہام جی اور سچی کہانیاں ریڈرز اینڈ رائٹرز ......سلامت رہیں خوش رہیں خوشیاں بانٹتے رہیں آپ سب اب آتے ہوں سچی کہانیاں سرورق کی طرف بہت فریش سرورق دیکھ کے من کو بھلا لگا' پیاری ریحانہ اعجاز اور فیصل مشتاق بھائی کا نام کہانیوں میں دیکھ کے بہت خوشی ہوئی اور جلدی سے ریحانہ کی کہانی پڑھ ڈالی بہت اچھی کہانی لکھی ریحانہ آپ نے' فیصل بھائی کی کہانی خواب زادی بھی زبردست تھی اللہ آپ دونوں مزید کامیابی دے آمین۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھی' ٹرانسفر لیٹر افتخار چودھری کی کہانی بھی بہت اچھی تھی جاوید راہی سر کی آخری گھاؤ اور مقصود احمد بلوچ کی نازو کہاں چلی گئی بھی زبردست تھیں اور اب آئی ہوں منزہ سہام کی کہانی ریت کی گود رلا گئی اللہ کسی کو اتنا غریب بھی نہ بنائے بہت دکھ بھری کہانی تھی ویلڈن منزہ جی بہت ڈوب کر لکھی آپ نے یہ کہانی...... خط لکھنے والوں کے نام پرنس افضل شاہین' حسن نظامی' محسن علی طاب' فیصل مشتاق' نفیسہ فضل محمود' فریدہ فری' عامر شہزاد' حافظہ مون شاہ کے خط بہت اچھے تھے' شاعری بھی بس ٹھیک تھی منزہ سہام جی میری کہانی بارے بتایا نہیں آپ نے پلیز مجھے بتایئے گا کے کہانی لگے گی یا ردی کی نوکری

کی نظر ہو جائے گی میں اور بھی اپنی شاعری بھیج رہی ہوں امید ہے آپ کو پسند آئے گی اب اجازت چاہتی ہوں۔

☆اچھی سی اردشمہ! کہانی پسند کرنے کا شکریہ' تمہاری تحریر ابھی پڑھی نہیں ہے۔

ثریا کنول قادر پورراں سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! پیاری آپی منزہ میں خیریت سے ہوں اور امید ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گی۔ سچی کہانیاں رسالہ انتہائی معیاری اور معلوماتی ہے۔ سچی کہانیاں دوسری بار پڑھا بہت اچھا لگا۔ کہانیوں کا انتخاب لاجواب ہے۔ پہلی بار آپ سے قلمی رشتہ قائم کر رہی ہوں۔ سچی کہانیاں کا شمارہ نومبر 2018ء پُراسرار کہانی نمبر ہے۔ اس لیے میں بھی اپنی کہانی بھیج رہی ہوں۔ امید ہے میری کہانی سچی کہانیاں کے معیار پر پورا اترے۔ اور ہاں آپی مجھے بتایئے گا ضرور کہ میری کہانی لیٹر بکس شامل اشاعت ہوگی یا نہیں۔ سچی کہانیاں 6 اکتوبر کو مارکیٹ سے لیا۔ اس لیے کہانیاں ابھی تک پڑھی نہیں ہیں۔ لکھا ہوا تھا کہ 10 اکتوبر سے پہلے اپنی کہانیاں ارسال کردیں۔ کہانیوں میں صرف میم جی پڑھی جو کہ فرزانہ نگہت نے لکھی' اچھی لگی اور شوبز پر نگاہ دوڑائی وہ بھی اچھا تھا۔ گھر تتلی کا پر ختم ہو گیا ہے کافی اچھا ڈرامہ تھا' حقیقت پر بنا ہوا تھا اور باقی کہانیاں ابھی پڑھنی ہیں۔ زیادہ وقت نہیں ہے اس لیے اتنا لکھا اور اللہ سے میری دعا ہے کہ سچی کہانیاں اور ترقی کرے۔

☆ڈیئر ثریا! تمہاری آمد اچھی لگی امید ہے کہ پابندی سے احوال میں شرکت کرو گی۔ تمہاری تحریر پُراسرار نمبر 2 کے لیے محفوظ کرلی ہے۔

نظر علی برمانی' دادو سے لکھتے ہیں۔ قابل احترام منزہ باجی السلام علیکم! چند ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر حاضر ہوں اکتوبر کا شمارہ سات تاریخ کو لیا سرورق بہت اچھا لگا اداریہ میں آپ نے سب سے بڑے فتنے کی بالکل درست نشاندہی کی رب کریم ہمارے حال پر رحم فرمائے آمین۔ احوال میں ساتھیوں کے دلچسپ تبصرے پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ملازم حسین شیرازی اس بار آپ نے مختصر خط لکھا دلچسپ تبصرے کی کمی محسوس ہوئی ایم اے خالق بھٹی کافی عرصے بعد احوال میں آئے بہت اچھا لگا آپ سینئر قاری ہیں اب غیر حاضری نہیں ہونی چاہیے۔ کہانیوں میں جاوید راہی کی 'آخری گھاؤ' نے بہت دکھی کیا پتہ نہیں لوگ اتنے ظالم کیوں ہوتے ہیں کسی پر ظلم کرتے وقت یہ کیوں بھول جاتے ہیں ایک روز انہیں مر کر اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ فاروق کی بیوی نے آخری فیصلہ کرنے میں بہت دیر کردی اگر یہ فیصلہ پہلے کرلیتی تو اتنا نقصان نہ اٹھانا پڑتا۔ افتخار چوہدری کی 'ٹرانسفر لیٹر' سسپنس اور تھرل سے بھرپور کہانی بہت ہی زبردست رہی۔ اس فرعون نما چوہدری کا انجام پڑھ کر دل کو بہت سکون ملا اور دل نے ایس پی صاحب کو بہت دعائیں دیں یقین ہی نہیں آتا کہ پولیس میں ایسے فرشتے بھی ہوتے ہیں۔ بہرحال جہاں رفعت کی موت نے دکھی کیا وہاں اس خبیث چوہدری کے انجام نے دل کو سکون دیا' اس سے بھیانک انجام اور کیا ہو سکتا تھا۔ شاہد رفیق سہو کی بڑی دیر کی مہرباں' ایک محبت کی کہانی بہت اچھی تحریر تھی۔ مقصود احمد بلوچ کی کہانی ناز و کہاں گئی متاثر کن تحریر تھی اچھی لگی۔ ہمیشہ کی طرح مجید احمد جائی اس بار بھی نادانیاں کی صورت میں ایک اچھی تحریر لائے پڑھ کر مزہ آیا۔ سید ابو محمد آزاد نے اپنی تحریر میں بالکل صحیح کہا کہ میاں چھوڑو تو ہر دور میں اور ہر جگہ پر ہوتے ہیں۔ طاہر مقصود احمد ہاشمی کی خالہ تندور والی نے بہت متاثر کیا فرزانہ نگہت کی میم جی ایک زبردست اور منفرد کہانی تھی۔ بہت اچھی لگی۔ عبدالغفار عابد کے تعارف میں ان کے خیالات پڑھ کر بہت اچھا لگا اور ایسے ہی خیالات اور احساسات رکھنے والے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں اگر ان سے میری دوستی پکی ہو جائے تو میرے لیے خوشی کا باعث ہوگی۔ عاکف عثمان ہانی اور شاہ مرید میں ایک تاریخی محبت کی کہانی پیش کی اچھی کہانی تھی۔ عمران قریشی کی ستم گزیدہ پڑھ کر کافی افسوس ہوا۔ ایسے چوہدریوں کا بھی وہی انجام ہونا چاہیے جیسا افتخار چوہدری کی کہانی میں ہوا۔ مراد نے صفیہ کو طلاق دے کر بہت برا کیا۔ ریحانہ اعجاز کی فتح محبت بھی بہت اچھی تحریر تھی۔ اس کے علاوہ باقی سب تحریریں بھی لاجواب تھیں۔ میری پسندیدہ قسط وار کہانی عالم کامل بہت زبردست جا رہی ہے۔ باقی سب سلسلے بھی خوب جا رہے ہیں۔ اچھا منزہ باجی اب اجازت چاہوں گا اللہ نے چاہا تو اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

☆نظر بھائی! کل میں آپ کو یاد کر رہی تھی اور آج آپ کا خط اور خیریت مل گئی۔ شمارہ پسند کرنے کا شکریہ آپ نے سب کی کہانیوں پر رائے دی مگر میری کہانی پر کچھ نہیں کہا' میں منتظر ہوں؟

عابدہ مغل کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! ڈیئر منزہ آپی رب تعالیٰ سے آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہوں واقعی پرچے کو ٹائم اور توجہ دی جا رہی ہے اسی لیے رائٹرز اینڈ ریڈرز جو کہ ناراض ہیں پچھلی ساری باتیں بھلا کر پھر سے متحد ہو جائیں۔ اعزازی پرچہ یکم کو ہی مل گیا تھا' تیکھی مرچ اریبا خان بڑے کروفر سے ٹائٹل پر براجمان تھی اور صنف مخالف پر ظلم ڈھا رہی تھیں

سب سے بڑا فتنہ پڑھ کر دل میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ عفریت کتنے خاندان برباد کر چکا ہے مرد حضرات دن میں جاب کرتے ہیں رات کو فیس بک چلاتے ہیں صبح میں ٹائم سے اٹھتے نہیں بہت سوں کی جاب چلی گئی ہے بہت سے گھر تباہی کے دہانے پر ہیں جنہوں نے شیطانی چرخہ بنایا اور لغو اور واہیات کام کی ابتدا کی وہ اب اس کے نقصانات جان کر موبائل اور نیٹ کا استعمال کم کر چکے ہیں مگر ہم پاکستانی ہاتھ دھو کر نہیں یہ صیغہ صحیح نہیں نہا دھو کر اس دھوکے اس سیراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں بہت سوں کو چشمے بھی لگ چکے ہیں خواتین اور بچے بھی پیچھے نہیں رہے ایسا لگ رہا ہے کوئی ریس ہے ہر کوئی اول آنا چاہتا ہے گھریلو مرد عورتیں اور بچے بھی ویڈیوز بناتے نظر آتے ہیں اللہ خیر کرے تباہی کا سامان بہت ہو چکا کوئی راز راز نہ رہا کوئی پردے داری نہ رہی میرے پڑوسی شاپنگ پر جاتے ہیں بچوں کو موبائل دے جاتے ہیں کہ بیٹا گیم کھیلنا وائی فائی آن نہ کرنا مگر وہ بچے گانے کارٹون اور بہت کچھ دیکھ رہے ہوتے ہیں اے اللہ اس تباہی سے ہمیں اور ہمارے معصوم بچوں کو اپنی پناہ میں رکھ آمین۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے سیل فون کو ہیک کر رہے ہیں کچھ نہ بھی ہو مگر شک کا کیڑا محبت کی لکڑی کو کھا رہا ہے اُف......اب ذرا تبصرہ ہو جائے۔ قاری محمد عثمان کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ آخری گھاؤ بہت اچھی تھی اتنے ظلم کے بعد بھی درندہ وحشی سدھرا انہیں جلا کر ہی دم لیا بے چاری کی زندگی برباد کر دی اُف......ٹرانسفر لیٹر افتخار چوہدری نے بہت ہی عمدہ لکھا زبردست مگر کہانی کا اینڈ مجھے رُلا گیا رفعت کی دردناک موت دل میں درد کر گئی۔ یہ کہانی سچ پر مبنی ہے چوہدری وڈیرے سردار بھائی لوگ اپنی اَنا کی ناک اونچی رکھنے میں لوگوں کی جانوں اور عزتوں سے بھی کھیل جاتے ہیں پتہ نہیں پاکستان کا سسٹم کب بدلے گا شاہد بھائی بڑی دیر کی مہرباں......ایک اچھی کاوش میرے میاں چنوں کے لکھاری بھائی مقصود احمد بلوچ اچھی تحریر لائے نادانیاں مجید احمد جائی کہانی اچھی تھی مگر ایک طرف وہ لڑکی غریبوں سے انتہائی نفرت کرتی ہے اور دوسری طرف محبوب بھی غریب کو بناتی ہے اور پھر اینڈ میں غریبوں میں ہی جا بستی ہے جبکہ پیسوں کا اُسے کوئی مسئلہ نہیں اور جب رشتہ طے کیا تو کیا فیصل کے ابو نہیں آئے تھے بارات یا نکاح میں نہیں تھے جبکہ والد کی معیت میں ہی نکاح ہوتا ہے کر برا تو ہو برا اس کہانی سے یہی نتیجہ اخذ کیا ویسے بڑی بے باک دوشیزہ تھی۔ میاں چھوڑ وخالہ تندور والی اور میم جی بھی اچھی تحریریں تھیں' تعارف میں پنجاب دے پتر عبدالغفار عابد بھائی کا انٹرویو پڑھا یقین نہیں آیا کہ انہوں نے صرف میٹرک کیا ہے ان کی باتیں اچھی لگیں' جنگ تو جنگ ہوتی ہے ہار یا جیت جنگ کی منزل ہوتی ہے آپ محبت کی جنگ ہار گئے دلی افسوس ہوا یہاں آپ سے گزارش ہے منزہ آپی تعارف میں دی گئی تصویر کو پلیز کلرڈ چھاپیں مزہ دوبالا سہ بالا ہو جائے گا۔ باقی کہانیوں میں عاکف تحسین کی ہانی اور شاہ مرید' ستم گزیدہ' فتح محبت' ریت کی گود میں منزہ آپی لاجواب تحریریں تھیں غفلت کے پردے صائمہ صدیقی قسمت کی لکیریں ممتاز احمد ویری گڈ اچھی تحریر پڑھنے کو ملی موبائل کا جن بے قابو ہو چکا ہے ستارہ فوزیہ اختر بہت عمدہ ایسی بھی مائیں ہوتی ہیں واللہ خواب زادی سوسو ساڈا حق اتھے رکھ شمسہ قمر عورت کو اچھی ہمت دلاتی ابن آدم ہر تحریر میں ظلم کے پہاڑے بڑھتا ہوا نظر آیا اے کاش مرد حضرات اپنی سوچ بدلیں عورت کو بھی انسان سمجھیں اُن کے حقوق ادا کریں مگر کب تک؟ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ مان ٹوٹ گیا آوارہ لڑکے کی کہانی جو لڑکپن سے ہی اندھیروں کا راہی ہو گیا پھر واویلا کیسا؟ ماں باپ کو ٹھکرانے والے کبھی کامل نہیں ہوتے آپ کی ڈائری میں انٹر ہوئے تو سب بہت اچھا تھا ریحانہ اعجاز کی زندگی بہت اچھی لگی۔ مہر پرویز دولو آپ کو میری کہانی وڈا عشق اتنی پسند آئی کہ انعام یافتہ قرار دے رہے ہیں مہربانی مجھے انعام مل گیا آپ جیسے رائٹر کے منہ سے اپنی تعریف میرے لیے انعام سے کم نہیں آخر میں سب احوالیوں کو کہنا چاہوں گی احوال کو احوال ہی رہنے دیجیے ماضی کی طرح چوپال نہیں بنائے گا ورنہ پھر بہت سے دل دکھی ہو جائیں گے اور احوال میں کہانیوں پر تبصرہ کریں تاکہ پرچہ مزید نکھر سکے' اب اجازت......

☆سویٹ عابدہ تم نے بالکل ٹھیک کہا دل آزاری سے بچنا بہت ضروری ہے زندگی کے ہر معاملے میں اس قدر تصنع اور بناوٹ شامل ہو گئی ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ کم از کم ادب میں ایسا نہ ہو' سنجیدہ مزاج لکھاری اور ریڈرز میری اولین ترجیح ہیں کیونکہ ادیب قلم کے ذریعے معاشرے کو سنوارتا ہے اُس کا سنجیدہ ہونا بہت ضروری ہے شمارہ پسند کرنے کا شکریہ۔

جمیل میتلو کراچی سے لکھتی ہیں پیاری بہن منزہ سہام' السلام علیکم! خدا سے دعا ہے کہ سچی کہانیاں کا ہر لکھنے والا ہر پڑھنے والا اور تمام اسٹاف خیر و عافیت سے ہو اور رہے آمین ثم آمین آپ نے انعامی سلسلہ شروع کر کے لکھنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے' بات پیسے کی نہیں عزت و نام کی ہوتی ہے۔ اور زیادہ اچھا لکھنے کو جی چاہتا ہے خناس کہانی واقعی بہت اچھی تھی۔ اب اکتوبر کا رسالہ مجھے گیارہ تاریخ کو ملا پڑھنا شروع کیا میں آہستہ آہستہ پڑتی موڈ کے مطابق جلدی نہیں پڑھ سکتی اس لیے اس ماہ کی کہانی

ٹرانسفر لیٹر بہت اچھی لگی پھر گھاؤ اور نازو کہاں گئی اچھی لگیں' عامل کامل پسند آرہی ہے غلام جو سردار بنے غزالہ عزیز کی تحریر بہت ایمان افروز ہے پسند آئی قاری عثمان کا انٹرویو بھی پسند آیا اور سب سلسلے بھی خوب ہیں میری کہانیاں بھی شائع کرتی ہیں بہت شکریہ آج بھی ایک عدد کہانی بھیج رہی ہوں دسمبر میں ضرور شائع کیجیے گا طویل نمبر میں مہربانی ہوگی۔ مصنفہ خولہ عرفان کے سسر اور مصنفہ انیلا حمید کی وفات پر افسوس ہوا اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت میں جگہ دے اور عزیزوں کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

☆ اچھی جیجل تمہاری آمد بہار کا جھونکا محسوس ہوئی۔ اپنا نمبر مجھے ضرور دے دو تا کہ رابطے میں آسانی رہے۔

حمیرا وحید واہ کینٹ سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! آپی میں ٹھیک ہوں امید کرتی ہوں آپ بھی ٹھیک ہوں گی۔ رسالہ دن بدن نکھرتا جارہا ہے۔ آپ کی محنت قابل تعریف ہے۔ آپ کا رسالہ نئے لکھنے والوں کے لیے سیکھنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ جس سے اچھے اچھے رائٹرز موجود میں آرہے ہیں۔ آپ بہت فراغ دلی سے نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کررہی ہیں۔ آپ نے میرے لیٹر کو سچی کہانیوں کے صفحات میں جگہ دی اس کے لیے آپ کا شکریہ' غلام جو بنے سردار ایک انتہائی بہترین سلسلہ ہے جس کو پڑھ کر صحابہ کرامؓ کے بارے میں جاننے کا موقع مل رہا ہے۔ نعت خواں قاری محمد عثمان ایک اچھے نعت خواں ہیں۔ ان سے کیے گئے سوالات بہت اچھے تھے جن کے جوابات محمد عثمان صاحب نے بہت اچھے اسلام کی روشنی میں دیے۔ جن کو پڑھ کر اسلامی معلومات میں اضافہ ہوا۔ معاشرتی بگاڑ کی وجہ صغیرہ کبیرہ گناہ کون کون سے یہ پڑھ کر معلومات میں بے حد اضافہ ہوا۔ قاری محمد عثمان کا قارئین کو دیا گیا پیغام بے حد پسند آیا۔ آخری گھاؤ جاوید راہی کی تحریر ایک ایسی عورت کی کہانی تھی جس نے ہر ممکن اپنے شوہر سے نبھا کرنے اور سسرال والوں کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور کبھی زبان پر شکوہ نہ لائی۔ اپنی تقدیر کا لکھا سمجھ کر کانٹوں پر بھی چلتی رہی۔ جب اُسے شوہر نے جلا بھی دیا تب بھی اُف تک نہ کی۔ ماں باپ بھی جو غریب ہوں کیا کریں کبھی غربت کے ہاتھوں یا زمانہ کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہوئے اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہیں کر پاتے۔ ٹرانسفر لیٹر' نازو کہاں گئی بھی اچھی تحریر تھی۔ ریت کی گڑ میں بہت اچھی تحریر تھی جو آنکھوں کو نم کر گئی بہت سے غریب گھرانوں کی عکاسی کررہی تھی۔ جن کے نصیب میں دو وقت کی روٹی بھی نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ قسمت کا لکھا کوئی ٹال نہیں سکتا۔ بڑی بہن نے آخری سانس تک فرض نبھایا ابھی تک اتنا ہی مطالعہ کیا ہے مزید مطالعہ کیا تو لیٹر شامل نہیں ہو پائے گا۔ اس بار ایک افسانہ سلگتا دسمبر بھیج رہی ہوں آپ چاہیں تو سچی کہانیاں میں جگہ دے دیں۔ مناسب سمجھیں تو دوشیزہ کے صفحات کا حصہ بنا دیں۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔

☆ حمیرا ڈیئر! تمہاری یہ ادا بھی اچھی لگی کہ احوال میں شرکت کے لیے تم نے جلدی خط لکھ دیا پورا رسالہ پڑھتیں تو یقیناً تاخیر ہوجاتی۔ لڑکی یہ بتاؤ تمہاری تحریر رجسٹر کے دو صفحات پر ہے ایڈٹ اور کمپوز ہو کر ڈائجسٹ کا ایک صفحہ بنے گا بتاؤ کیسے شائع کروں؟

محسن علی طاب' ساہیوال سے لکھتے ہیں۔ آپی منزہ سہام' السلام علیکم! شمارہ وقت پر نہ مل پایا اس لیے تبصرہ لیٹ بھیج رہا ہوں افسوس اس بات کا ہے کہ میں ممبر شپ نہیں لے سکتا خیر اللہ کرم کرے گا۔ اکتوبر کی مناسبت سے سرورق معقول تھا۔ آپ کا کہنا بالکل درست ہے فیس بک کا درست استعمال کی جگہ منفی استعمال زیادہ ہے کسی کی بھی عزت کی دھجیاں اڑانے کے لیے فیس بک ایک ہتھیار بن چکا ہے اصل باتوں کی تردید کرنا ہی مناسب ہیں سمجھا جاتا افواہوں پر یقین کرلیا جاتا ہے اب آتے ہیں خطوط کی طرف' پرنس افضل ریحم میرا نہیں ہم سب کا تھا اس دور رسالہ نکال کر ادب کو فروغ دینا بہت مشکل کام ہے دشمن بھی بہت بن جاتے ہیں اور خرچہ علیحدہ ہوجاتا ہے اللہ پاک ان چند رسالے نکالنے والوں کو سلامت رکھے آمین۔ اروشے بہنا آپ لکھو اور چھا جاؤ بہت سی دعائیں' خطوط شامل کرنے پر شکر گزار ہوں۔ فریدہ فری جی اپنا خیال رکھیں موسم بدل رہا ہے' جن کے خطوط مجھے اچھے لگے اُن کے نام پرنس افضل' حسن نظامی' فیصل مشتاق' نغیبہ فضل' اروشے خان عروش' ارشد اقبال' عبدالغفار' عامر شہزاد' اُن کے خطوط اچھے لگے۔ دوشیزہ کی مصنفہ خولہ عرفان کے سسر اور مصنفہ انیلا احمد کے شوہر دونوں مرحومین کو رب کریم جنت عطا فرمائے اور سب گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ انعام حاصل کرنے والوں کو دلی مبارکباد' حضرت خبابؓ کے متعلق تحریر نے علم میں اضافہ کیا۔ قاری محمد عثمان سے ملاقات اچھی رہی۔ آخری گھاؤ جاوید راہی بہت اچھی تحریر تھی۔ مقصود بلوچ نازو کہاں چلی گئی بھی اچھی تحریر لگی۔ مجید جائی کے قلم سے سچی داستان نادانیاں سبق آموز تھی۔ خالہ تندور والی کا آخر اچھا لگا۔ فرزانہ نگہت کے قلم سے میم جی ایک منفرد عمدہ تحریر تھی۔ عبدالغفار کا تعارف پڑھ کر انہیں جاننا اچھا لگا۔ عاکف عثمان ہانی اور شاید مرید عمدہ تحریر لائے یہ تحریر دل کو چھو لینے والی تھی۔ عمران قریشی ستم گزیدہ کے آخر نے حیران کیا فصیہ کی قربانی کی قدر نہیں کی گئی جس کے لیے وہ سب

کیا وہی اُسے بے سہارا کر گیا یہ ہمارے معاشرے کا ایک بھیانک روپ پیش کیا گیا گڈ' خواب زادی' فیصل مشتاق کی تحری اچھی تھی آخر کار مہارانی صاحبہ کو خوابوں کا شہزادہ مل گیا۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ الماس شازلی مغل قسط اچھی لگی۔ شوبز کی سرگرمیاں بھی چٹ پٹی تھیں۔

☆محسن بھائی! آپ کی تحریر مل گئی مگر مجھے کچھ وقت درکار ہوگا پڑھنے کے لیے' باقی آپ کا خط بالکل وقت پر تھا اس لیے شمارے میں شامل ہے۔ سچی کہانیاں پڑھنے اور پھر پسند کرنے کا بہت شکریہ۔

مور شاہد حسین قمر شہداد کوٹ سے لکھتے ہیں۔ ڈیئر آپی منزہ سہام سلام و دعائیں امید ہے کہ آپ سچی کہانیاں کا تمام اسٹاف لکھاری اور قاری حضرات بالکل خیر و خیریت سے ہوں گے اللہ پاک سب پر اپنی رحمتوں' برکتوں' نعمتوں' شفقتوں اور محبتوں کا نزول فرمائے آمین۔ پانچ اکتوبر کو محبوب رسالے سچی کہانیاں کا دیدار ہوا۔ ماڈل سے ہیلو ہائے کے بعد فہرست میں خود کو تلاش کیا مگر......؟ آپ نے اداریہ سب سے بڑا فتنہ کے عنوان سے زبردست لکھا۔ اگلے لمحے اپنوں کی محبتوں کی محفل احوال میں قدم رکھا پرنس افضل شاہین صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ مبارکباد' محسن علی طالب' نفیسہ فضل' فیصل مشتاق (میرے بھائی خواب زادی عمدہ تحریر پڑھنے کو دینے پر بڑی نوازش) ایم حسن نظامی' ارشد اقبال چوہان' عامر شہزاد' پیر نوید شاہ (ویلکم بیک) نعمان احمد عبدالغفار عابد' سعدیہ وحید سعیدی نے بھرپور تبصرے کے ساتھ شرکت کی۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف تحسین جونیجو بہن قلندری طریقت ایمان افروز تحریر پڑھنے کو دی بہت شکریہ بہنا' شاہ عبداللطیف بھٹائی کی زندگی پر بھی لکھیں غلام جو بے سردار دل کی آنکھ سے پڑھی ایمان تازہ ہوگیا۔ غزالہ عزیز بے حد نوازش' قاری محمد عثمان سے ملاقات خوب رہی۔ جاوید راہی آخری گھاؤ منزہ سہام ریت کی گود میں' رفعت خان وہ ایک ڈیکتی رلا دینے والی تحریریں تھیں۔ افتخار بھٹی ٹرانسفر لیٹر مقصود احمد بلوچ تازہ کہاں گئی۔ عمران قریشی ستم گزیدہ عمدہ تحریریں پڑھنے کو دیں شاہد رفیق بڑی دیر کی سید محمد آزاد میاں چھوڑو خالہ تندور والی عاکف عثمان ہانی اور شاہ مرید عابدہ کنول مینا تو جھلی ہے۔ ایم یعقوب مان ٹوٹ گیا اچھی تحریر لائے۔ تعارف عبدالغفار عابد سے ملاقات ہوئی مجید احمد جائی نادانیاں فرزانہ نگہت میم جی' ریحانہ اعجاز فتح محبت' صائمہ صدیقی غفلت کے پردے' ممتاز احمد قسمت کی لکیر' فوزیہ اختر ستارہ فیصل مشتاق' خواب زادی' شمسہ قمر ساڈا حق اچھے ایک سے بڑھ کر ایک جاندار و شاندار تحریر پڑھنے کو دیں۔ پیر شاہ محمد عالم کامل اور شازلی سعید مغل الماس عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار ہے مسئلہ یہ ہے رسالے کی جان' پاکستانی شوبز اچھا سلسلہ ہے' ہر ماہ ایک دو قومی کرکٹرز کا مختصر سا تعارف لگائیں نوازش ہوگی۔ آپ کی ڈائری سب نے بہترین انتخاب کیا۔ شعر و سخن سب نے عمدہ و اعلیٰ شاعری تخلیق کی آپی ماہ ستمبر کے شمارے میں آپ نے میرے خط کے جواب میں لکھا کہ آپ کی شاعری شعر و سخن کے صفحات پر شائع کر رہی ہوں لیکن یہ کیا ستمبر تو کیا اکتوبر کے شمارے میں بھی میری شاعری نہیں ہے۔ خیر آپی مجھے سچی کہانیاں سے دلی محبت ہے اور میں صرف اور صرف اپنے محبوب رسالے کے لیے لکھنا چاہتا ہوں' خط کے ساتھ تازہ شاعری بھیج رہا ہوں امید ہے جلد شائع کریں گی۔

☆بھائی شاہد! عین وقت پہ کچھ چیزیں فوری طور پر روکنی پڑتی ہیں آپ کی شاعری کے ساتھ بھی یہی ہوا یقین رکھیں آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔

مومنہ بتول کراچی سے لکھتی ہیں۔ محترمہ منزہ سہام السلام علیکم! خدا سے دعا قلب ہے کہ آپ اور آپ کا قبیلہ شاد آباد رہے۔ آمین' ایک سال بعد آج یہ قلم اٹھایا ہے کچھ گردش دوراں نے اتنا معروف رکھا کہ چاہنے کے باوجود قلم تھام نہ سکی نہ آپ لوگوں سے رابطہ کر سکی بہرحال میرے لکھنے کی وجہ میرا اپنا افسانہ زندگی ٹھہرا ماہ اگست میں اپنی کہانی تقدیر گزیدہ دیکھ کر اندرونی مسرت نے سرشار کیا۔ وہیں ماہ ستمبر میں اپنا نام ونرز میں دیکھ کر اور وہ بھی پہلے نمبر پر بہت اچھا لگا اور آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا جو اتنا لیٹ ہوگیا ہو سکتا ہے کہ لیٹر بھی بہت لیٹ ہو جائے مگر جواب ضرور دیں آپ کے اداریے بے حد جاندار ہوتے ہیں۔ معیار بھی اچھا ہے آپ کی ان تھک محنت خود بذات اک ثبوت ہے۔ احوال میں تمام دوستوں کو سلام محبت اب خود سے وعدہ ہے کہ رابطہ میں رہوں گی۔ جو لوگ مجھے بھول چکے ہیں ان کو اور پھر نئے ماہ کے ایڈیشن پر ضرور تبصرہ کروں گی۔ منزہ دوشیزہ بھی اچھا جا رہا ہے۔ ایک عرض ہے کہ دوشیزہ کے جوابات کی طرح سچی کہانیاں کے جوابات بھی ذرا بڑے ہندسوں میں تحریر ہوں تو چشمہ ڈھونڈنے سے نجات مل جائے گی اور ایک بات اور ہے کہ میں دوشیزہ کے لیے ذرا بڑا افسانہ لکھ رہی ہوں آپ سے استدعا ہے کہ ضرور شائع کیجیے گا نوک پلک سنوار کر کیونکہ اب دوبارہ سے قلم اٹھانا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ بس آپ کی عنایت توجہ چاہتی ہوں جواب ضرور دیں مزید یہ کہ میرا ونرز انعام بھی ابھی تک نہیں پہنچا بخدا مجھے روپوں کی پروا نہیں بس ایک اعزاز چاہیے میں اپنا

فون نمبر لکھ رہی ہوں مجھے خود سے فون کر کے پوچھنا اچھا نہیں لگ رہا بس آپ کی سند یافتہ اعزاز دار کار ہے ساتھ اپنی کاوش بھی بھیج رہی ہوں بہت محبت کے ساتھ سلام......

☆ پیاری مومنہ تمہاری تحریر لاجواب تھی۔ اسی لیے انعام کی حقدار ٹھہری اب فوراً مجھے مزید دلچسپ کہانیاں بھیجو میں انتظار کر رہی ہوں۔ تمہاری انعامی رقم ادارے کے پاس امانت تھی اب نمبر مل گیا ہے انشاء اللہ جلد تم تک پہنچادی جائے گی۔

◄ نفیسہ فضل کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری بیٹی منزہ جگ جگ جیو اللہ رب العزت صحت زندگی کامیابیوں سے ہمکنار کرے آمین احوال میں میرے خطوط شامل تھے۔ جزاک اللہ جن لوگوں نے میری غزلیں اور خطوط پسند کیے ان کا بے حد شکریہ ایم اے خالق بھٹی وعلیکم السلام! جیتے رہو بیٹا خوش رہو ثمینہ مشتاق کیسی ہو بیٹا اور ملازم حسین شیرازی سوری بیٹا آپ کی کہانی پچھتاوا پر تبصرہ رہ گیا تھا معذرت خواہ ہوں۔ سب سے بڑا فتنہ منزہ سہام زبردست بالکل ٹھیک کہا آپ نے میں آپ کے پرچے کے توسط سے عوام سے کچھ کہنا چاہتی ہوں اگر ناگوار نہ گزرے تو اجازت دیجیے گا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف غلام جو بنے سردار غزالہ عزیز ایسی کہانیاں معلومات میں اضافہ کرتی ہیں نعت خواں حافظ مون شاہ بخاری قاری محمد عثمان کا تعارف اچھا لگا بہت اچھے عزائم ہیں ان کے'آخری گھاؤ جاوید راہی آخر فاروق جیسے لوگ شادی کیوں کرتے ہیں پہلے ہی اپنی پسند کی شادی کر لیا کریں ٹرانسفر لیٹر افتخار چوہدری جوں جوں پڑھتی گئی سسپنس پیدا ہوتا گیا رفعت کے انجام پر رونا آیا مگر چوہدری کے ساتھ جو ایس پی صاحب نے کیا بہت اچھا ہوا کاش ہمارے ایس پی و دیگر عملہ ایسا ہو جائے بڑی دیر کی مہرباں شاید رفیق سہو ناز و کہاں چلی گئی۔ مقصود احمد بلوچ ناز و نے تو دکھی کر دیا۔ نادانیاں مجید احمد جائی جب لڑکیاں غلطیاں کرتی ہیں تو اس کی سزا ان کے ساتھ ان کی اولاد کو بھی بھگتنا پڑتی ہے خالہ تندور والی طاہر مقصود احمد ہاشمی جنید نے اچھا فیصلہ کیا شنو کی زندگی سنور گئی۔ میم جی فرزانہ نگہت زبردست ہانی اور شاہد مرید عاکف عثمان' ستم گزیدہ عمران قریشی فتح محبت ریحانہ اعجاز سوہا خوش نصیب تھی عامل کامل پیر شاہ محمد قادری اچھا سلسلہ ہے ریت کی گود میں منزہ سہام آہ دلدوز اسٹوری ہے۔ غفلت کے پردے صائمہ صدیقی ایسی ہی ایک دشمن بہن کی کہانی ہے۔ میرے پاس جلد ارسال کروں گی انشاء اللہ وہ ایک ڈکیتی رفعت خان اللہ پوچھے ان ڈاکوؤں کو' قسمت کی لکیریں ممتاز احمد ثروت نے بہت بڑی غلطی کی تھی اس کے باوجود اللہ نے اس کا نصیب سنوار دیا یہ اس کی خوش نصیبی ہے ستارہ فوزیہ اختر شکر خدا کا ستارہ کو اچھی ساس ملی جو اس کی زندگی سنور گئی خواب زاری فیصل مشتاق کبھی کبھی خواب یوں بھی پورے ہوتے ہیں مینا تو جھلی ہے عابدہ مغل کیا کہوں؟ ایسے بے غیرت لوگوں کو' آپ کی ڈائری بہت زبردست رہی شعر و سخن سب ہی اچھے ہیں۔

☆ نفیسہ آنٹی' دیکھیے آپ کا خط کہانی اور آپ کے اشعار سب شامل ہیں' امید کرتی ہوں کہ آئندہ بھی آپ کا قلمی تعاون شامل حال رہے گا۔

◄ فیصل ندیم بھٹی سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! محترمہ ایڈیٹر صاحبہ' امید ہے کہ آپ ایمان اور صحت کی بہترین حالت میں ہوں گی اکتوبر کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے ڈبل سرورق کو ختم کر کے سنگل کرنا اچھی تبدیلی ہے کیونکہ ڈبل سرورق سے اُلجھن ہوا کرتی تھی ٹائٹل میں دوشیزہ بالوں کو بکھیرے لبوں پر لپ اسٹک سجائے گالوں پر سرخی ہلکی سی سجائے منفرد انداز میں نظر آئی۔ صفحات کو پلٹتے اشتہارات کو پڑھتے دیکھتے ہوئے آخر کار منزہ سہام مرزا کے اداریے پر جا کر نظر ٹھہری' سب سے بڑا فتنہ بلاشبہ آپ نے آج کے دور کی سب سے بڑی حقیقت کو آشکار کیا ہے۔ واقعی میرا بھی یہ تجربہ ہے کہ لوگ فیس بک پر اپنی ساتھ والدین کی طرف سے ہونے والی سختیوں کو اپنے دوستوں کے ساتھ شیئر کرتے ہیں میں نے کئی نوجوان ایسے معاشرے میں دیکھے ہیں جو کہ صبح و شام فیس بک پر دوستوں کا حال پوچھتے ہیں لیکن افسوس کہ گھر میں موجود اپنے بوڑھے والدین کا حال تک نہیں پوچھتے ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ سوشل میڈیا نے نوجوانوں کو اپنے ہی گھر والوں سے دور کر دیا ہے یہ تو زندگی میں ہی عذاب الٰہی کو دعوت دینے والی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنوں میں اسلام کی تعلیمات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ احوال میں سب سے پہلے پرنس افضل شاہین کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ نفیسہ مغل' خالق بھٹی' حافظ مون شاہ' روشے خان عرش' محسن علی طالب' ڈاکٹر امین حمیرا وحید' ملازم شیرازی' فریدہ جاوید فری' فیصل مشتاق' حسن نظامی ارشد اقبال چوہان بہترین خطوط کے ساتھ جلوہ گر ہوئے عامر شہزاد میرے خط کو پسندیدگی سے نوازنے کا شکریہ' سعدیہ وحید سعدی خوش آمدید' ممتاز احمد' مجید احمد جائی' منشی عزیز' سعدیہ گل' تنزیلہ عرف تانی' سدرہ انور' تحسین جونیجو مور شاہد' راشد لطیف کو سلام' غلام جو بنے سردار حضرت خباب بن ارتؓ کی زندگی اسلام لانے کا تذکرہ اور اسلام کی خاطر اتنی تکالیف اور مصائب کو برداشت کرنا قابل رشک ہے آپ کی زندگی کے احوال پڑھ کر آنکھیں

تاخیر سے ملنے والے خطوط

ملازم حسین شیرازی' بھکر۔ محمد حنیف شاکر' ننکانہ صاحب۔ فیصل ندیم بھٹی' سرگودھا۔ ملک این اے کاوش' سرگودھا۔ خضر حیات' خوشاب۔ مریم شاہ بخاری' سرگودھا۔ حمیرا وحید' واہ کینٹ۔

آنسوؤں سے نم ہوگئیں۔ حافظہ مون شاہ بخاری کا انٹرویو قاری محمد عثمان نعت خواں کے بارے میں آپ کے پڑھ کر سرکار ﷺ سے محبت اور الفت شفاعت کا سبب بنے گی بہترین سوچ کے مالک مذہبی لگاؤں قابل تعریف ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں پر تبصرے کی طرف' آخری گھاؤ' جاوید راہی' مرد کے ظلم کی داستان انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہے۔ عورت ظلم کو سہہ کر بھی اپنا گھر بنانے کا سوچتی ہے۔ لیکن کمبخت مرد اپنے آپ کو فرعون سمجھنے لگتا ہے' ٹرانسفر لیٹر افتخار چوہدری ویلڈن خاور صاحب' تھانیدار خاور جیسے ایماندار اور فرض شناس ہی چوہدری حشمت جیسے فرعونوں کو دنیا سے عبرت بنا سکتے ہیں ایسے مکروہ دھندا کرنے والے وڈیروں کے خلاف آواز بلند کرنا چاہیے تاکہ کسی غریب کی بیٹی کو کوئی بری نگاہ سے نہ دیکھ سکے' پنجاب پولیس کو سلام' بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے شاہد رفیق سہو' چاہت اور محبت کی انتہا کو پہنچ کر بتانے میں اتنی دیر کردی جو کہ پچھتاوے کے سوا اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ نازو کہاں چلی گئی مقصود احمد بلوچ نازو کی محبت میں اپنائیت تھی محبت سے جڑی بہترین کہانی ہے آخر میں سوتن نے کام کر ہی دکھایا۔ نادانیاں مجید احمد جائی دولت انسان کو بگاڑ بھی دیتی ہے اور جوانی واقعی نادان ہوتی ہے اس میں کئی دانیال انسان سے ہونے کا خدشہ رہتا ہے سبق آموز کہانی ہے' میاں چھوڑو ایسے لوگوں کی باتوں پر غور کرنا حماقت سے کم نہیں۔ خالہ تندور والی طاہر مقصود ہاشمی قسمت میں طمن ہو تو نجانے کس موڑ پر ملا دیتی ہے قسمت سے جڑی بہترین کہانی ہے۔ میم جی فرزانہ نگہت سارہ کا حوصلہ مند ہونا اور اطمینان قابل تعریف ہے۔ ستم گزیدہ' عمران قریشی صفیہ کا اپنے شوہر کی محبت میں غلط قدم ایک تلخ حقیقت ہے۔ صفیہ کا اپنے شوہر کی جان بچانے کے لیے یہ راستہ اپنانا پڑا۔ جب معاشرے میں احساس بالکل ختم ہو جاتا ہے تو عزتیں ایسے ہی لٹتی جاتی ہیں حالات سے مجبور عورتیں اور کیا کریں؟ فتح محبت ریحانہ اعجاز پاک فوج سے محبت اور وطن پر جان قربان کرنے کا جذبہ سوہا کی پاک فوج سے محبت محبت سے جڑی بہترین کہانی ہے۔ عامل کامل دلچسپ قسط پڑھنے کو ملی۔ ریت کی گود میں منزہ سہام' غم کی کیفیت انسان کو ذہنی مریض بنادیتی ہے جس کا صدمہ ساری زندگی بن جاتا۔ غفلت کے پردے رشتوں میں جب ہوش آجاتی ہے تو پھر غفلت کے پردے اڑ جاتے ہیں ثنا کو اپنی بہن کو اتنی آزادی نہیں دینی چاہیے تھی جس کا نتیجہ اس کے گھر کو ہی برباد کیا۔ قسمت کی لکیریں موبائل کا غلط استعمال کئی گھروں کو اجاڑ دیتا ہے ایسے ہی پھر زندگی نے اسے قسمت نے کہاں تک لے گئی۔ سبق آموز تحریر ہے۔ ستارہ فوزیہ اختر یہ حقیقت ہے کہ عورت گھر کو جنت بھی بنا سکتی ہے اور نسلیں بھی برباد کرجاتی ہے اگر ہٹ دھرمی پہ اتر آئے تو خواب زادی فیصل مشتاق کی زبردست کہانی' اب اجازت۔

☆ فیصل بھائی بالکل آخری لمحوں میں آپ کا خط ملا یقین کریں پانچ منٹ کی تاخیر ہوتی تو چھپنے سے رہ جاتا' بہرحال ایک عمدہ خط شمارہ پسند کرنے کا شکریہ

ابوہریرہ بلوچ' بہاولنگر سے لکھتے ہیں۔ مکرم منزہ سہام' ٹیم ممبران لکھاریوں' ریڈرز اور احوالیوں کو سلام' پرچے سے تعلق اتنا پرانا تو نہیں تاہم میری سات سے زائد کہانیاں اوراق ڈائجسٹ کی زینت بڑھا چکی ہیں۔ شاید کچھ لوگ اب بھی مجھے جانتے ہوں؟ وقت اور حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے اور ان کے ساتھ ساتھ انسان میں بھی بدلاؤ آنا کچھ بعید نہیں' ویسے بھی عقلمند کہتے ہیں کہ کامیاب وہی رہ سکتا ہے جو وقت اور حالات کے مطابق بدلتا آتا ہو ورنہ کچلے جانے کا ڈر ہمیشہ رہتا ہے۔ دو کہانیاں حاضر خدمت ہیں اس امید سے کہ تعلق دوبارہ بحال ہوسکے گا۔ اب اگلے ماہ بات تفصیلی ہوگی اجازت دیں۔

☆ ابوہرہ! تعلق نیا یا پرانا نہیں ہتا بس اچھا ہونا چاہیے اور مجھے فخر ہے کہ میرے لکھاریوں کا تعلق سچی کہانیاں سے زبردست جارہا ہے امید کرتی ہوں کہ تم اب پابندی سے احوال کا بھی حصہ بنو گے اور اپنی کہانیاں بھی ارسال کرو گے۔

اس آخری خط کے ساتھ اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے اور سچی کہانیاں سے متعلق کوئی بھی بات ہو بلاجھجک مجھ سے کہیے۔ میں منتظر رہوں گی۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

غلام جو بنے سردار

حضرت اسلم حبشیؓ

اُمِ ایمان (غزالہ عزیز)

جیسے کہ نام سے ظاہر ہے یہ حبشہ کے رہنے والے تھے کچھ روایات میں ان کا نام اسلم راعیؓ بھی لکھا گیا ہے۔ وہ اس لیے کہ وہ راعی یعنی بکریاں چرانے والے تھے۔

وہ خیبر کے ایک یہودی شخص عامر کے غلام تھے اور اس کی بکریاں چرانے کا کام ان کے سپرد تھا۔

جنگ احد کے بعد شوال 5ھ میں اسلامی ریاست کے خاتمے کے لیے یہودی تمام عرب قبائل کا متحدہ لشکر مدینہ پر چڑھا لائے۔ یہ جنگ مسلم طاقت اور اعصاب کا کڑا امتحان تھا۔ اس سے پہلے اگرچہ بدر اور احد کی جنگیں اپنی جگہ انتہائی سخت تھیں۔

لیکن امتحان کا وقت کم تھا اور جو کچھ ہوا تھا' وہ صرف ایک دن میں ہی ہو گیا تھا۔ لیکن اب کی بار وقت بھی طویل تھا اور مقابلے میں صرف قریشی مکہ نہیں بلکہ بہت سے مشرکین عناصر تھے۔

آپ نے اس جنگ سے یہودی قبیلہ بنی عطفان کو علیحدہ رکھنے کے لیے مدینے کی تہائی پیداوار پر سمجھوتے کی کوشش کیں' بنو عطفان کو مالی مفاد زیادہ عزیز تھا۔

لیکن مسودہ پر دستخط سے پہلے حضورﷺ نے انصار میں سے سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ جو اوس و خزرج کے سردار تھے' سے مشورہ لینا ضروری سمجھا۔

انہوں نے حمیت اور غیرت کے جوش میں رسول اللہﷺ سے کہا......

''یہ لوگ تو اس وقت ہم سے ہمارا مال نہ لے سکے جب ہم کافر تھے اور اب تو ہم نور اسلام سے مالا مال ہیں اور زیادہ قوی ہیں تو کیا اب ہم انہیں اپنا مال اپنے ہاتھ سے سونپ دیں؟ خدا کی قسم ایسا نہیں ہوسکتا اور ایسے کسی معاہدہ کو آپ نہ باندھیں؟''

حضور اکرمﷺ ان کا یہ جواب سن کر بہت

خوش ہوئے اور وہ تحریر آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو دی کہ وہ اس کو خود چاک کر دیں۔

حضور ﷺ نے بنو غطفان کے ساتھ مصالحتی معاہدہ کی جو راہ سوچی تھی وہ اس وجہ سے تھی کہ کہیں انصار مدینہ یہ محسوس نہ کریں کہ ان کے سر ناقابل برداشت مصیبت آ پڑی ہے۔

اور آپ ﷺ نے چاہا کہ ان کی طرف سے کسی ایسے اظہار سے پہلے ہی کوئی حل نکال لیا جائے۔ مگر اوس و خزرج کے سرداروں نے مضبوطی دکھائی اور یوں آپ ﷺ مطمئن ہو گئے۔

جنگ خندق میں جب کفار کی متحدہ قوتوں نے محاصرہ کر رکھا تھا اور یہی وہ وقت تھا کہ جس کے بارے میں قرآن میں اللہ نے فرمایا...... ''آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے۔''

تب حضرت جبرائیلؑ نے راتوں کو رسول اللہ ﷺ کو خوشخبری سنائی کہ محاصرین ناکام و نامراد واپس چلے جائیں گے۔ اور اللہ کے طوفانی لشکر عنقریب ان پر چھوڑ دیے جائیں گے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے یہ خوشخبری اپنے اصحابؓ کو بھی سنائی اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اظہار تشکر کے لیے بار بار 'شکراً شکراً' کے الفاظ دہرائے۔

6ھ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ ہوا اور یوں قریش سے مصالحتی معاہدہ کر کے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ایک بہت بڑے حریف سے فارغ کر دیا۔

حدیبیہ کے معاہدے کے بعد آپ ﷺ واپس مدینہ آئے اور چند روز قیام کے بعد 7ھ میں خیبر کو روانہ ہوئے۔ خیبر اب تک اسلامی ریاست کے لیے ایک نہایت فعال جنگی سازشوں کا اڈہ ثابت ہوا تھا۔

جنگ احزاب میں انہوں نے نہایت مکاری

نعت

درِ حرم پہ مؤدب کھڑی ہوئی تھی ہوا
کہا مدینے چلیں اور چل پڑی تھی ہوا

حضورؐ آئیں تو چھو کر قدم سلام کرے
اس انتظار میں صدیوں سے جاگتی تھی ہوا

درخت ہاتھ ہلاتے تھے خیر مقدم کو
اتر کے شاخ سے قدموں کو چومتی تھی ہوا

حضورؐ آپؐ کے آنے سے نکہت اس کو ملی
اگرچہ پہلے زمانوں میں بھی یہی تھی ہوا

ظہیرؔ مجھ کو یہ مصرع بتا دیا کس نے
سروشِ نعت تھا یا گنگنا رہی تھی ہوا؟

ثناء اللہ ظہیر

کے ساتھ مسلمانوں کے لیے بڑی تشویش ناک صورت حال پیدا کر دی تھی۔

مدینہ میں آپ ﷺ سباع بن عرفطہؓ کو قائم مقام بنا کر چودہ سو سپاہ کے ساتھ خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔

رجیع کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ خیبر والوں نے جب مسلم افواج کو اپنے سامنے دیکھا تو بھاگ کر اپنے قلعوں میں پناہ گزریں ہو گئے۔ سب سے پہلے 'قلعہ مظاہ' پر حملہ کیا گیا۔ ان قلعوں کے اندر یہودیوں نے مزاحمت کے لیے طویل عرصے کی منصوبہ بندی کی ہوئی تھی۔

حضرت اسلم حبشیؓ اس حملے کے وقت قلعے کے باہر اپنے یہودی آقا کی بکریاں چرا رہے تھے۔ غائبانہ طور پر حضور ﷺ کے بارے میں سن رکھا تھا اور دل آپ ﷺ پر فدا تھا۔

لہٰذا آپؓ بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا۔

''اے محمد ﷺ آپ ﷺ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟'' حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔

''اس چیز کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہ بناؤ اور مجھے اللہ کا رسول ﷺ مانو۔''

حضرت اسلمؓ نے یہ سن کر فوراً تائید کی اور کلمہ شہادت ادا کر کے اسلام کی دولت سے بہرہ مند ہو گئے۔ اب ان کو اس بات کی فکر تھی کہ ان بکریوں کا کیا کیا جائے جو ان کے پاس امانت ہیں۔ لہٰذا حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ میں ان بکریوں کو ان کے مالک کے پاس پہنچا آؤں۔''

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ''تم ان بکریوں کو لشکر سے باہر لے جا کر ہانک دو اور تھوڑی سی کنکریاں ان کے پیچھے پھینک دو۔ اللہ تجھ کو اس امانت سے بری الذمہ کر دے گا۔''

حضرت اسلمؓ نے اس ہدایت پر عمل کیا اور بکریاں واپس چلی گئیں۔ اب جب لڑائی شروع ہوئی تو حضرت اسلمؓ نے مسلمان فوجوں کے ساتھ مل کر جنگ کا ارادہ کیا۔

پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔

''اگر میں اس جنگ میں مارا جاؤں تو آخرت میں میرا کیا بنے گا؟''

حضور اکرم ﷺ نے انہیں جنت کی خوش خبری سنائی۔

اب حضرت اسلمؓ نے میدان جنگ کا رخ کیا اور مردانہ وار شجاعت کے جوہر دکھائے اور شہید ہو گئے۔

حضور اکرم ﷺ نے ان کی شہادت کی خبر سنی تو فرمایا۔

''ترجمہ: ''اس نے تھوڑا عمل کیا اور کثیر اجر پایا۔''

پھر ان کی لاش ایک خیمہ میں رکھ دی گئی۔ سرور عالم ﷺ ان کی لاش کو دیکھنے خیمہ میں گئے تو فوراً پلٹ آئے اور فرمایا۔

''اللہ نے بندۂ حبشی کو عزت و اکرام کے ساتھ جنت میں پہنچا دیا ہے میں نے دیکھا کہ دو حوریں اس کے سرہانے بیٹھی ہیں۔''

اللہ کی قدرت کہ ایک حبشی چرواہے کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ اگرچہ ایک وقت کی نماز بھی وہ نہ پڑھ سکے۔

لیکن اجر اعظیم حاصل کیا اور جنت کے وارث بنا دیے گئے۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے خوش......

☆☆......☆☆

کراچی سے ارسال کردہ بے انتہا دہشت ناک تحریر

تیسری چابی

برائے مہربانی اس کہانی کو رات میں مت پڑھیے گا یہ ادارہ کی درخواست ہے

موت کا دروازہ تیسری چابی سے کھل گیا تھا......

اپنی چابیوں پر نظر ڈالیں کہیں کوئی زنگ آلود چابی تو ان میں موجود نہیں......

ثمینہ مشتاق

ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا فضا کا موبائل مسلسل بج رہا تھا

''اف! اٹھا رہی ہوں بابا......'' فضا نے جلدی سے کانوں میں بالیاں پہنیں۔

''ہیلو......!'' کال ریسیو کر کے وہ آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لینے لگی۔

''کیا یار میں نے آفس سے نکلتے ہوئے تمہیں کتنی بار کال کی۔''

''Im At Home Sweety''۔ فواد کی آواز نے اس کے حسین چہرے پہ مسکراہٹ بکھیر دی۔

''میں تیار ہوں بس آپ کا انتظار تھا......'' باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا' فضا نے کال کاٹ دی اور باہر کی جانب لپکی۔

فواد گاڑی کا دروازہ فضا کے لیے کھول چکا تھا وہ جلدی سے اس کے برابر براجمان ہوگئی۔

''چلیں!......دیر تو نہیں ہوئی۔'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں بالکل بھی نہیں۔'' فواد کی آنکھوں سے اس کے لیے پیار چھلکا۔

''We Are On Time''۔ اس نے گاڑی مطلوبہ منزل کی جانب دوڑا دی۔

فواد کی والدہ انیسہ فاروقی ایک بڑی ٹیکسٹائل کمپنی کی ملک تھیں جہاں فواد بھی اپنے دیگر دو بھائیوں کی طرح حصے دار تھا۔

فواد اور فضا کی شادی کو چند ماہ ہی ہوئے تھے انیسہ فاروقی کی خواہش تھی کہ بہو بیٹا ساتھ ہی ایک گھر کی چھت تلے رہیں پر فضا کسی بھی طرح جوائنٹ فیملی میں رہنے کو تیار نہ تھی یہ اس ہی کی فرمائش تھی کہ شہر سے دور کسی غیر گنجان آباد علاقے میں گھر دیکھا جائے جہاں گاڑیوں اور لوگوں کا شور نہ ہو۔

☆......☆......☆

آج اقبال حسینی صاحب نے ان کو ایک بڑی دعوت پر مدعو کیا تھا۔ اقبال حسینی جیسے بزنس ٹائیکون کو کون نہیں جانتا تھا۔ سرکاری محکموں میں بڑی اوپر تک ان کی رسائی تھی۔

ان سے تعلقات بنانے کے لیے لوگ طرح طرح کے جتن کرتے تھے یہ تو فواد کی خوش نصیبی تھی کے اقبال حسینی کا منظور نظر تھا۔

گاڑی اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچ چکی تھی۔ فضا نے گاڑی سے اترتے ہوئے وسیع و عریض محل نما کوٹھی کو دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت و رشک سے پھیل گئیں۔

''ہائے اللہ ......! کتنی بڑی کوٹھی ہے ملک صاحب کی قسم سے کتنا مزہ آتا ہوگا نا اتنے بڑے گھر میں۔''

فواد اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

''اندر چلیں ......'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے چلنے کی دعوت دی فضا اٹھلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

محفل میں کئی اعلیٰ شخصیات مدعو تھیں شہر کے ایک جانے مانے بلڈر بھی موجود تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی فواد ان کی جانب بڑھ گیا۔

''کیسے ہیں ملک اعجاز صاحب ہمیں بھول تو نہیں گئے۔'' فواد ان سے بڑے تپاک سے ملا

''نہیں چھوٹے تمہارا ذکر تو اکثر دوستوں کی محفلوں میں چلتا رہتا ہے' پر تم آج کل بڑی بیگم صاحب کے ساتھ نظر نہیں آتے ورنہ پچھلے سال تک



تو تمہاری والدہ ہر جگہ تمہیں متعارف کرواتی نظر آتی تھیں۔''

''جی بس ان کا اپنا مزاج ہے کب بدل جائے کسے پتا۔'' فواد ہنسا۔

''میں آج کل ایک گھر کی تلاش میں ہوں۔'' فواد نے قریب رکھی میز سے شربت کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''گھر؟ کس کے لیے......'' ملک اعجاز کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''کہیں انیسہ فاروقی نے تم کو بزنس پارٹنر شپ سے دستبردار تو نہیں کر دیا۔'' فواد کا قہقہہ بلند ہوا۔

''واہ ملک صاحب آپ کا بھی جواب نہیں اتنی دور کی کیسے سوچ لیتے ہیں آپ......!'' اس نے ہاتھ میں پکڑے جام کا ایک گھونٹ بھرا اور بے نیازی سے ملک اعجاز کی جانب دیکھا۔

''اچھا تو گھر کس لیے چاہیے؟'' ملک اعجاز نے سنجیدگی سے اپنا سوال دہرایا

''گھر تو مجھے فضا کے لیے چاہیے اس کی فرمائش ہے کسی ایسے مقام پر گھر ہو جو آبادی سے گھرا ہوا نہ ہو' آب وہوا صحت بخش ہو' آس پاس سبزہ اور ہریالی ہو......اب ایسا گھر اور جگہ ڈھونڈنا میرے بس کی بات نہیں آپ جانتے ہیں میری مصروفیات البتہ......آپ تو اس شہر کے چپے چپے سے واقف ہیں یقیناً کوئی ایسا گھر آپ کی نظر میں تو ضرور ہوگا؟'' ملک اعجاز فواد کی باتیں سنتا رہا۔

''نہ بابا نہ انیسہ فاروقی پاور فل خاتون ہیں ان سے میں دشمنی نہیں لے سکتا تمہارے گھریلو حالات ٹھیک ہو جائیں تو بے شک گھر بتا دوں گا پر بڑی بیگم صاحب کی مرضی کے خلاف نہیں۔''

''ارے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' اقبال حسینی نے بیچ میں مداخلت کی۔

''لو تم بھی سنو اس لڑکے کی باتیں۔'' ملک صاحب نے من وعن تمام قصہ بیان کر دیا۔

''ارے اس میں پریشانی والی کیا بات ہے میرے ایک دوست ملک سے باہر ہوتے ہیں ان کا بنگلہ عرصے سے خالی ہے اور ہے بھی شہر کے راستے سے ذرا ہٹ کے سرسبز وشاداب محل وقوع اگر چاہو تو معائنہ کر لو؟''

''بالکل اقبال صاحب میں ضرور دیکھنا چاہوں گا۔'' فواد مسکرا دیا اس کا گلاس خالی ہو چکا تھا۔ وہ کھانے کی میز کی جانب بڑھ گیا۔

دوسرے ہی دن فضا اور فواد ہائی وے کے قریب درختوں سے گھرے ایک خوبصورت سے لاج کے باہر کھڑے تھے۔ گھر کے چوکیدار نے ایک زنگ آلودہ چابی سے گھر کا دروازہ کھولا۔

گھر صاف ستھرا تھا پر اندر داخل ہوتے ہی ایک عجیب ناگوار بو نے ان کا استقبال کیا۔

''یہ بدبو کیسی ہے؟'' فضا نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔

''کچھ نہیں میڈم جی دیواروں پر سفیدی کی ہوئی ہے کل رات اس ہی رنگ کی بو ہے۔ چوکیدار نے وضاحت کی۔

''اف ایسا لگ رہا ہے کوئی جانور مر کر گل سڑ گیا ہو۔'' فضا نے ہاتھ میں پکڑی منرل واٹر کی بوتل منہ سے لگالی فواد گھر کا تنقیدی جائزہ لے رہا تھا گھر میں ایک ہال کمرہ اور دو بیڈ روم تھے جن میں سے ایک بند تھا۔ فواد نے اسے کھولنا چاہا پر وہ لاک تھا۔

''اس کمرے کی چابی کہاں ہے؟'' فواد نے چوکیدار سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم سر بس......ایک ہی چابی ہے میرے پاس مین دروازے کی اور کسی کمرے کی چابی نہیں ہے سارے دروازے کھلے ہیں سوائے اس

کے۔‘‘چوکیدار نے بند کمرے کی جانب اشارہ کیا۔

فواد نے اس کی بات سن کر لکڑی کے دروازے کے ساتھ زور آزمائی کی پر وہ مضبوطی کے ساتھ بند تھا۔

’’ٹھیک ہے......کوئی چابی والا ڈھونڈ کر لاؤ اس دروازے کی چابی بنوالو اور چائے لے آؤ۔‘‘

’’ٹھیک ہے سر......‘‘چوکیدار نے فرمانبرداری سے کہا۔

فضا باہر بنی چھوٹی سی بالکونی میں کھڑی تھی ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ فواد کو قریب پا کر فضا نے خوشی سے اس کا بازو تھام لیا۔

’’ہائے اللہ فواد دیکھو تو کتنی ہریالی ہے کتنا خوبصورت منظر ہے دور تک پھیلا ہوا۔‘‘فواد کے چہرے پر مسرت بکھر گئی اس نے فضا کو اپنے اور قریب کر لیا۔

’’تم خوش ہو بس اور کیا چاہیے۔‘‘فضا نے اس کی آنکھوں سے چھلکتے محبت کے پیمانے سے اپنے ہونٹ سیراب کیے۔

’’ہاں میں بہت خوش ہوں......مجھے یہ جگہ بہت پسند آئی۔‘‘وہ فواد کی بانہوں کے حصار سے نکل کر واپس ہال کمرے میں آگئی۔

’’میں اس گھر کو اپنی مرضی سے سجاؤں گی میں اس گھر کی واحد ملک ہوں گی بنا کسی شراکت کے بنا کسی روک ٹوک کے ہم یہاں اپنی جنت بنائیں گے۔‘‘اس نے فواد کے ہاتھ تھام لیے۔

’’فواد مجھے یہ گھر چاہیے۔‘‘

’’یہ گھر اب تمہارا ہے۔‘‘ فواد نے فضا کی جانب جھک کر کہا۔ ایک تیز گھنٹی کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا دروازے کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی فضا نے اپنے کان بند کر لیے۔

فواد دروازے کی جانب لپکا چوکیدار چائے کی دو پیالیاں لیے کھڑا تھا۔ فواد چلا کر بولا۔

’’گھنٹی بند کرو۔‘‘

’’میں نے گھنٹی نہیں بجائی سر......‘‘چوکیدار نے چائے کے کپ زمین پر رکھے اور گھنٹی کے بٹن کو کھول بند کرنے لگا۔

’’یہ بند نہیں ہو رہی......پتا نہیں اس کو کیا ہوا۔‘‘ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز سے گھر گونج رہا تھا۔

’’اس کو ٹھیک کرواؤ۔‘‘فواد نے غصے سے چوکیدار کو ہدایت کی۔

’’جو بھی مرمت کا کام ہے اس ہی ہفتے مکمل کروالو مجھے کوئی شکایات نہیں چاہیے۔‘‘فواد فضا کے ساتھ تیزی سے باہر نکل گیا۔

ایک ہفتے کے اندر ہی فضا تین کمروں پر مشتمل اس نئے گھر میں منتقل ہو چکی تھی یہ چھوٹا سا لاج فضا کے لیے جنت سے کم نہیں تھا جہاں وہ اپنی من مانی کر سکتی تھی اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتی تھی انیسہ فاروقی کی حکومت سے بہت دور ایک پرسکون زندگی۔

’’سر یہ کمرے کے بند دروازے کی چابی۔‘‘ چوکیدار نے دو نئی چابیاں فواد کے حوالے کیں۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ فواد کچھ ضروری فائلیں دیکھنے میں مصروف تھا اس نے مختصر جواب دیا۔

’’سر میں چلتا ہوں میری گھر والی کل سے بڑی بیمار ہے نجانے کیا ہوا اسے......کل جیب میں چابی بنوا کر گھر آیا تو وہ خون کی الٹیاں کر رہی تھی......آپ دعا کریں رب خیر کرے۔‘‘

فواد نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی اور جیب سے کچھ پیسے نکال کر اس کے ہاتھ پر دھر دیے۔

’’تم جاؤ اور اس کا خیال رکھو۔‘‘چوکیدار دعائیں دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔

’’کیا ہوا اس کی بیوی کو؟‘‘ فضا ہاتھ میں چائے کا کپ لیے فواد کے سامنے رکھی بید کی کرسی پر بیٹھ

گئی۔

"کچھ نہیں یہ سب ان کے مانگنے کے دھندے ہیں۔شہر سے اتنی دور اسے اپنا خرچہ پانی بھی تو چلانا ہے۔" فواد نے میز پر بکھرے چند کاغذات سمیٹے اور فائل بند کر دی۔

"آج کھانا کہیں باہر کھاتے ہیں۔"

"واہ تم میرے دل کی باتیں کیسے جان لیتے ہو۔" فضا نے شوخی سے پوچھا۔

"آپ کے دل میں جو رہتے ہیں۔" فواد کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

آج فضا کی اس گھر میں پہلی رات تھی۔فواد جلد سونے کا عادی تھا آج بھی وہ دس بجے بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔فضا الماری میں کپڑے رکھ رہی تھی۔جب اسے ایسا لگا کمرے کی کھڑکی پر کسی نے دستک دی ہو۔اس کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رک گئے۔فضا نے مڑ کر کھڑکی کی جانب دیکھا' پر کانچ کی کھڑکی پر دبیز پردہ پڑا تھا۔اس نے اپنا وہم سمجھ کر اس خیال کو جھٹک دیا الماری بند کی اور شب خوابی کا لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔

جب وہ واپس آئی تو فواد جاگ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" فضا نے حیرت سے پوچھا۔

"فضا پہلے ہی کتنی ٹھنڈ ہے اوپر سے تم نے یہ کھڑکی بھی کھول دی دیکھو کتنی سرد ہوا آرہی ہے۔" فواد نے کمرے کی کھڑکی بند کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"پر میں نے......کھڑکی نہیں کھولی فواد۔" فضا حیران تھی۔فواد ہنس دیا۔

"کوئی بات نہیں ڈیئر آئندہ خیال رکھنا میری نیند خراب نہ ہو اور ویسے بھی کوئی جانور اندر آسکتا ہے' کھڑکی بند رہنے دو۔" فواد نے پردے برابر کر دیے۔فضا اب بھی حیرت سے کھڑکی کو دیکھ رہی تھی۔

خوف کی ایک عجیب لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔

"کھڑکی......کس نے کھولی' ہمارے علاوہ گھر میں کون ہے اور کھڑکی تو......اندر سے لاک تھی۔"

"فضا......" وہ فواد کی آواز پر چونکی۔

"سو جاؤ سوئٹی۔" بستر پر لیٹنے کے بعد وہ کب نیند کی وادی میں کھو گئی اسے احساس نہ ہوا۔

صبح تک وہ رات والا واقعہ بھول چکی تھی۔فواد انیسہ بیگم کی کال آنے پر آج جلدی آفس روانہ ہو گیا تھا۔فضا نے بال باندھے اور گھر کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگی۔بند کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے پھر اس ہی ناگوار بو کا احساس ہوا جو پہلی مرتبہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے محسوس ہوئی تھی۔وہ بند دروازے کے باہر رک گئی۔

اس نے کمرے کا لاک گھما کر دیکھا پر وہ ابھی تک بند تھا۔

"اس کی چابی؟" فضا نے خود کلامی کی۔

"پتا نہیں فواد نے کہاں رکھی۔" تیز گھنٹی کی آواز نے پھر کانوں کے پردے پھاڑ دیے۔

فضا نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔

"اف یہ آواز......" وہ تیزی سے دروازے کی جانب لپکی۔

باہر چوکیدار دیوانوں کی سی حالت میں کھڑا تھا۔گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" فضا نے گھنٹی بند کرنے کے لیے بٹن کو کھول بند کیا پر وہ بند نہ ہوئی۔اس نے جھلا کر چوکیدار کو دیکھا۔

"میڈم جی جلدی چلیں۔میری بیوی کو کچھ ہو گیا ہے وہ کل سے خون تھوک رہی ہے ڈاکٹروں کی کچھ سمجھ نہیں آرہا وہ کہتے ہیں اس نے زہر کھا لیا ہے وہ مر جائے گی۔پر وہ زہر کیوں کھائے گی وہ تو بہت خوش

تھی میرے ساتھ۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں......؟"

"میڈم جی وہ بار بار آپ کا نام لے رہی ہے اس کو آپ سے ملنا ہے میں نہیں جانتا کیوں پر آپ جلدی چلیں وقت شاید کم ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

فضا نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور اس کے ساتھ ہسپتال کی جانب روانہ ہو گئی گھر ابھی بھی گھنٹی کی آواز سے گونج رہا تھا۔

گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہائی وے تھی اور ہائی وے کے ساتھ ہی آگے جا کر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں چوکیدار کی رہائش تھی۔ وہیں مقامی ہسپتال میں اس کی بیوی زیر علاج تھی۔ فضا چوکیدار کے ساتھ ہسپتال میں داخل ہوئی۔ چوکیدار ایک کمرے کے باہر رک گیا۔

"میڈم جی آپ اندر چلی جائیں......وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

فضا جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہسپتال کے بستر پر ایک عورت آنکھیں بند کیے گہرے سانس لے رہی تھی آکسیجن ماسک اس کے منہ پر لگا تھا۔ فضا کی آمد پر اس نے آنکھیں کھول دیں اور ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا۔ فضا نے تلے قدموں سے اس کی جانب بڑھ گئی ۔عورت نے آکسیجن ماسک اتار دیا اور کچھ بولنے کی کوشش کی پر فضا اس کی سرگوشی سننے سے قاصر رہی اس نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے جا کر الفاظ کو واضح سنے کی کوشش کی اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"مارنے کی کوشش کی ہے۔"

"کس نے؟" فضا پوچھا۔ عورت نے ہاتھ کا اشارہ دروازے کی جانب کر دیا۔ فضا نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سامنے چوکیدار کھڑا تھا۔

"کیا......تم نے اپنے بیوی کو مارنے کی کوشش کی ہے؟" فضا نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"نہیں......میڈم جی۔" چوکیدار لرز گیا۔

"میں ایسا کیوں کروں گا میں تو اس سے بے حد پیار کرتا ہوں۔" وہ اپنی بیوی کے قدموں سے لپٹ گیا۔

"تو یہ کیا کہہ رہی ہے۔" عورت کے ہونٹ پھر ہلے فضا نے قریب جا کر سننے کی کوشش کی عورت کے منہ سے چند الفاظ برآمد ہوئے۔

"وہ......چابی اس کے پاس ہے......جس نے آگ لگائی......وہ کنواں......مت جانا......وہ مار دے گی......اسے مت کھولنا۔"

فضا نے حیرت سے عورت کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں تکلیف سے باہر نکل آئی تھیں گردن کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔

"کسے مار دے گی؟" فضا نے گھبرا کر پوچھا۔

عورت نے فضا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور دروازے کی جانب خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

اس نے پھر دروازے کی جانب اشارہ کیا فضا نے اس اشارے کے تعاقب میں پیچھے مڑ کر دیکھا پر وہاں کوئی نہیں تھا اس کے ہاتھ پر عورت کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی آنکھیں اب بھی کھلی تھیں پر زندگی کا باب بند ہو چکا تھا۔

فضا جب گھر واپس لوٹی تو رات ہو چکی تھی فواد کی گاڑی گھر کے باہر موجود تھی۔ اس نے گھر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی فواد کسی سے موبائل پر زور زور سے باتیں کر رہا تھا۔

"یہ بات آپ نے پہلے کیوں نہیں بتائی......سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ نے میرے ساتھ

اتنا بڑا دھوکہ ہونے دیا۔“

”میں ہی بیوقوف تھا یہی سمجھتا رہا کہ دوستی کے نام پر احسان کیا جا رہا ہے مگر یہاں تو اپنے گلے کی مصیبت میرے سر منڈھ دی گئی ہے۔ اقبال حسینی نے مجھے سمجھا کیا ہے۔“

”میں دیکھ لوں گا سب کو۔“ فواد نے غصے سے کال کاٹ دی۔

”کیا ہوا......؟“ فضا نے کندھے سے بیگ اتار کر صوفے پہ رکھا۔

”کچھ نہیں۔“ فواد اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

”کہاں تھیں تم کب سے تمہارا موبائل ٹرائی کر رہا ہوں۔“ فضا سر پکڑ کر صوفے پہ بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا تم ٹھیک ہو؟“ فواد نے بے چینی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ چوکیدار کی بیوی مر گئی فواد۔“ فضا کی آنکھیں نم تھیں۔

”اوہ......! افسوس ہوا۔“ فواد اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے بستر مرگ پر میری اس سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے کچھ بتانا چاہتی تھی کچھ کہنا چاہتی تھی پر میری کچھ سمجھ نہیں آیا۔ چابی آگ کنواں۔ وہ مار دے گی۔ کون مار دے گی کسے مار دے گی۔ میری کچھ سمجھ نہیں آیا۔“

”ریلیکس فضا......“ فواد نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”کول ڈاؤن سب ٹھیک ہے جانو میری جانب دیکھو۔ مرنے سے قبل بندہ اکثر ایسی ہی بے سروپا باتیں کرنے لگتا ہے جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ بھول جاؤ اُسے۔“

”لیکن فواد......وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھی مجھے ہی کیوں بتانا چاہتی تھی میں تو اسے جانتی تک نہیں تھی۔“ فضا بضد تھی۔

”ہوسکتا ہے چوکیدار اپنی بیوی سے تمہارا تذکرہ کرتا رہا ہو لاشعوری طور پر اسے تم سے ملنے کی خواہش ہو۔“ فواد نے اٹھ کر ٹھنڈا پانی فضا کو پیش کیا۔

”لو پانی پیو......فضا ہم نے ابھی تو اپنی زندگی ٹھیک سے شروع بھی نہیں کی تم کن باتوں میں الجھ گئی ہو۔ دیکھو اپنے خوابوں کا آشیانہ سجاؤ اسے اپنی محبت سے مہکاؤ۔“ اسے فواد نے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔ فضا مسکرا دی۔

”Thats My Girl“۔ فواد مسکرا دیا۔

”کل ہم گھر کے لیے اچھی سی شاپنگ کریں گے اب تم جلدی سے اٹھو بہت بھوک لگی ہے۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔“ فواد اسے لاؤنج میں تنہا چھوڑ کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ فضا کچھ دیر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی اور پھر کھانا بنانے کے لیے اٹھ گئی۔

رات کے پچھلے پہر فضا کی آنکھ کھڑکی کی دستک سے کھلی۔ کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا جس کی ملگجی روشنی میں کھڑکی کے کھلے پٹ بآسانی دیکھے جا سکتے تھے۔

”اف! یہ کھڑکی کیسے کھل جاتی ہے۔“ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بستر سے اٹھنا پڑا کھڑکی سے باہر دور تک پھیلے درختوں کے سائے چاندنی رات میں ایک عجیب سا پراسرار منظر پیش کر رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی بند کرنے کی کوشش کی پر اچانک درختوں کے پاس سرسراہٹ نے اس کے ہاتھ روک دیے۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ایک نو دس سال کا بچہ قریب کے درختوں میں کھڑا اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ کچھ لمحے فضا اسے اپنی آنکھوں کا دھوکہ سمجھتی رہی پر وہ بچہ پلٹ کر درختوں کے جھنڈ میں

غائب ہو گیا۔ سرد ہوا کے باوجود فضا کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ اس نے تیزی سے کھڑکی لاک کر کے پردے برابر کر دیے اور کمبل میں دبک کے لیٹ گئی۔

"تم پلیز آج مت جاؤ فواد......" فضا نے صبح ناشتے پر ہی ضد شروع کر دی۔

"میں شاید مینٹلی بہت اپ سیٹ ہوں۔ تم نہیں جانتے میں نے کل رات کھڑکی سے باہر جنگل میں ایک چھوٹا بچہ دیکھا تھا۔"

فواد ناشتہ کرتے ہوئے ہنس پڑا۔

"ناٹ بیڈ تم نے خواب دیکھا ہو گا اور کیا پتا ہمیں جلد ہی اس کی تعبیر بھی مل جائے۔"

"پلیز فواد میں سنجیدہ ہوں۔" فضا منہ بنا کر بولی۔

"میں بھی......" فواد پھر ہنسا اور اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

"فضا میں جلدی آ جاؤں گا پریشان مت ہو اور کوئی مصروفیت ڈھونڈو فارغ رہو گی تو ایسے بیکار خیالات آتے رہیں گے۔" فواد اس سے رخصت ہو کر آفس کے لیے روانہ ہو گیا۔ فضا نے اس کے جانے کے بعد تیز آواز میں ٹی وی چلایا اور کل رات کے واقعے کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگی۔

آج موسم کے تیور کچھ اچھے نہیں تھے رم جھم شروع ہو چکی تھی' بارش دیکھ کر فضا کا موڈ اچھا ہو گیا اس نے ٹی وی بند کیا اور چائے بنانے کچن میں آ گئی۔ وہ اپنی پسند کا نغمہ گنگنا رہی تھی۔۔۔۔ کسی بچے نے اسے پیچھے سے پکارا۔

"مما......" فضا نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ بچے کی آواز بہت واضح تھی۔ فضا نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی پر وہ جانتی تھی یہ وہم نہیں ہے۔ آواز دوبارہ آئی اور کمرے سے باہر ہوا کے ساتھ تحلیل ہوتی ہوئی جنگل کی جانب منتشر ہو گئی۔ فضا کی آنکھیں کسی غیر مرئی شے کو تلاش کر رہی تھیں' پر باہر محض بارش کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اچانک تیز گھنٹی کی آواز نے اس کو بری طرح چونکا دیا اس نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ اپنے دونوں کان بند کر لیے۔

"پلیز......!" وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

"بند کر دو یہ آواز۔" اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"کہیں فواد...... موسم کی وجہ سے واپس نہ آ گئے ہوں۔" اس خیال کے آتے ہی اس نے تیزی سے دروازہ کھول دیا پر باہر کوئی نہیں تھا۔ گھنٹی کی تیز آواز بارش کے شور میں بھی سنائی دے رہی تھی اس نے چلا کر پوچھا۔

"کون ہے؟" اس کی آواز میں اب خوف کے ساتھ غصہ بھی عود آیا تھا۔

"میں پوچھتی ہوں کون ہے سامنے کیوں نہیں آتے۔" اس نے دروازے سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا پر دور دور تک بارش اور درختوں کے اندھیرے کے سوا اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ گھر واپس جانے کے لیے مڑی تو اس کی نظر دروازے میں کھڑی عورت پر پڑی۔ وہ دونوں ہاتھ باندھے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"کون...... کون ہو تم؟" فضا نے ہونٹ ہلائے۔

"اُس نے مار دیا۔" وہ عورت ایک دم چلا کر اس کی جانب بڑھی' فضا گھبرا کر پیچھے ہٹی وہ عورت اس کے برابر سے بھاگتی ہوئی جنگل میں گم ہو گئی۔ فضا خوف و دہشت سے اپنی جگہ کھڑی بارش میں بھیگ رہی تھی۔

کچھ دیر تک اس کی نظریں جنگل میں گم ہو جانے

والی عورت کو تلاش کرتی رہیں اس کی سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں اس نے مڑ کر دوبارہ گھر کے دروازے کی جانب دیکھا۔ اب کی بار بھی نظر آنے والا منظر اس کے اوسان خطا کر دینے کے لیے کافی تھا دروازے میں ایک کمسن سنہرے بالوں والی بچی شعلوں میں گھری کھڑی اسے دیکھ رہی تھی آگ کی لپٹوں نے اس کے پورے وجود کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ بچی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی اور پھر گھر کے اندر چلی گئی۔ فضا تقریباً بھاگتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی پر آگ اور بچی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ فضا نے اپنا سر تھام لیا وہ بے حد خوف زدہ تھی' ہال کمرے سے اس کی نظر بالکنی سے باہر نظر آنے والے درختوں پر پڑی۔ جہاں سے کئی بچے اس کی جانب خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ فضا کی ایک دل خراش چیخ بلند ہوئی اور وہ حواس سے بیگانہ ہو کر فرش پر گر پڑی۔

فضا کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ہسپتال کے کمرے میں پایا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش پر فواد نے اسے روک دیا۔

''لیٹی رہو...... کیا ہوا تھا فضا میں گھر آیا تو تم فرش پر بیہوش پڑی تھیں پورے دو گھنٹے بعد تمہیں ہوش آیا ہے' آخر ہوا کیا تھا؟''

''فواد......'' فضا نے بولنے کی کوشش کی پر خوف ابھی بھی اس کے اعصاب پر سوار تھا۔

''وہ بچے...... جنگل میں رہتے ہیں...... کون ہیں وہ؟'' فواد کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''بچے؟ جنگل میں؟ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں فواد میرا یقین کرو پلیز......'' فضا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''میں نے دیکھا ہے خود اپنی آنکھوں سے ایک بچی کو جلتے ہوئے اپنے گھر کی دہلیز پر...... اور وہ عورت فضا نے آنسو صاف کیے...... وہ عورت کہہ رہی تھی' اس نے مار دیا۔'' فضا فواد کے سینے سے لگ کر پھر رو پڑی وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ فواد نے ڈاکٹر کی جانب دیکھا جو سکون کا انجکشن دینے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

فضا انجکشن کے بعد گہری نیند سو چکی تھی فواد نے کال ملائی موبائل اسکرین پر اقبال حسینی کا نمبر جگمگایا۔

''ہیلو......''

''فواد کیا حال ہیں۔'' اقبال حسینی کی بھاری آواز سنائی دی۔

''میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں آخر یہ چکر کیا ہے؟''

''کیسا چکر؟'' اقبال حسینی نے فواد کے سوال پر انجان لہجے میں پوچھا۔

''آپ سب جانتے ہیں اور جان بوجھ کر یہ گھر آپ نے مجھے بیچا۔''

''میں کچھ نہیں جانتا تم کیا پہیلیاں بوجھوا رہے ہو؟'' اقبال حسینی نے گرجدار لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ نہیں بتانا چاہتے پر میں جان گیا ہوں گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جس سے عجیب و غریب داستانیں وابستہ ہیں اور اس ہی وجہ سے یہ لاج کوئی نہیں خریدتا اور نہ وہاں کوئی بھی رہنا پسند کرتا ہے۔''

''تمہیں یہ کس نے بتایا؟'' اقبال حسینی نے تشویش کا اظہار کیا۔

''ملک اعجاز۔'' فواد نے مختصر جواب دیا۔ اقبال حسینی کا قہقہہ بلند ہوا۔

''یہ سب بکواس ہے فواد تم بھی کس کی باتوں میں آ گئے ہوا ایسا کچھ نہیں ہے۔ اور میں نے کون سا یہ لاج تم کو زبردستی خریدنے پر مجبور کیا تھا سب تمہاری

ایسا پر ہی ہوا۔"
"اگر یہ سچ نہیں ہے تو فضا کی یہ حالت کیسے ہو گئی؟" فواد کا لہجہ سخت ہو گیا۔
"تم وہ مکان چھوڑ سکتے ہو بیچ سکتے ہو۔ مگر میں یہی کہوں گا تمہاری بیوی نے شاید کسی حادثے کا گہرا اثر لے لیا ہے۔ باقی تم خود سمجھدار ہو۔" کال کاٹ دی گئی۔ فواد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔
دو دن ہسپتال میں رہنے کے بعد فضا گھر واپس آ گئی پر اس کے چہرے سے ہنسی اور رونق غائب ہو چکی تھی۔
"فضا......" فواد نے پیار سے اس کے بکھرے بال سمیٹ دیے۔
"کیا سوچ رہی ہو۔" وہ خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فواد نے کافی کا کپ اس کے سامنے رکھا۔
"میں ہوں نا تمہارے پاس......سب ٹھیک ہے۔ آج ہم مل کر گھر کی کچھ سیٹنگ کریں گے۔" اس نے فضا کا ہاتھ تھام کر کہا وہ کافی دیر تک اس کا دل بہلانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔
"چلو آؤ آج اس بند کمرے کو کھولتے ہیں...... نا جانے کب سے بند پڑا ہے مل کر اس کی صفائی کر لیں گے۔" وہ فضا کا ہاتھ تھام کر اسے ہال کمرے میں لے آیا۔ بند دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے چوکیدار کی دی ہوئی دو چابیاں نکالیں پر ان دونئی چابیوں کے ساتھ ایک زنگ آلودہ تیسری چابی بھی موجود تھی۔ فواد نے اسے تشویش سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔
"یہ چابی...... کس دروازے کی ہے؟" اس نے خود کلامی کی اور نئی چابی سے دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا پر لاک نہ کھلا اس نے دونوں نئی چابیوں کو آزما کر دیکھ لیا پر نتیجہ صفر رہا۔
"حد ہے اس چوکیدار سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔" اس نے جھلا کر تیسری زنگ آلودہ چابی لاک میں لگا کر گھمائی اور دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔
"ارے واہ لگتا ہے چوکیدار کو اس کی اصل پرانی چابی بھی مل گئی تھی۔" فواد مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔
اندر آتے ہی گوشت جلنے کی ایک ناگوار سی بو محسوس ہوئی کمرے میں پرانا فرنیچر اور سامان اب بھی موجود تھا ایک بستر آرام کرسی ایک لوہے کا پرانا صندوق لکڑی کا ایک جھولنے والا گھوڑا اور بچوں کے چند کھلونے جابجا بکھرے پڑے تھے دیواروں پر بچوں کے ہاتھ سے آڑی ترچھی لکیریں کھنچی ہوئیں تھیں عجیب و غریب شکلیں دیوار پر کسی تیز دھار آلے سے بنائی گئی تھیں۔ فواد نے کمرے کی کھڑکی کے پردے ہٹا کر پٹ کھول دیے۔ فضا کمرے کے دروازے میں خاموش کھڑی تھی۔
"شاید یہ کبھی کسی بچے کا کمرہ رہا ہے۔" فواد نے اسے مڑ کر دیکھا۔ فضا اب بھی خاموش کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔
"کیا ہوا......؟" فواد نے اسے بازوؤں سے تھام لیا۔
"کچھ نہیں مجھے اس کمرے سے وحشت ہو رہی ہے۔" فضا فواد کو تنہا چھوڑ کر اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔
فواد نے قریبی قصبے کے مزدور فضل علی کی مدد سے کمرے کی صفائی کی فضل علی سے ہی اسے پتا چلا کے چوکیدار کو اس کی بیوی کے قتل کے شعبے میں پولیس پکڑ کر لے گئی تھی جہاں اس نے زیر حراست خودکشی کر لی تھی۔
پولیس کو ایک رات اس کی لاش حوالات کی

چھت سے ٹنگی ملی۔اس نے خود کو پھانسی لگا لی تھی پولیس حیران تھی اس نے خود کو پھانسی دی کیسے نہ حوالات میں کوئی رسی تھی اور نہ چھت تک رسائی کا کوئی ذریعہ تھا۔

فواد نے دانستہ اس بات کا ذکر فضا سے نہیں کیا۔ صبح گھر سے رخصت ہوتے وقت فواد نے اسے جلد گھر آنے کی یقین دہانی کروائی اور آفس روانہ ہو گیا۔

فضا اپنے کمرے میں لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ اچانک اسے آرام کرسی کے چرچرانے کی آواز آنا شروع ہوئی جیسے دھیرے دھیرے اس پر کوئی جھول رہا ہو۔

فضا دبے قدموں سے چلتی ہوئی ہال کمرے میں پہنچی۔آواز اس ہی کمرے سے آرہی تھی جسے فواد نے کل کھولا تھا۔فضا نے کمرے میں جھانکا کرسی کی پشت سے سر ٹکائے سفید کپڑوں میں ملبوس ایک عورت جھول رہی تھی اس کی نظریں چھت پر گڑی ہوئیں تھیں۔فضا کا گلا خشک ہو چکا تھا لفظ پھندا بن کر گلے میں اٹک گئے تھے۔

''کون ہو تم؟'' فضا کے سوکھے ہونٹوں سے بمشکل چند الفاظ ادا ہوئے۔ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ کمرے میں رکھا صندوق کھلا اور بہت سے کاغذات اور تصویریں کمرے میں بکھر گئیں۔فضا نے کرسی کی جانب دوبارہ دیکھا پر کرسی ساکن تھی اب وہاں کوئی نہیں تھا اس نے آگے بڑھ کر ایک تصویر اٹھا لی اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں ایک سات یا آٹھ سال کا پیارا سا بچہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔فضا نے تصویر پر ہاتھ پھیرا۔اپنے پیچھے کسی کی موجودگی پر اس نے خوفزدہ ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔اس کی خوفناک چیخ سے گھر گونج اٹھا اس کے سامنے چھت سے اس ہی بچے کی لاش گردن سے بندھی رسی پر جھول رہی تھی

فضا خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی اور پیچھے رکھی میز سے ٹکرا گئیں میز پہ رکھا فش اکویریم اس کا دھکا لگنے سے گر کر ٹوٹ گیا فرش پر پھیلے پانی میں چھوٹی چھوٹی گولڈن مچھلیاں تڑپ رہی تھیں فضا کی سانسیں بے ترتیب تھیں فرش پر کسی کے گیلے پیروں کے نشان بننا شروع ہوئے جو ہال کمرے سے ہوتے ہوئے اس کے کمرے تک چلے گئے تھے۔فضا خوفزدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

وہ ان غیر مرئی نشانوں کے پیچھے اپنے کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئی۔کمرے کے دروازے پر پڑے پردے کو اٹھانے کی اس میں ہمت نہ تھی پر اب یہ الجھن اسے ہر حال میں سلجھانی ہی تھی اس کی دھڑکن بے قابو تھی کانپتے ہاتھوں سے اس نے دروازے کا پردہ سرکایا۔بستر پر وہی عورت کسی مردہ لاش کی مانند پڑی ہوئی تھی جو کچھ دن قبل بھاگ کر جنگل میں گم ہو گئی تھی اس کا چہرہ بالکل سفید تھا جیسے سرد خانے میں رکھی کوئی لاش ہو اس کی آنکھیں بند تھیں فضا کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی پھر ہمت کر کے اپنا سوال دہرایا۔

''کون ہو تم؟'' اس عورت نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ بیٹھی اس نے آہستہ آہستہ گردن گھما کر فضا کو دیکھا اور چلائی۔

''کیا تو جانتی نہیں اس نے مار دیا۔''

فضا پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔

''کس نے مار دیا؟'' اس نے پھر پوچھا۔

عورت نے ہاتھ کا اشارہ دروازے کی جانب کر دیا۔

فضا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔سفید کپڑوں میں ملبوس عورت سر جھکائے اپنی گود میں ایک بچے کی لاش لیے بیٹھی رو رہی تھی ایک تیز دھار آلہ اس کے قریب پڑا تھا بچے کی گردن سے بہتے خون نے اس کے سفید کپڑے رنگ دیے تھے اس عورت نے سر اٹھا کر فضا

کو دیکھا۔
"میں نے اسے نہیں مارا...... اس نے مارا۔"
فضا پردے کو مضبوطی سے تھامے کھڑی تھی۔
اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے خوف سے اس کے وجود پر لرزہ طاری تھا۔
"کس نے؟" فضا نے بمشکل پوچھا۔
"موت نے......" وہ زور سے ہنسی اور قہقہہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ فضا نے آنکھیں بند کر لیں اچانک خاموشی چھا گئی۔ فضا نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔
پر اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔
"جب تک موت زندہ ہے۔۔ وہ مارتی رہے گی...... موت کو مار دو۔" فضا نے اپنے کمرے کی جانب دیکھا پر وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کی سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں۔
"کون...... کون ہے موت...... کیسے مرے گی۔ ...... بولو...... جواب دو بتاؤ۔" فضا چلائی۔
بالکونی سے باہر کئی بچے لاش کی مانند سفید چہرہ لیے کھڑے اسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ فضا سے نظریں ملتے ہی وہ جنگل کی جانب پلٹ گئے۔
فضا تیزی سے دوڑتی ہوئی باہر نکلی اور ان کے تعاقب میں جنگل کے درختوں میں گم ہو گئی۔
کچھ آگے جا کر اس کے قدم خود بہ خود رک گئے جنگل کی سیدھی جانب کئی چھوٹی بڑی قبریں بنی تھیں اور ان قبروں کے باہر وہی بچے خاموش کھڑے تھے جن کے تعاقب میں فضا یہاں تک آ گئی تھی چند قدم کے فاصلے پر ایک قبر سے کسی عورت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ قبر اوپر سے کھلی ہوئی تھی فضا نے جھانک کر دیکھا تو وہی عورت قبر میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔

"تم...... کون ہو...... یہاں کیا کر رہی ہو؟"
فضا نے ہمت کر کے پوچھا۔
"مجھے وہ یہاں لائی ہے۔" اس نے آنسوں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا کاجل کی ایک موٹی کالی لکیر سے اس کا چہرہ اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔
"کون؟" فضا پر خوف اب بھی حاوی تھا۔
"وہی جو سب کو یہاں لے آتی ہے جو تمہیں بھی یہاں لے آئی ہے۔"
"مجھے...... کون لایا؟" فضا نے الجھ کر کہا۔ اس عورت نے کچھ فاصلے پر بنے کنویں کی جانب اشارہ کیا۔
"وہ لائی ہے یہاں تمہیں۔" فضا کے قدم بے اختیار کنویں کی جانب بڑھ گئے اس کی آنکھیں کائی زدہ کنویں پر جمی تھیں۔ جو رقبے میں زیادہ بڑا نہ تھا۔ اس نے کنویں کے قریب پہنچ کر نیچے جھانکا۔ وہ کافی گہرا تھا اسے اپنے قریب سوکھے پتوں پر اس عورت کے قدموں کی چرچراہٹ سنائی دی۔ فضا نے اس عورت کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"کنویں میں وہ رہتی ہے۔" اس نے فضا کے قریب آ کر سرگوشی کی اور فضا کا چہرہ کنویں کی جانب جھکا دیا۔
فضا کی زبان لفظوں کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ وہ خوف زدہ ہو کر کنویں کی گہرائی کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔
"کون؟" فضا کے ہونٹ ہلے۔
"موت...... جو سب کو یہاں لاتی ہے جو تمہیں یہاں لائی ہے جو کبھی نہیں مرتی کبھی نہیں مر سکتی۔" فضا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔
"نہیں...... میں مرنا نہیں چاہتی بے بسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ آہستہ آہستہ ہوا میں بلند ہونا شروع ہوئی یہاں تک کے اس کے قدم

کنویں کی دیوار سے ٹکرانے لگے۔

''مجھے چھوڑ دو......'' فضا نے التجا کی۔

''ہم موت کو نہیں چنتے موت ہمیں چنتی ہے اور اس نے تم کو چن لیا ہے۔''

فضا ایک جھٹکے کے ساتھ کنویں میں گر گئی اس نے اپنے بچاؤ کے لیے پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے اور اوپر کی جانب دیکھ کر مدد کے لیے پکارتی رہی پر وہاں فضا کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا کنویں کے باہر دیوار سے وہی بچے جھانک رہے تھے جن کے پیچھے وہ یہاں تک آئی تھی انہوں نے کنویں کا منہ ایک بھاری سل سے بند کر دیا۔

☆......☆......☆

''میں نہیں جانتا فضا کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا مجھے میری بیوی واپس چاہیے کسی بھی طرح اسے ڈھونڈیں۔'' فواد مقامی پولیس اسٹیشن میں فضا کی گمشدگی سے پریشان بیٹھا تھا۔

''میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں تفتیش کے دوران آپ کے گھر سے یہ چند خطوط اور بچوں کی پرانی تصویریں ملی ہیں جو ایک کمرے میں جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ آپ کا کہنا ہے کے آپ دونوں میاں بیوی اس گھر میں تنہا رہتے تھے تو پھر ان خطوط اور تصویروں سے آپ کا کیا تعلق ہے؟'' انسپکٹر نے چند خطوط اور تصویریں فواد کے سامنے رکھ دیں۔ فواد نے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔

''میں نہیں جانتا یہ آپ کو میرے گھر سے کیسے اور کیوں ملی ہیں...... میں ان کو تفصیل سے دیکھ کر ہی آپ کو کچھ بتا سکوں گا۔ جب میں گھر آیا تو فضا گھر میں نہیں تھی۔ دروازہ کھلا تھا گاڑی باہر کھڑی تھی وہ بنا گاڑی کے کہاں جا سکتی ہے گھر میں کوئی چوری بھی نہیں ہوئی سب سامان اپنی جگہ موجود تھا۔''

''ٹھیک ہے ہم کوشش کر رہے ہیں فواد صاحب...... مقامی قصبے میں پوچھ گچھ سے بھی کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے یہ گھر آسیب زدہ ہے یہاں کوئی نہیں رہتا جو رہتا ہے پر اسرار طور پر موت کا شکار ہو جاتا ہے...... خیر!! ہم قانونی کروائی کر رہے ہیں جیسے ہی کوئی پیش رفت ہو گی آپ کو اطلاع کر دی جائے گی آپ بھی ہم سے رابطے میں رہیں۔''

فواد نڈھال سا گھر میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ان خطوط اور تصویروں کا بنڈل تھا جو اس کے گھر سے پولیس نے برآمد کیے تھے۔

اس نے وہ بنڈل بستر پر پٹخ دیا اور اپنے کمرے میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں انسپکٹر کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔

''یہ گھر آسیب زدہ ہے...... جو یہاں رہتا ہے اپنی جان لے لیتا ہے۔'' فواد نے ایک سرسری نگاہ خطوط پر ڈالی اکثر لفافے کئی جگہ سے جلے ہوئے تھے اس نے ایک خط اس بنڈل سے نکالا سفید رنگ کے لفافے پر بیکا ساگر لکھا تھا اس نے خط نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

''میں تم کو کبھی معاف نہیں کروں گی ساگر تم نے مجھے دھوکا دیا دوسری شادی کی میری آنکھوں کے سامنے میری محبت کا قتل کر دیا۔'' باقی خط جلا ہوا تھا۔ اس نے دوسرا خط نکالا۔

''ساگر تم بے شک اپنی دوسری بیوی کے ساتھ خوش رہو پیٹر اور سیلی ابھی بہت چھوٹے ہیں وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتے خدا کے لیے میرے بچے مجھے لوٹا دو۔'' خط کے ساتھ ہی سنہری بالوں والے ایک چھوٹے لڑکے اور لڑکی کی معصوم تصویریں تھیں فواد ان تصویروں کو غور سے دیکھ رہا تھا اچانک ہال کے سامنے والے کمرے میں آگ کا شعلہ لپکا فواد تیزی سے کمرے کی جانب بھاگا۔ کمرے میں رکھی

آرام کرسی تیزی سے حرکت کر رہی تھی اور اس کرسی کے اوپر ایک مضبوط رسی ہوا میں معلق تھی۔ جس پر آگ لگی ہوئی تھی۔ فواد حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اچانک کرسی تھم گئی ایک عورت سفید کپڑوں میں ملبوس کسی ٹرانس میں چلتی ہوئی فواد کے برابر سے گزری اور کرسی پر چڑھ کر جلتی ہوئی رسی کا پھندا اپنی گردن میں ڈال لیا۔ فواد حیرت وخوف سے یہ سارا منظر دیکھ تھا ایسا لگتا تھا کسی نے اس کے قدم جکڑ رکھے ہوں اس عورت نے پاؤں سے کرسی کو دھکا دیا اور رسی پر جھول گئی ساتھ ہی اس کے بھیانک قہقہوں سے گھر گونج اٹھا فواد نے ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور تیزی سے باہر نکل آیا دور تک پھیلے ہوئے درختوں کے جھنڈ اور رات کی تاریکی ماحول کو اور بھی ہیبت ناک بنا رہے تھے فواد نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں قریب ہی اسے تصویر والی بچی درختوں کے جھنڈ میں کھڑی دکھائی دی فواد کے دماغ میں فضا کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''وہ بچے جنگل میں رہتے ہیں۔'' اس کے ماتھے پر پسینے کے بوندیں ابھر آئیں' خوف کی ایک لہر نے اس کے پورے وجود میں سنسنی پھیلا دی کئی سوال اس کے دماغ میں تیزی سے گردش کر رہے تھے اس نے اپنی گاڑی سے ہی چلا کر پوچھا۔

''کون ہو تم؟'' پر وہ بچی کوئی جواب دیے بنا پلٹ کر درختوں میں گم ہو گئی اچانک گاڑی کو بہت سے بچوں نے گھیر لیا وہ سب فواد سے زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے وہ سب بری طرح زخمی تھے فواد نے فوراً گاڑی ہائی وے کی جانب دوڑا دی۔ اس کا رخ قریبی قصبے کی جانب تھا۔

رات گئے دروازے کی دستک سے فضل علی کی آنکھ کھلی۔

''اس وقت کون آ گیا؟'' اس نے آنکھیں ملتے ہوئے بلند آواز سے پوچھا۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں فضل۔ ہائی وے والے لاج کا ملک جس کے گھر تم نے کمرہ ٹھیک کیا تھا۔''

''ارے صاحب آپ......؟'' فضل نے فوراً دروازہ کھول دیا اس وقت خیریت تو ہے اس نے حیرت سے فواد کو دیکھا۔

''فضل میرے اوپر قیامت گزر گئی ہے میری بیوی کل سے لاپتہ ہے گھر میں عجیب وغریب واقعات ہو رہے ہیں میں بہت پریشان ہوں۔''

''آپ آرام سے بیٹھیں۔'' فضل نے اسے قریبی چارپائی پر بیٹھا دیا اور پانی کا گلاس پیش کیا۔

''آپ جس مکان میں رہتے ہیں اس سے بے شمار پراسرار کہانیاں جڑی ہیں وہ تو برسوں سے خالی پڑا تھا وہاں کوئی بھی نہیں رہتا شاید اس گھر میں کوئی بہت بڑا حادثہ ہوا تھا۔ کوئی قتل یا بہت سے قتل ہوئے تھے اس گھر میں رہنے والا کوئی ساگر نام کا ہندو تھا اس نے اپنی برادری سے چوری چھپے ایک انگریز عورت جس کا نام بیکا تھا سے شادی کر رکھی تھی اس کے دو بچے بھی تھے۔ جب اس کی برادری کو پتا چلا تو انہوں نے ساگر کا دوسرا بیاہ اپنی برادری میں کروا دیا۔ پر پتہ نہیں پھر کیا ہوا اس گھر کو کسی نے آگ لگا دی اور بچے زندہ جل گئے۔ وہ انگریز عورت جنگل کی جانب بھاگ گئی بعد میں اس ہی گھر میں سنا تھا اس نے خود کو پھانسی لگائی تھی۔ جس کمرے میں اس نے خود کو پھانسی دی وہ کمرہ آسیب زدہ ہو گیا تھا ہمارے قصبے کے مولوی صاحب نے اسے ایک خاص چابی سے بند کر دیا تھا جو ہمارے قصبے میں تیسری چابی کے نام سے مشہور ہے۔''

''مجھے وہ دروازہ دوبارہ بند کرنا ہے میں نہیں

جانتا وہ بدروح مجھ سے کیا چاہتی ہے میں قصبے کے مولوی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" فواد نے فضل علی کی بات سن کر پریشانی سے کہا۔

"ہم ضرور ملیں گے صاحب پر صبح کا انتظار کرنا ہوگا کچھ دیر میں فجر ہو جائے گی میں آپ کو مسجد لے چلوں گا ابھی آپ آرام کریں۔" فضل علی ساتھ والی چار پائی پر لیٹ گیا پر فواد کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان نہ تھا رات کے حادثے نے اسے یقین دلا دیا تھا فضا کسی حادثے کا شکار ہو چکی ہے۔

فضا کی یاد آتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

مولوی باقر نماز سے فارغ ہو کر خود ہی فواد کی جانب چلے آئے اور آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔

"آپ اجنبی ہیں مسجد میں پہلی بار دیکھا ہے آپ کو۔" انہوں نے فواد سے پوچھا۔

"جی ہاں مسافر ہوں راستہ بھٹک گیا ہوں آپ کی رہنمائی چاہیے۔"

"میں سمجھا نہیں......؟" مولوی باقر نے سوالیہ نظروں سے فواد کو دیکھا۔

"میں سمجھاتا ہوں۔" ساتھ بیٹھے فضل علی نے پوری داستان مولوی صاحب کے گوش گزار کر دی۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"یہ قصہ تو بہت پرانا ہے حضرت ہم تو یہ قصہ ہمارے دادا پردادا کے زمانے سے سنتے آرہے ہیں گھر کو آگ لگ جانے کے کچھ عرصے بعد اس ہندو ساگر کی بھی پراسرار طور پر موت واقع ہو گئی تھی جبکہ اس کی ہندو بیوی نے جنگل کے کنویں میں کود کر جان دے دی تھی۔ اس کے بعد اس گھر میں کوئی نہیں بسا جو بھی رہنے آیا کسی نہ کسی طرح موت کا شکار ہوا پھر بڑے مولوی صاحب نے تیسری چابی سے موت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تھا اور وہ چابی پھر کسی کے ہاتھ نہ لگے اس غرض سے اسے جنگل ہی کے کنویں میں پھینک دیا تھا۔"

"اس چابی کے بنا موت کے اس کمرے کا دروازہ نہیں کھل سکتا تھا پر......آپ نے وہ دروازہ کیسے کھول لیا؟" مولوی باقر نے فواد سے استفسار کیا۔

"میں نہیں جانتا مولوی صاحب وہ زنگ آلودہ چابی میرے پاس کیسے آ گئی۔" فواد رو پڑا۔

"میری بیوی......دو دن سے لاپتا ہے اور میں یہاں بے بسی سے بیٹھا ہوں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"آپ فکر نہ کریں ہم آپ کی پوری مدد کریں گے۔" اچانک فواد کے موبائل پر انسپکٹر کا نمبر چمکا۔ فواد نے فوراً کال ریسیو کی۔

"ہیلو......" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مسٹر فواد آپ کہاں ہیں؟" انسپکٹر کی گمبھیر آواز فون کے دوسری جانب سے سنائی دی۔

"ہمیں آپ کی وائف کا پتا چل گیا ہے آپ جلدی سے جنگل کے قبرستان آجائیں۔"

"قبرستان؟" فواد زیر لب بڑبڑایا۔

"جی ہاں قبرستان......" انسپکٹر نے بات دہرا کر کال کاٹ دی۔

فواد کا چہرہ زرد تھا مولوی باقر نے پوچھا۔

"خیریت ہے حضرت؟"

"مجھے معلوم نہیں مولوی صاحب مگر مجھے جانا ہوگا میری بیوی کا پتا چل گیا ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" فضل علی نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"ہو سکتا ہے آپ کو کسی شے کی ضرورت ہو۔؟"

"تمہاری مہربانی۔" فواد کی آنکھوں میں تشکر تھا وہ دونوں مولوی باقر سے رخصت ہو کر قبرستان پہنچے جہاں انسپکٹر ان کا منتظر تھا۔

"آیئے فواد صاحب......" انسپکٹر اسے جنگل

کے قبرستان تک لے آیا جہاں سفید چادر سے ڈھکا ایک جسم بے حس و حرکت پڑا تھا فواد نے سوالیہ نظروں سے انسپکٹر کو دیکھا۔

"فواد صاحب سراغ رساں کتوں کی مدد سے یہ لاش ہم نے قریبی کنویں سے نکالی ہے۔آپ چہرہ دیکھ کر شناخت کر لیجیے یہ آپ کی وائف ہیں؟"

فواد انسپکٹر کو دیکھ کر غصے سے بولا۔

"یہ کیا بیہودہ مذاق ہے میری فضا کنویں میں کیوں کودے گی۔"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔آپ شہر کی جانی مانی شخصیت ہیں۔آپ جانتے ہیں میڈیا کیسے کیسے سوال کرے گا ہم نے تو اپنا کام کیا ہے آپ اپنا کام کریں لاش کی شناخت کریں۔" انسپکٹر رکھائی سے بولا۔

فواد نے ڈرتے ڈرتے سفید کپڑا لاش سے سرکایا۔

اور ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔وہ فضا تھی۔

"نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا فضا نہیں مر سکتی...... کس نے مارا اسے کیوں اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔" فواد پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا۔

فضل علی بھی قریب کھڑا دکھ سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

"فواد صاحب......!" انسپکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"یہ پہلی لاش نہیں ہے جو اس کنویں سے نکالی گئی ہو...... دراصل جس گھر میں آپ رہتے ہیں اس گھر کے رہنے والے پچھلے وقتوں میں پراسرار طور پر اس ہی کنویں میں کود کر خودکشی کرتے رہے ہیں۔ان کی لاشیں یہاں سے برآمد ہوتی رہی ہیں جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔یہ ان ہی لوگوں کی قبریں ہیں جن کو کنوئیں سے نکال کر یہاں دفنایا گیا۔"

"مگر کیوں؟ آپ نے کبھی پتا لگانے کی کوشش نہیں کی یہ سب کون کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے؟" فواد نے نم آنکھوں سے انسپکٹر کو دیکھا۔

"فواد صاحب یہ قدرت کا عجائب خانہ ہے یہاں کچھ چیزیں مافوق الفہم ہوتی ہیں عقل و انسانی قانون سے بالاتر...... ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا یہ انسانی کام نہیں ہے۔"

"انسانی کام نہیں؟ تو پھر کس کا کام ہے؟ یہ کیا بکواس ہے۔" فواد نے اپنا سر تھام لیا۔

"اس کا کوئی تو حل ہوگا۔"

"اس موت کو روکنے کا واحد حل آپ کے پاس موجود وہ تیسری چابی ہے۔" فضل علی بولا۔

"آپ اس چابی سے موت کا دروازہ دوبارہ بند کر سکتے ہیں پر وہ چابی اب میرے پاس نہیں ہے جس طرح اچانک وہ میرے پاس آئی تھی اس ہی طرح پراسرار طور پر غائب ہو چکی ہے۔" فواد بے بسی سے بولا۔

فضا کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی گئی ضروری کارروائی کے بعد فواد فضل علی کے ساتھ رات گئے گھر میں داخل ہوا اس کی حالت ابتر تھی وہ غم سے نڈھال تھا۔

"صاحب آپ آرام کریں...... کافی رات ہو چکی ہے میں باہر ہی ہوں کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے لیجیے گا۔" فضل علی کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔فواد کے بستر پر اب بھی ادھ جلے خطوط اور تصویریں بکھری ہوئی تھیں اس نے تجسس سے ایک خط اٹھا لیا۔

"ساگر تم نے آج بھی مجھے میرے بچوں سے ملنے نہیں دیا تم اتنے سنگدل کیسے ہو سکتے ہو تم نے پیٹر کی سالگرہ پر میرے خط میرے تحفے تک اسے نہیں دیئے تم نے ایک ماں سے اس کے بچے جدا کیے ہیں تم کو خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔" یہ خط بھی بیکا

ساگر نے لکھا تھا۔فواد نے آخری خط اٹھایا۔
''تم نے میرے بچے زندہ جلا دیے ساگر میرے بچے مدد کے لیے پکارتے رہے ان کے معصوم ہاتھ کھڑکیاں بجاتے رہے کسی نے ان کی مدد نہ کی تم اور تمہاری بیوی تماشا دیکھتے رہے تم نے ان کی لاشیں کنوئیں میں ڈلوا دیں میرے بچے میری واحد خوشی اور زندہ رہنے کی آخری امید تھے میں تم سے اس ظلم کا بدلہ لوں گی ساگر میں تمہیں اس کی سزا ضرور دوں گی۔'' فواد کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''اتنا بڑا ظلم ہوا ہے اس گھر میں۔'' اچانک کمرے کی کھڑکی ایک جھٹکے سے کھل گئی اور لائٹ بند ہوگئی۔

فواد نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی پر کھڑکی سے آتی تیز سرد ہوا کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔

وہ کھڑکی بند کرنے کے لیے بستر سے اٹھ گیا۔ کھڑکی کے باہر درختوں کے جھنڈ میں بہت سے بچے اس کی جانب دیکھ رہے تھے خوف کی ایک لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی وہ تیزی سے کھڑکی سے پیچھے ہٹا اور بستر سے ٹکرا کر گر پڑا کمرے میں اندھیرا تھا پر وہ اپنے ہاتھوں پر مٹی اور کیچڑ محسوس کر سکتا تھا جو کمرے کے فرش پر موجود تھے اس نے پاگلوں کی طرح ہاتھ اپنے کپڑوں سے پونچھے اور کمرے سے باہر کی جانب بھاگا پر کمرے کا دروازہ لاک تھا اس کے کھولنے کی کوشش بے سود ثابت ہوئی اچانک اسے اپنے پیچھے کسی کی دبی دبی ہنسی سنائی دی۔

فواد نے خوفزدہ نظروں سے مڑ کر دیکھا۔ بستر کے نیچے سے کسی نے کیچڑ سے لتھڑا ہوا ہاتھ بستر پر رکھا اور کیچڑ سے لت پت ایک عورت مسکراتی ہوئی فواد کے سامنے بستر پر بیٹھ گئی۔

کھڑکی سے کچھ بچے اندر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔فواد خوفزدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

''کیا ساگر؟'' فواد کے خشک ہونٹ ہلے۔ پر عورت کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔

''تم نے مارا میری بیوی کو؟'' فواد چلایا۔

کمرے میں اب کئی بچے کھڑے اسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

''تم نے مارا ان سب کو؟'' فواد خوف و غصے کی حالت میں زمین پر بے بسی سے بیٹھ گیا۔

''میں نے نہیں مارا۔'' وہ عورت مسکرائی۔

''اس نے مارا۔''

''کس نے ......؟'' فواد نے نم آنکھوں سے پوچھا۔

''جو کبھی نہیں مرتی جس نے ان کو چن لیا تھا جس نے تم کو چن لیا ہے۔'' فواد نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''کیا مطلب؟'' عورت کی ہنسی غائب ہوگئی۔

''موت ہمیں خود چنتی ہے......ہم موت کو نہیں چنتے۔''

خاموش بچوں نے فواد کی جانب بڑھنا شروع کیا۔فواد کی چیخیں اس کے حلق میں دم توڑ گئیں۔صبح لاج سے فضل اور فواد کی لاشیں پولیس نے برآمد کر لی تھیں پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق دونوں کی موت حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث ہوئی تھی۔

لاج کو سیل کر دیا گیا پر موت کا دروازہ آج بھی کھلا ہے تیسری چابی کی تلاش جاری ہے مولوی باقر کا کہنا ہے وہ چابی آج بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔

''کہیں وہ زنگ آلود تیسری چابی آپ کے گھر کی چابیوں میں تو شامل نہیں؟''

☆☆......☆☆

گوجرانوالہ سے ارسال کردہ ایسی تحریر جو آپ کو ہیجان میں مبتلا کر سکتی ہے

نیل گری

اس نے بھی لڑکی پر گندہ عمل کیا تھا......مگر بھائی

نے بہن کو بچالیا اور یہ راز راز ہی رہا......

افتخار چوہدری

گھرے سرمئی بادلوں سے گرتی ہوئی سفید برف نے فضا میں ایک سحر انگیز منظر تخلیق کیا ہوا تھا، اور یہ منظر پچھلے کئی دنوں سے یکسانیت کا شکار تھا جس کی وجہ سے حد نگاہ تک پھیلی ہوئی برف کی سفید چادر کئی فٹ موٹی تہہ کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

مگر ابھی تک گالوں کی شکل میں گرتی ہوئی برف رکنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

درختوں کی شاخیں تک برف کے بوجھ سے دوہری ہو چکی تھیں، جبکہ اطراف میں موجود ہر منظر دودھ میں نہایا ہوا لگ رہا تھا، پہاڑوں پر موجود پگڈنڈیوں سے مشابہہ رستے جو گرمیوں میں حقیقی وجود رکھتے تھے، اس وقت کسی بے نشان منزل کی طرح برف میں گم ہو چکے تھے۔

ایسے میں صفدر انہی گمشدہ رستوں پر محتاط اندازے اور احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا، اس کا ہر اٹھنے والا قدم گھٹنوں تک نرم برف میں دھنس رہا تھا، جس کی وجہ سے اس کے چلنے کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔

سردی سے بچنے کے لیے اس کے جسم پر آدھے درجن سے زائد گرم ترین ملبوسات کی تہیں موجود تھیں، اور سر کو گرم ٹوپی سے ڈھانپنے کے بعد ایک اونی مفلر سے پورے چہرے کو کور کیا ہوا تھا اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔۔اتنے حفاظتی اقدامات کے باوجود اسے سردی سے اپنی ہڈیوں میں گودا جمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

گیارہ ہزار فٹ سے زائد بلندی پر ہونے کی وجہ سے آکسیجن کی مقدار انتہائی کم تھی جس کو وجہ سے وہ گہرے سانس لینے پر مجبور تھا، وہ اس وقت سائبیریا کے بعد دنیا کے دوسرے سرد ترین مقام دراس کی حدود میں موجود تھا۔۔وہاں اس وقت درجہ حرارت منفی چالیس سینٹی گریڈ سے بھی نیچے تک گرا ہوا تھا۔

وہاں سے کارگل کی مشہور پہاڑیاں اور خاص طور پر ٹائیگر ہل نامی پہاڑ بالکل متصل علاقہ تھا۔اسی پہاڑ پر پاکستان اور اس کے ازلی دشمن انڈیا

کے درمیان 1999 میں گھمسان کا رن پڑا تھا۔
صفدر اس وقت پہاڑ کے ٹاپ کی طرف جانے والے ایک تنگ سے راستے پر پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا، اس تنگ راستے کے دوسری طرف ہولناک کھائیاں صدیوں سے منہ پھاڑے کسی شکار کے انتظار میں تھی،۔ پوری احتیاط سے چلنے کے باوجود اچانک اس کے پاؤں کے نیچے سے برف کسی شیشے کی طرح تڑخی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ خود کو سنبھالتا اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ راستے کے دوسری طرف گہری کھائی میں گرتا چلا گیا۔
رستے کے کنارے پر شیڈ کی صورت آگے کو بڑھی ہوئی برف پر پاؤں رکھتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ برف کے نیچے ٹھوس سطح کی بجائے خلا ہے۔
اندازے کی اس ایک غلطی نے اسے آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔
برفیلی ڈھلانی سطح پر لڑھکتا ہوا ہو جب وہ رکا تو اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے گردش کر رہے تھے، اسے نارمل ہونے میں چند منٹ لگ گئے۔
حواس پوری طرح بحال ہونے پر اس نے اطراف کا جائزہ لیا تو خود کو ایک پیالہ نما کھائی میں پایا جس کی گہرائی بیس فٹ سے زائد رہی ہوگی، اس نے واپس اوپر چڑھنے کی کوشش کی تو اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ برف گرنے سے ڈھلانی نظر



آنے والی کھائی کی دیوار اصل میں عمودی ہے۔

اس خوفناک حقیقت کے آشکار ہونے پر اس کا دل لرزنے لگا، وہ بار بار اوپر چڑھنے کی کوشش میں پھسل کر واپس گر رہا تھا، کچھ ہی دیر میں اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تو نڈھال سا ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا، جس جگہ وہ بیٹھا تھا اسے لگا جیسے اس کا پاؤں کسی نرم اور پلپلی چیز کے اوپر رکھا گیا ہو۔

اس نے کریدنے کے انداز میں وہاں سے برف ہٹائی تو اسے لگا جیسے وہاں کوئی انسانی جسم دبا ہوا ہو۔ اس خیال سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے جبکہ برف ہٹانے کی رفتار دوگنی ہو گی۔

کچھ ہی دیر میں اس نے ایک پندرہ، سولہ سالہ لڑکی کی لاش دریافت کر لی، وہ پری چہرہ نقوش والی لڑکی سوئی ہوئی لگ رہی تھی اس کے چہرے پر موت کی تلخی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

لباس اور حلیے سے اس کا تعلق وہیں کے کسی قبیلے سے لگ رہا تھا۔ نجانے کس بدنصیب کی بچی ہے اس نے دکھی دل سے سوچا اور بے بسی سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

اسے خود پر اس چوہے کا گمان گزر رہا تھا جسے پنجرے میں سے باہر نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی ہو۔

ابھی دن میں ہی بادلوں نے اندھیرا پھیلا رکھا ہے، کچھ دیر بعد جب رات کے اندھیرے نے اپنے سیاہ پَر پھیلا کر ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لینا ہے تب تو یہاں سے نکلنا ناممکن ہو جائے گا، اور پھر صبح تک تو اس بے رحم موسم نے میری قلفی جما کر مجھے بھی اس لڑکی کے ساتھ ہی برف میں دفن کر دینا ہے۔ صفدر کے ذہن میں اس بار منفی سوچ ابھری۔

نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا، اس کے دل نے ذہن میں ابھرنے والی سوچ کی پُرزور تردید کی۔ اور وہ ایک بار پھر ہمت کر کے نئے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس بار اس نے سمت بدل کر جنونی انداز میں ہاتھ چلائے تو اچانک برف میں دبی ہوئی جھاڑی کی لمبی شاخ اس کے ہاتھ میں آ گئی، جس کے سہارے وہ باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ تشکر بھرے جذبات کے ساتھ ساتھ یقینی موت کو پچھاڑنے کا جوش بھی اس کے چہرے سے عیاں ہو رہا تھا۔

اس نے مڑ کر کھائی میں جھانکا تو حسرت و یاسیت کی تصویر بنی لڑکی کی لاش پر برف روئی کے گالوں کی طرح گر رہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر سفر شروع کیا، گو کے اس کا اٹھنے والا ہر قدم گھٹنوں تک برف میں دھنس رہا تھا مگر اسے یقین تھا کے دن ڈھلنے سے پہلے وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے گا۔

☆......☆......☆

گہرے سرمئی رنگ کے چوہے نے ایک بار پھر آٹے والی ڈرم کے پیچھے سے سر نکال کر اپنی گول مٹول آنکھوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہ کافی دیر سے وہاں چھپا ہوا تھا اور اب وہاں سے نکل کر واپس اپنے بل کی طرف جانے سے ہچکچا رہا تھا۔

وہ کئی بار ہمت کر کے باہر نکلا بھی تھا مگر ہر بار چند قدم آگے بڑھنے کے بعد ہی اس کی ہمت جواب دے جاتی تھی اور وہ کسی شکست خوردہ فوجی کی طرح پسپا ہوتا ہوا واپس ڈرم کے پیچھے جا چھپتا تھا۔

اب بھی وہ اسی کشمکش میں تھا کہ واپس اپنے بل کی طرف چلا جائے یا مزید کچھ دیر یہیں چھپ کر اپنی جان کی حفاظت کرے، اس کی چھٹی حس اسے قرب و جوار میں موجود کسی بڑے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔

بالآخر اس بار اطراف کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اپنی ہمت مجتمع کی اور ڈرم کے پیچھے سے نکل آیا اور پوری رفتار سے دوسری دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی پیٹی کی طرف دوڑا، پیٹی کے نیچے اس کا بل تھا جس تک پہنچنے کے لیے وہ اتاولا ہوا جا رہا تھا۔

ابھی وہ اپنی منزل سے چند فٹ دور تھا جب دروازے کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھی ہوئی مانو ایک ہی جست میں اس کے اوپر آن گری۔ گھر کی پلی ہوئی مانو کے ایک ہی جاندار پنجے نے اس کی روح کو اس فانی دنیا سے عالم پائیدار میں منتقل کر دیا۔

اب مانو کے منہ میں روح سے عاری محض گوشت کا ایک لوتھڑا باقی رہ گیا تھا، جسے لیے ہوئے وہ پیٹی کے نیچے گھس گئی اور پھر اس کے مضبوط جبڑوں کے نیچے آ کر چوہے کی ہڈیاں ٹوٹنے کی کریہہ آوازیں ابھرنے لگیں۔

☆......☆......☆

بھائی امی کہہ رہی ہیں کہ اٹھ جائیں ورنہ کالج سے دیر ہو جائے گی۔ نوشی نے صفدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ کسلمندی سے چار پائی پر لیٹا ہوا بلی اور چوہے کے درمیان ہونے والی کشمکش میں حالات کو طاقتور کے حق میں پلٹا کھاتے ہوئے دیکھ کر اس قدر گہری سوچ میں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اسے نوشی کے کمرے میں داخل ہونے کا علم ہی نہیں ہوا تھا، کیا امی کے نام کی دھمکی دینا ضروری ہے یہ بات تم خود بھی تو مجھے کہہ سکتی ہو میں تمھیں منہ میں نہیں ڈال لوں گا۔ صفدر نے بیزاری سے جواب دیا تو ہمیشہ سے ڈری سہمی رہنے والی نوشی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا، جیسے بھائی نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا ہو۔

وہ جس طرح آئی تھی ویسے ہی بے آواز قدموں سے لوٹ گئی۔

صفدر ایک بھرپور انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دیر آئینے میں خود کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد باتھ روم میں گھس گیا، جب وہ باتھ روم سے باہر نکلا۔

تب تک نوشی اس کے لیے ناشتہ لا کر چار پائی پر رکھ چکی تھی۔

یہ کیا ابھی تو پراٹھے اور آملیٹ بننے کی خوشبو آ رہی تھی، میرے لیے بھی وہی لاؤ، اس نے چنگیر میں موجود روکھی روٹی اور کٹوری میں رات کی بچی ہوئی دال دیکھ کر منہ بناتے ہوئے کہا۔

دیور جی پراٹھے کھانے کا شوق ہے تو کسی کام دھندے سے لگو، پہلے ہی مفت کی توڑتے ہوئے نہ آنکھ شرماتی ہے اور نہ ہاتھ رکتا ہے، اور رہی سہی کسر یہ فرمائشی پروگرام شروع کر کے نکالنا چاہتے ہو۔

اس سے پہلے کہ نوشی کوئی جواب دیتی، ان کی بھابھی عظمیٰ نے دروازے میں نمودار ہو کر کینہ توز نظروں سے دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ شاید وہ کہیں قریب ہی موجود تھی اور یقیناً ان کی باتیں بھی سن رہی تھی۔

بھابھی گھر چلانے کے لیے آپ کے والد محترم خرچہ دے کر نہیں جاتے جو آپ ہمیں مفت

ی توڑنے کا طعنہ دے رہی ہیں، بھائی اکرم اس گھر کا بڑا بیٹا ہے، ماں باپ کا بھی اس پہ کوئی حق ہے کہ نہیں، اور آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کیا ابو کی ریٹائرمنٹ اور گریجویٹی کی تمام رقم بھائی کی نوکری حاصل کرنے کے لیے بطور رشوت دی گئی تھی۔

کیا آپ میں اتنا سا بھی ظرف نہیں ہے کہ میری گریجویشن مکمل ہونے میں چند ماہ رہ گئے ہیں اور یہ چند ماہ صبر کرلیں۔ اس کے بعد میں خود امی ابو اور بہن کی ذمہ داری سنبھال لوں گا۔ صفدر بھی کہاں چپ رہنے والا تھا اس نے بھی ترنت زہر خندہ لہجے میں جواب دیا۔

جھگڑے کی فضا دیکھ کر نوشی تھر تھر کانپنے لگی تھی، اسے بھائی اور بھابھی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ بات لڑائی کی طرف جارہی ہے اور وہ ہمیشہ کی ڈرپوک ایسی صورت حال سے کوسوں دور بھاگتی تھی۔

میرے والد کا اس بات سے کیا تعلق ہے، کیا یہیں تعلیم حاصل کررہے ہو کہ بزرگوں کی عزتیں کیسے اچھالی جاتی ہیں، اب اگر تم نے اپنے گندے منہ سے میرے ابو کا نام لیا تو میں تمھارا منہ نوچ لوں گی۔

گھٹیا نسل کے انسان، عظمیٰ نے آگے بڑھ کر صفدر کا گریبان پکڑ لیا اور ہذیانی انداز میں چیخنے لگی، اس کی آواز اتنی بلند ہوگئی تھی کہ آس پاس کے پڑوسی بھی متوجہ ہوگئے، بشراں بی بی بیٹے اور بہو کے درمیان آ گئی تا کہ جھگڑے کو بڑھنے سے روک سکے، اس دوران ریٹائرڈ کلرک رحمت علی کھانستا ہوا جبکہ اکرم بھی آنکھیں ملتا ہوا وہاں پہنچ گئے۔

صبح سویرے کیا تماشا لگا رکھا ہے، اکرم نے پھنکارتے ہوئے پوچھا، اس کا رخ صفدر کی طرف ہی تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، رورو کر آسمان سر اٹھاتی ہوئی عظمیٰ نے بات اچک لی۔

اس بھوکے ننگے گھر میں، میں نے اپنی تمام خواہشات کا گلہ گھونٹ دیا، تمھاری کم آمدن کے باوجود صبر شکر سے اس گھر کی تمام ذمہ داریاں نبھا رہی ہوں، کئی دنوں سے میرا دل پراٹھا کھانے کو چاہ رہا تھا آج ہمت کر کے ایک بنا ہی لیا تو وہ بھی ان لوگوں کو برداشت نہیں ہو رہا، یہ سرکاری سانڈ کہتا ہے کہ تمھارے ابا خرچہ دے کر نہیں جاتا جو پراٹھے کھاتی ہو۔ اس نے ہچکیوں کے درمیان بات کو اپنے انداز سے آگے بڑھایا۔

بھائی، یہ جھوٹ بول رہی ہے میں نے تو......

بس اب تمھیں تاویلیں گھڑنے کی ضرورت نہیں ہے، آج کے بعد اگر تم نے بلا وجہ میری بیگم سے الجھنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا اور ویسے بھی چند دنوں کی بات ہے جیسے ہی مجھے سرکاری کوارٹر ملے گا ہم شفٹ ہو جائیں گے، اکرم نے عظمیٰ کے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے وارننگ دی تو اس کی بات سن کر صفدر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا

اس نے ایک بار پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اپنے پیچھے کسی کے گرنے کی آواز سن کر مڑا تو نوشی فرش پر گری کسی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، وہ اس کی طرف دوڑا۔ جبکہ عظمیٰ طنزیہ انداز میں سب پر نظر ڈالتے ہوئے اکرم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

پانی کے چھینٹوں اور آیت کریمہ کے ورد سے

نوشی کی حالت میں کوئی سدھار نظر نہیں آرہا تھا، اس کی گلابی رنگت تیزی سے پیلاہٹ میں بدلتی چلی جارہی تھی۔

بیٹا خدا کے لیے جلدی کچھ کرو میری بیٹی ہاتھوں سے نکلتی جارہی ہے اسے کسی ہسپتال پہنچاؤ۔ بشراں بیگم نے بے بسی سے صفدر کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا، تو صفدر جو بہن کو ہوش میں لانے کے لیے جتن کررہا تھا چونک کر ہاتھ جوڑتی ہوئی ماں کو دیکھنے لگا۔

ہاں ماں اسے ہسپتال لیے چلتے ہیں اس نے ماں کی تائید کی اور رکشہ لینے کے لیے گھر سے باہر کی طرف بھاگا۔

☆......☆......☆

بزرگی کی سرحد میں داخل ہوچکے سفید باریش ڈاکٹر کے چہرے پر سوچوں سے زیادہ تفکر نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اس کے سامنے موجود ٹیبل پر نوشی کی مختلف رپورٹیں پڑیں ہوئیں تھی، جبکہ صفدر اپنے امی ابو سمیت ٹیبل کے دوسری طرف موجود کرسیوں پر براجمان تھا، ان سب کی نظریں ڈاکٹر پر جمی ہوئیں تھیں۔

پلیز ڈاکٹر صاحب کچھ ہمیں بھی بتائیں کے نوشی کو ہوا کیا ہے جو اسے اچانک دورہ پڑ جاتا ہے، صفدر نے گلوگیر لہجے میں التجا کی، دیکھو بیٹا آپ کی بہن کو ان میڈیکل رپوٹوں کے مطابق کسی قسم کی کوئی بیماری نہیں ہے، مگر اس کی حالت بتارہی ہے کہ وہ شدید تکلیف میں ہے، ڈاکٹر نے ایک گہرا سانس لیکر انکشاف کیا۔

اگر کوئی بیماری نہیں ہے تو یہ ہر تھوڑی دیر کے بعد دورہ کیوں پڑ رہا ہے، صفدر نے حیرت سے پوچھا۔

اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے، البتہ میرے علم میں ایک ایسا درویش صفت انسان ہے جو شاید آپ کے اس سوال کا جواب دے سکے۔

میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ ایک نظر مریضہ کو دیکھ لیں، ڈاکٹر نے ٹیبل پر موجود ٹیلی فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

اور پھر ایک نمبر ڈائل کر دیا، دوسری طرف سے کال اٹنڈ ہونے پر وہ کسی چراغ شاہ سے بات کرنے میں مشغول ہوگیا۔

شاہ صاحب آدھے گھنٹے تک آرہے ہیں، ڈاکٹر نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھتے ہوئے امید افزا خبر سنائی۔

پھر واقعی آدھے گھنٹے میں نورانی صورت والے چراغ شاہ صاحب آگئے کچھ دیر بعد وہ سب کی معیت میں مریضہ کے کمرے میں داخل ہوئے۔

جیسے ہی چراغ شاہ صاحب کی نظر بیڈ پر لیٹی ہوئی مریضہ پر پڑی تو ان کے قدم وہیں رک گئے۔ نوشی اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھی اس کے چہرے کا رنگ نیلے کانچ کی طرح نظر آرہا تھا۔

شاہ صاحب چند ثانیے اسے غور سے دیکھتے رہے اور پھر پلٹ کر کمرے سے باہر آگئے۔

شاہ جی کیا ہوا آپ نے بچی کو نزدیک سے کیوں نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر نے تجسس سے پوچھا۔

کیا آپ لوگوں نے اس بچی کے لیے آنے والے کسی رشتے سے انکار کیا ہے۔ شاہ صاحب نے ڈاکٹر کی بات کا جواب دینے کی بجائے رحمت علی سے مخاطب ہوکر پوچھا۔

جی ہماری بہو عظمٰی اپنے نشئی بھائی کے لیے اس کا رشتہ مانگ رہی تھی مگر ہم نے انکار کر دیا۔ رحمت علی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

جواب دیا۔
میرے خیال میں اس بچی کو دواؤں کی بجائے دُعاوں کی زیادہ ضرورت ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسانی فرمائیں، اب سوائے صبر کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، شاہ صاحب نے دھیرے سے کہا۔
پلیز سر آپ کھل کر بتائیں تا کہ ہمارے پلے بھی کچھ پڑ سکے صفدر نے بے چینی سے کہا۔
بیٹا اس بچی پر نیل گری کا عمل کیا گیا ہے ۔دراس کے پہاڑی سلسلے کے سب سے اونچے پہاڑ پر بسنے والے آریائی قبیلے کے لوگ نیل گری دیوی کی پوجا کرتے ہیں اور اس علم کا عامل صرف ان کا مذہبی پروہت ہی ہوتا ہے ہاں اگر وہ اپنے کسی خاص شاگرد کو اجازت دے تو پھر وہ بھی کچھ حد تک اس علم سے لوگوں کو پریشان کرسکتا ہے ۔البتہ شاگرد اگر کسی پر یہ عمل کردے تو پھر اس کا توڑ وہ خود بھی نہیں کرسکتا۔
میں ایک شخص کو جانتا تو ہوں جو اس عمل کو سیکھنے کے لیے دراس جاتا رہا ہے مگر مجھے علم نہیں تھا کہ وہ اس کو سیکھنے میں کامیاب ہو گیا ہے ۔اب یہ کیس سامنے آیا ہے تو مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اس خبیث کے پاس خواتین کا جمگھٹا کیوں لگا رہتا ہے ،۔انہوں نے تفصیل سے بات کرتے ہوئے کہا۔
شاہ صاحب مجھ بد نصیب باپ پر رحم کریں اور کسی طرح میری بیٹی کو ٹھیک کردیں ، رحمت علی نے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے منت کی تو شاہ صاحب نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔
محترم .یہ کیس واقعی میرے بس سے باہر ہے بلکے اب تو یہ اس خبیث عامل کے بس میں بھی نہیں رہا کے اس کا توڑ کر سکے۔
اب سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں ہے ،انہوں نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔
کیا آپ اس شیطان کا نام بتا سکتے ہیں ،صفدر نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔
شاہ صاحب کچھ دیر تک غور سے اس کی طرف دیکھتے رہے اور پھر گویا ہوئے ،۔بیٹے جب اپنے ہی دشمن بنے ہوں تو انسان غیروں سے کہاں تک لڑسکتا ہے ۔اور میرے نام بتانے سے مسلہ حل ہونے کی بجائے مزید خون خرابے کا شکار ہوجائے گا ، ہاں اگر کسی طرح آریائی قبیلے کے پروہت کو راضی کیا جائے اور وہ اس عمل کی کاٹ کرنے پر راضی ہوجائے تو پھر یہ بچی بھی ٹھیک ہوسکتی ہے اور جس کسی نے بھی یہ عمل کروایا ہے وہ خود اس مسلے کا شکار ہو جائے گا ۔مگر آج کل وہاں جانا تقریباً ناممکن ہے کیوں کے دراس کا دنیا کے سرد ترین مقام میں شمار ہوتا ہے ، برف باری کی وجہ سے تمام راستے بند ہیں جو اگلے کئی ماہ تک برف میں دبے رہیں گے اس وقت تو وہاں جانے کے بارے میں سوچنا بھی خود کشی کے مترادف ہے ،۔انہوں نے جواب دیا تو ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ واقعی یہ ایک ناممکن کام ہے۔
چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے میں اپنی بہن کو بچانے کے لیے دراس ضرور جاؤں گا صفدر نے حتمی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
جذباتی پن میں سوائے نقصان اٹھانے کے تمھیں اور کچھ حاصل نہیں ہوگا ،۔آگے تمھاری مرضی ۔شاہ صاحب نے واپسی کے لیے اٹھتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر انہیں باہر تک چھوڑنے کے لیے ساتھ ہولیا۔
☆......☆......☆
دراس کے سب سے اونچے اور یخ بستہ پہاڑ

پر موجود آریائی قبیلے کا مذہبی معبد کافی بڑی غار نما کھوہ میں بنا ہوا تھا جس کا اختتام ایک ہال جیسے کمرے میں ہو رہا تھا، غار کے دھانے پر لکڑی کے جنگلے سے بنا دروازہ لگا ہوا تھا جس میں بڑی بڑی درزیں موجود تھیں ان درزوں سے سرد ہوا کو اندر آنے سے روکنے کے لیے دروازے پر کسی جانور کی بدبودار کھال لٹکائی گئی تھی۔ غار کے اندر ایک طرف لکڑیوں کی انگیٹھی جل رہی تھی جس سے اندر کا ماحول گرمائش لیے ہوئے تھا جبکہ دیواروں پر جلتی ہوئی مشعلوں کی پُراسرار زرد روشنی نے ماحول میں دہشت سی پھیلا رکھی تھی۔ ہال نما کمرے کے وسط میں نیل گری دیوی کا مجسمہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ایستادہ تھا اس کو تراشنے والے کاریگر نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا تھا، مجسمے کو پہلی نظر دیکھنے پر ایسا احساس ہوتا تھا جیسے اسے نیلے کانچ سے تراشا گیا ہو۔

آلتی پالتی مارے ہوئے پتلے پتلے نقش والی حسینہ کا مجسمہ یوگا کے پدم اسٹائس کا آسن جمائے مراقبے کی حالت میں تھا، فراخ پیشانی، چھوٹی سی ستواں ناک اور صراحی جیسی لمبی گردن کے ساتھ بالکل سیدھی کمر اس انمول شہکار کے رعب میں اضافہ کر رہی تھی، جبکہ بڑی بڑی بند آنکھیں دیکھ کر گمان گزرتا تھا جیسے ابھی آنکھوں کے جھروکے کھول کر اٹھ کھڑی ہو گی۔

اس وقت مجسمے کے سامنے سارے گاؤں والے سجدہ ریز تھے، مذہبی پروہت ان سب سے آگے دیوی کے عین قدموں میں سجدے کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہا تھا، وہ سب پچھلے ایک گھنٹے سے اسی حالت میں تھے، مزید کچھ دیر بعد پروہت گرجدار آواز میں جے نیل گری کا نعرہ لگاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا سب نے اس کی تقلید کی۔

بوڑھے پروہت کے چہرے پر سلوٹوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور گلے میں سچے موتیوں کی مالا اسے دوسروں سے ممتاز کر رہی تھی۔

اے مہان یوگی، میری بیٹی آرسی کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کہ نہیں۔ گاؤں کے ادھیڑ عمر مکھیا نے رکوع کے بل جھک کر اسے تعظیم دیتے ہوئے پوچھا، اس کا چہرہ حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔

تین دن پہلے ان کے مخالف قبیلے کے دو نوجوان آرسی کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے تو وہ ان کے چنگل سے نکل بھاگی تھی، مگر ابھی تک نہ تو وہ واپس قبیلے میں پہنچی تھی اور نہ ہی اس کا کہیں کوئی سراغ مل رہا تھا، جبکہ اغوا کار قبیلے کے محافظوں سے تصادم میں مارے گئے تھے۔

جپالا، دیوی نیل گری ہم سے سخت ناراض ہے جس کی وجہ سے میرا علم کام نہیں کر رہا۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ کسی آریائی مخالف شخص کی بھینٹ دے کر دیوی کو راضی کرنے کی کوشش کی جائے، شاید اس طرح وہ راضی ہو کر میری طاقت لوٹا دے تو میں آرسی بیٹی کے بارے میں کچھ معلوم کر سکوں۔

پروہت نے مکھیا کو اس کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا تو اس کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

اس سے پہلے کہ جپالا کچھ کہتا غار کے دھانے پر شور سا اٹھا تو سب چونک کر اس طرف متوجہ ہو گئے، اگلے ہی لمحے لکڑی کا دروازہ چرچرا کر کھلا اور قبیلے کے محافظوں کا جتھا اندر داخل ہوا انہوں نے ایک شہری نوجوان کی مشقیں کس کر اسے ڈنڈا ڈولی کے انداز میں اٹھایا ہوا تھا۔ نوجوان بری

طرح کسمسا رہا تھا۔
محافظوں نے اسے لا کر کھیا کے سامنے پٹخا تو تکلیف سے اس کی چیخیں نکل گئیں،۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی تکلیف پر قابو پا کر وحشت بھری نظروں سے اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا۔، پھر جوں ہی اس کی بھٹکتی ہوئی نظریں نیل گری کے مجسمے پر پڑی تو وہ آنکھیں جھپکانا بھول گیا حیرت اور خوف سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔
سردار، ہم نے اس مشکوک نوجوان کو قبیلے کی جاسوسی کرتے ہوئے پکڑا ہے مجھے لگتا ہے جغنائی والوں نے اسے بھیجا ہو گا، ایک لمبے تڑنگے نوجوان نے تفصیل بتائی۔
جپالا نے زبان سے کچھ کہے بغیر سر کو اثبات میں ہلایا اور آگے بڑھ کر نوجوان کے پاس بیٹھ گیا ،کیا نام ہے تمھارا اور کیوں جاسوسی کر رہے تھے، کیا جغنائی قبیلے والے اب اتنی گھٹیا حرکتوں پر اتر آئے ہیں کہ پہلے میری بیٹی کو اغوا کرنے کی کوشش کی، اور اب جاسوسی، آخر چاہتے کیا ہو، اس نے غراتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔
جناب میرا نام صفدر ہے آپ لوگوں کو میرے بارے میں شدید غلط فہمی ہوئی ہے میں نہیں جانتا یہ جغنائی قبیلے والے کون ہیں اور آپ کی بیٹی کو کس نے اغوا کیا ہے۔ میں تو خود اپنی بہن کی زندگی کی بھیک مانگنے حاضر ہوا ہوں۔
صفدر نے جاسوسی کے الزام کی تردید کرتے ہوئے اپنا تعارف کروادیا اور پھر نان اسٹاپ یہاں تک پہنچنے کی روداد بھی سنا دی۔ یہ تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اپنے چیلے کے تحمل کی کاٹ کردوں گا، تم یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ تم جغنائی قبیلے کے جاسوس ہو، اب ہم تمھاری بھینٹ نیل گری کو دیں گے تاکہ اسے خوش کر سکیں ،اور آرسی بھی واپس آسکے پروہت نے غصیلے لہجے میں جواب دیا اور محافظوں کو قربانی کرنے کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔
مذہبی پروہت کا فیصلہ سن کر وہاں پر موجود لوگوں میں ہیجان اور جوش برپا ہو گیا جس کا اظہار میں وہ اچھل کود کرنے لگے۔
غار جے نیل گری کے نعروں سے گونجنے لگا، ان سب کے برعکس کھیا کے چہرے پر تفکر کے آثار گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے،وہ شاید اس طرح ایک بے بس اور بے گناہ انسان کو مارنے کے حق میں نہیں تھا، مگر پروہت کے حتمی فیصلے کی وجہ سے وہ چپ کر گیا تھا۔
صفدر خود کی قربانی کا سن کر بوکھلاہٹ اور بدحواسی کا شکار ہو گیا۔ میں بے ضرر انسان ہوں آپ لوگ کیوں میری جان کے دشمن بنے ہیں ،میں تو اپنی مظلوم بہن کی شفایابی کے لیے آپ کے پاس بہت امید لے کر آیا تھا، مگر مجھے علم نہیں تھا کہ اس قبیلے میں مہمانوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے، آپ بھی تو کسی بیٹی کے باپ ہیں آپ کو تو میرے جذبات سمجھنا چاہیے، اس نے گھگھیاتے ہوئے التجا کی تو جپالا کے چہرے پر تذبذب کی کیفیت ابھر آئی۔
اس دوران محافظ صفدر کو اٹھا کر مجسمے کے قدموں میں لے آئے تھے اور جلاد نما شخص تلوار لیے اس کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔
موت کو سامنے دیکھ کر صفدر کے حواس اس کا ساتھ چھوڑتے چلے جا رہے تھے، اس نے بے بسی سے اردگرد نظریں دوڑائیں تو ایک عورت کو دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا، اسے لگا جیسے وہ اس کو پہلے کہیں دیکھ چکا ہے، اس نے دماغ پر دباؤ ڈالا تو اس کے ذہن کی اسکرین پر برف میں دبی ہوئی لاش کی

شبیہ ابھر آئی جو ہو بہو اس عورت کی کاپی تھی بس عمر کا فرق تھا۔

کیا یہ عورت تمہاری بیوی ہے اور تمہاری بیٹی کی شکل اپنی ماں سے ملتی ہے، اس نے ذہن میں در آنے والے ایک خیال کے تحت مبہم امید سے پوچھا۔

اس کی بات سن کر جپالا سمیت وہاں پر موجود تمام لوگ چونک اس کی طرف متوجہ ہو گئے، جپالا نے ایک ہاتھ اٹھا کر جلاد کو رکنے کا اشارہ کیا، جس نے وار کرنے کے لیے تلوار کو سر سے بلند کر لیا تھا، تمہیں کیسے معلوم ہوا کے یہ میری بیوی ہے اور آرسی کی شکل اپنی ماں سے ملتی ہے، اس نے حقیقی حیرت سے پوچھا۔

میں بھی تھوڑا بہت علم جانتا ہوں اگر تم مجھ سے ایک ڈیل کر لو تو میں اپنے علم کے بل پر تمہاری بیٹی کو ڈھونڈنے میں مدد کر سکتا ہوں، صفدر نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دیتے ہوئے کہا۔

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس نے سیدھے سبھاؤ انہیں بتا دیا کہ اس نے راستے میں حادثاتی طور پر آرسی کی لاش دیکھی ہے تو ہو سکتا تھا جپالا اس پر اعتبار کرنے کی بجائے مخالف قبیلے کا جاسوس ڈکلیئر کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

میں اپنے چیلے کے کیے ہوئے عمل کی کاٹ ہرگز نہیں کر سکتا، اس سے پہلے کے جپالا جواب دیتا، پروہت نے اپنی سرخ آنکھیں نکالتے ہوئے غصے سے کہا، اسے صفدر کی بات سن کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قسم کی ڈیل کرنا چاہتا ہے۔

اے مہان گیانی، میں اور میری بیوی پچھلے تین دن سے اپنی بیٹی کی جدائی میں تڑپ رہے ہیں، میری درخواست ہے کہ آپ اس کی بہن پر کیے ہوئے عمل کو ختم کریں تاکہ یہ آرسی کو ڈھونڈنے میں ہماری مدد کرے، جپالا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے التجا کی تو پروہت کے چہرے پر تذبذب کر آثار ابھر آئے، وہ چند لمحے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر ایک طرف بڑھ گیا جہاں دیوار کے ساتھ لکڑی کا بکس رکھا تھا، اس نے بکس کھول کر اندر سے کچھ نکالا اور واپس مڑ آیا اس کے ایک ہاتھ میں کپڑے سے بنا ہوا پتلا تھا جبکہ دوسرے میں ایک لمبی سوئی تھی، وہ نیل گری کے مجسمے کے سامنے پہنچا اور رکوع کی حالت میں جھک کر کسی اجنبی زبان میں منتر پڑھنے لگا، آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی، اور کانپتے ہوئے جسمانی اعضاء سے لگ رہا تھا جیسے اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو رہی ہے، کچھ دیر بعد اس نے سیدھا ہوتے ہوئے سوئی والا ہاتھ بلند کیا اور ایک جھٹکے سے سوئی کو پتلے کی سر میں گھونپ دیا۔

حیرت انگیز طور پر سفید پتلے کے سر سے خون نکلنے لگا، جس سے وہ چند لمحوں میں ہی سارے کا سارا بھیگ کر سرخ رنگ کا ہو گیا۔

لو، تمہاری بہن ٹھیک ہو چکی ہو گی اور جس نے یہ عمل میرے چیلے سے کروایا تھا وہ خود اسی اذیت میں مبتلا ہو گیا ہو گا، جسے ٹھیک کرنا اب میرے بس میں بھی نہیں ہے، وعدے کے مطابق اب تم اپنے علم کے ذریعے بتاؤ کہ آرسی ہمیں کہاں ملے گی، پروہت نے خون آلود پتلے کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

اس دوران جپالا صفدر کی مشکیں کھول چکا تھا۔

تم لوگوں نے مجھ پر احسان کیا ہے، اب

میں تمہاری مدد ضرور کروں گا ،صفدر نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ مراقبے میں جا رہا ہو۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ جپالا کو کیسے بتائے کہ اس کی بیٹی اب زندہ نہیں ہے ،اسے اندیشہ تھا کہ آرسی کے مرنے کی خبر سن کر کہیں قبیلے والے ہتھے سے ہی نہ اکھڑ جائیں، وہ کافی دیر تک آنکھیں بند کیے سوچتا رہا مگر اسے کوئی ترکیب سجھائی نہ دی ، آخر کب تک مراقبے کا ناٹک کرتا اسے آنکھیں کھولنی ہی پڑیں۔ کچھ پتہ چلا میری بیٹی کا، جپالا نے بے صبری سے پوچھا۔

صفدر نے آہستگی سے کھانس کر گلہ صاف کیا اور پھر محتاط الفاظ میں گویا ہوا۔

میرے علم کے مطابق آرسی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

اس کی بات پوری ہوتے ہی جپالا کی بیوی دھاڑیں مار کر پچھاڑیں کھانے لگی تو وہاں پر موجود خواتین اسے سنبھالنے لگیں۔ یہ تو ہمیں بھی اندازہ ہے کہ کوئی اتنے شدید موسم میں باہر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیا اس کی لاش مل سکتی ہے تاکہ اس کی آخری رسومات ادا کر کے ہمیں کچھ سکون مل سکے۔

جپالا نے گلوگیر لہجے میں پوچھا تو صفدر ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا اس کے اندیشے غلط ثابت ہو گئے تھے، قبیلے والوں نے آرسی کی موت کا سن کر اسے کوئی گزند پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میرے ساتھ چلو مجھے امید ہے کہ میں تم لوگوں کو اس تک لے جاؤں گا ،صفدر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس بات کی کیا گارنٹی ہے تم ہمیں لاش تک لے جانے کی بجائے دھوکا دے کر فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گے، پروہت نے سوالیہ انداز میں پوچھا، اس کا شکی لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ ابھی تک صفدر کو ناقابلِ اعتبار سمجھ رہا ہے۔

میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اتنے مسلح محافظوں کے ہوتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش میں موت کو گلے لگا لوں ،صفدر نے اعتماد بھرے لہجے میں جواب دیا اور غار کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا، جبکہ جپالا سمیت قبیلے کے تمام مرد اس کے پیچھے تھے۔

☆......☆......☆

صفدر لمبے سفر سے واپسی پر تھکے ہوئے قدموں سے اپنی گلی میں داخل ہوا تو چونک گیا، گھر کے سامنے لوگوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا جبکہ ایک ایمبولینس بھی کھڑی تھی ، وہ وسوسوں میں گھرا ہوا تیزی سے آگے بڑھا تو اسی لمحے گھر کے اندر سے عظمیٰ کو سٹریچر پر باندھ کر باہر لایا جا رہا تھا، جبکہ اکرم شدید پریشانی کے عالم میں اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عظمیٰ جنونی انداز میں چیخیں مار رہی تھی ایسے لگ رہا تھا جیسے اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ رہا ہو، ایمبولینس چند لمحوں ہی اسے لے کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔

صفدر سمجھ گیا کہ دوسروں کو برباد کرنے والے خود مکافاتِ عمل کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس کی نظر دروازے میں پریشان کھڑے امی ابو پر سے ہوتی ہوئی ان کے پیچھے موجود اپنی معصوم بہن نوشی پر پڑی تو اس کے چہرے پر زندگی کی رونق دیکھ کر اسے اپنے دل میں سکون کی لہر پھوٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

☆☆......☆☆



اوکاڑہ سے ارسال کردہ عبرت انگیز تحریر

لاجونتی

غیر مرئی مخلوق سے محبت کی انوکھی داستان......وہ نوجوان
اسٹیشن ماسٹر بھی لاجونتی کے حسن کا اسیر ہو گیا تھا......

جاوید راہی

انگریز کی نوکری کرنا بھی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ مسٹر برکلے نے میری معمولی سی شکایت پر میرا تبادلہ بڑے اسٹیشن سے برانچ لائن کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر کر دیا۔ میں کوشش کے باوجود اپنا تبادلہ نہ رکوا سکا۔ ہوا یہ کہ شہر کا ایک معروف زمیندار فضل دین جو انگریز آفیسر کا وفادار تھا کراچی جانے کی غرض سے اسٹیشن پر آیا تو میں اس کی خدمت اس کی مرضی کے مطابق نہ کر سکا کیونکہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کی مرمت کے باعث وہ جگہ استعمال کے قابل نہ رہی تھی۔ مستری وہاں کام کر رہے تھے میرے کمرے میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ میں فضل دین اور اس کے ساتھ آئے بہت سے آدمیوں کو کرسیاں پیش کرتا گاڑی آئی اور وہ اس میں سوار ہو گیا۔ گاڑی چلی گئی تو قلی عبدالرحمٰن میرے پاس بڑا ہی افسردہ سا چہرہ لے کر آ گیا۔

''بابو جی یہ اچھا نہیں ہوا۔'' اس نے اسٹول پر بیٹھتے اور سگریٹ سلگاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے رقم کا اندراج کرتے ہوئے چونک کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''چوہدری فضل دین برا تاثر لے کر گیا ہے۔''

''وہ کس لیے؟'' میں نے کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے اسے بوگی میں سوار کرایا ہے اس نے بڑے تیکھے انداز میں کہا تھا کہ تمہارا اسٹیشن ماسٹر کچھ زیادہ ہی خود اعتماد ہو گیا ہے جا رہا ہوں اس کا بھی بندوبست کرتا آؤں گا۔'' اتنا کہہ کر عبدالرحمٰن سگریٹ کے کش لگانے لگا اور میں پریشان ہو گیا۔ وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا تیسرے روز میرے تبادلے کے آرڈر آ گئے میری جگہ مجراب کا اسٹیشن ماسٹر بخشی ایشر داس آیا تھا۔ اس نے ہندو ہوتے ہوئے بھی ایسے حالات میں میرے تبادلے پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا۔

''وہ دو روز تک چارج نہیں لیتا اگر میں اپنا ٹرانسفر رکوا سکتا ہوں تو کوشش کر دیکھوں۔'' کیونکہ جس طرح بیٹھے بٹھائے مصیبت میرے گلے پڑی

تھی یہی حال اس کا تھا۔ میں تو اکیلا تھا مگر اس کے سب بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے اور کئی دوسرے مسائل بھی اسے درپیش ہوں گے میں نے شہر کے بااثر لوگوں سے رابطہ قائم کیا مگر ہر طرف سے ناکامی ہوئی اور میں نے دلبرداشتہ ہو کر چارج چھوڑ دیا اور اپنے خدا کو یاد کر کے سامان اکٹھا کیا اور فضل دین کو کوستا ہوا بخت پور چلا آیا۔

میرے وہاں پہنچتے ہی مجھے وہاں ہر چیز بالکل تیار ملی اسٹیشن ماسٹر نذر علی اس تبادلہ پر بہت خوش تھا مگر میں اس کے برعکس خاصا پریشان کیونکہ اکثر میں اپنے گھر ایک ماہ میں دو تین چکر لگا لیتا تھا پیچھے کام چل جاتا تھا اب یہ بات ناممکن تھی۔ یہاں دن میں صرف دو بار پسنجر گاڑی رُکتی تھی یا پھر تھرو کا زور تھا،

چھوٹی سی عمارت اور چھوٹا سا پلیٹ فارم دو عدد بینچ، ایک پانی کا نل، دو عدد مٹی کے تیل سے روشن ہونے والے کھمبے اور دو ہی سگنل یا پھر وہاں پر موجود پانچ چھ سرکاری ملازمین کے کوارٹر تھے جو اسٹیشن کی عمارت میں بنا دیے گئے تھے۔

بخت پور چھوٹا سا قصبہ تھا اس کی آبادی تقریباً پانچ سات ہزار افراد پر مشتمل تھی اسٹیشن کے ساتھ ساتھ دور تک کریں کے بوڑھے درختوں کا سلسلہ تھا جو شہر میں سے ہوتا ہوا جنگل میں گڈمڈ ہو جاتا۔ اسٹیشن چونکہ بخت پور کی آبادی سے ذرا فاصلے پر تھا اس لیے یہاں وہی لوگ تھے جن کا واسطہ یا اسٹیشن سے یا پھر سرکاری محکموں سے تھا مثلاً محکمہ جنگلات، محکمہ انہار وغیرہ، بڑی جلد ہم لوگ ایک دوسرے کے



واقف کار ہو گئے شہری آبادی میں ڈاکخانہ تھا وہ وقت ڈاک دینے اور لینے والا آتا یا پھر کچھ مسافر یہ کُل کائنات تھی بخت پور کی۔

میرا کوارٹر جو چھوٹے تین کمروں پر مشتمل تھا اسٹیشن کی عمارت سے ذرا ہٹ کر بنایا گیا تھا یہاں میرا عملہ ایک کانٹے والا اور ایک جھاڑو والا تھا۔ ٹکٹ میں خود دیتا اور خود ہی گاڑی گزارتا اور ٹکٹ وغیرہ چیک کرتا۔ رات کو بتیاں بھی پریتم روشن کرتا' بے چارہ صفائی سے لے کر میرے ذاتی کام تک بھی کرتا تھا چند ہی روز میں اس نے میرے گھر کا بھی سارا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ یہاں میں یہ ذکر کرتا چلوں کہ بخت پور تحصیل بصیر نگر میں تھا اور اسے پولیس اسٹیشن بھی وہی لگتا تھا یا پھر ریلوے پولیس کی کبھی کبھار گشت ہوتی جو ایک گاڑی سے اترتی اور دوسری میں سوار ہو کر واپس چلی جاتی۔

صبح گاڑی گزار کر میں لمبی تان کر سو جاتا اس دوران پریتم میرے کمرے کے باہر بیٹھا اونگھتا رہتا شام کی گاڑی اکثر رات کو آتی بعض اوقات کئی گھنٹے لیٹ ہوتی تو اسٹیشن پر تھوڑی سی رونق ہو جاتی مختلف لوگوں سے مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا۔ بخت پور میں یوں تو ساری قومیں آباد تھیں مگر ہندو زیادہ تھے ملک میں اس بات کے تاثر عام تھے کہ مسلمان اپنے لیے الگ ملک چاہتے ہیں اس حوالے سے بھی ہم مسلمانوں کو ستم ظریفی کا سامنا تھا۔

نذر علی نے جاتے جاتے بتایا کہ یہاں ہندو بڑے کینہ پرور ہیں ان سے ذرا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہماری آزادی کو یہ تعصب کا رنگ دیتے ہیں۔ مجھے یہاں آئے تقریباً تین ماہ ہو چکے تھے کوئی بھی ایسی صورت حال میرے لیے باعث پریشانی نہ بنی اور اس دوران میرے والد اور چھوٹا بھائی دو بار چکر لگا گئے میرے والد صاحب نے میری ٹرانسفر کی بہت کوشش کی مگر ناکام ہو گئے میری والدہ اور سب سے بڑی بہن میری شکل دیکھنے کو ترس گئے تھے مگر میں مجبور تھا۔

آج موسم ذرا ابر آلود تھا ساون شروع تھا اس لیے بارش وقفہ وقفہ سے ہو جاتی۔ گاڑی لیٹ تھی مسافر ٹکٹ لے کر اس کے انتظار میں تھے کچھ تو چھپر کے نیچے کھڑے تھے اور کچھ کھڑکی کے باہر باتوں میں مصروف تھے۔ میں سبز اور سرخ جھنڈی بغل میں دبائے دروازہ بند کرتا ہوا ٹکٹ گھر سے باہر نکل آیا کیونکہ مسافروں میں ہلچل شروع ہو گئی تھی جو شاید دور سے گاڑی کا ہیولا دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی اسٹیشن پر آ کر رک گئی کچھ لوگ اترے اور باقی سوار ہو گئے۔ میں ٹکٹ دیکھ کر فارغ ہوا گارڈ سے ضروری بات چیت کی اور گاڑی روانہ کروا دی۔ چند چھابڑی فروشوں اور پریتم کے سوا سارا پلیٹ فارم سونا ہو گیا میں اپنے دفتر میں آ کر اندراج کرنے بیٹھ گیا۔ اتنے میں پریتم اندر آیا اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"بابو جی! اِدھر صندوق پڑا ہے۔"

"کدھر؟" میں نے دریافت کیا۔

"نل کے سامنے والی کرسی کے نیچے۔" پریتم نے بتایا۔

"کوئی سواری بھول گئی ہے شاید۔" میں نے جلدی جلدی کنڈی لگاتے ہوئے خود سے کہا اور پریتم کے ساتھ ہو لیا۔ واقعی وہاں درخت کے نیچے بڑا سا آہنی صندوق پڑا تھا جس کے دونوں جانب بڑے بڑے دیسی تالے لٹک رہے تھے ہلا کر دیکھا تو بڑا وزنی معلوم ہوا۔

"پریتم' کوئی سواری جلدی میں بھول گئی ہے اِسے اُٹھا کر دفتر میں لے چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بابو جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم دونوں بڑی مشکل سے وہ صندوق اُٹھا کر دفتر میں لائے میں نے ضروری تصور کیا کہ اس کا میمو کاٹ دوں تاکہ یہ بات ریکارڈ میں آجائے۔ کام کرتے کرتے اچانک میرا دھیان اس صندوق کی طرف پلٹ جاتا یہی حال پریتم کا تھا اس کے چہرے سے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں پاتا۔

میرے اور اس کے درمیان کوئی پردہ نہیں تھا مگر اس کے باوجود ہم دونوں اس صندوق کے بارے میں متجسس تھے کہ آخر یہ کون بھول گیا ہے اور اس میں ہے کیا؟ میں کام کرنے کے دوران سواریوں کا جائزہ لیتا رہا جو مجھ سے ٹکٹ لے کر گئیں یا جو ٹرین میں سے اتریں مگر ذہن اپنے طور پر کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکا۔

میں نے اس صندوق کے بارے میں حکام کو جان بوجھ کر اطلاع نہیں دی تھی کہ شاید اس کا کلیم آجائے اور میں اس کے مالک کے سپرد کر کے جان چھڑواؤں مگر تین دن کے طویل انتظار کے بعد ہم دونوں کے ذہن اس پُراسرار صندوق کی وجہ سے پریشان ہو چکے تھے۔ پریتم ہندو تھا وہ اپنی فطرت سوچ کی مجبوری کے باعث ہر پل مجھے صندوق کے بارے میں گمراہ کرتا رہتا اس نے مجھے اس بات پر راضی کر لیا کہ صندوق کو کم از کم کھول کر دیکھ ہی لیا جائے میں نے پریتم کو کہا۔

"وہ صندوق میرے کوارٹر میں لے جائے تاکہ آسانی سے اُسے کھولا جائے۔" میں کہنے کو تو یہ بات کہہ گیا مگر ایک خوف سا تھا میرے دل میں' ٹرین نکال کر میں نے سارا کام ختم کر لیا اور کوارٹر کی طرف چل پڑا پریتم میرا منتظر تھا جس کی آنکھوں میں حرص کی چمک صاف طور پر نمایاں دیکھی جا سکتی تھی۔ اس نے قفل توڑنے کا سامان پہلے ہی تیار کر رکھا تھا میں نے کوارٹر اچھی طرح بند کر لیا اور پریتم کی طرف دیکھا جو میرے اشارے کا منتظر تھا۔ جھٹ اس نے بڑی سی سلاخ تالے میں پھنسائی اور تالا منہ پھاڑ کر ہنسنے لگا دوسرے کا بھی اس نے یہی حال کیا پھر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا میں نے اسے ڈھکنا اٹھانے کو کہا۔

جب صندوق کھلا تو ہمارے دونوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے صندوق میں گہرے سبز رنگ کی مٹی بھری پڑی تھی اور درمیان میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جو شاید مٹی کے نیچے تک جاتا تھا مٹی کے اوپر جس چیز نے ہم کو چونکا دیا وہ گہرے سیاہ رنگ کا کوئی بدبودار مادہ تھا جس کی ناگوار سی بو صندوق کھلتے ہی میرے کوارٹر کے اندر سرایت کر گئی۔ صندوق کے اندر ڈھکنے پر کوئی سمجھ نہ آنے والی اوٹ پٹانگ عبارت لکھی تھی پریتم کے چہرے پر خوف کے آثار پھیلتے جا رہے تھے۔ میں نے سنبھلتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے پریتم کو مخاطب کیا۔

"پریتم یہ کیا بکواس ہے چلو اس کو بند کرو پتہ نہیں کسی نے کیا ٹونہ ٹوٹکا کیا ہے مجھے بھی چار روز سے پریشان کر رکھا ہے۔"

"بابو جی یہ کسی مہان کشتی یوگی کا کام لگتا ہے پتہ نہیں یہ کیا بلا ہے؟" پریتم نے صندوق بند کرتے ہوئے کہا۔ میں نے بڑی مشکل سے وہ صندوق اس کے سر پر رکھوایا اور کہا۔

"اِسے دور لے جا کر پھینک آؤ۔"

پریتم کے جانے کے بعد میں نے کوارٹر کا دروازہ اور کھڑکیاں سب کھول دیں تاکہ وہ گندی سی بدبو باہر نکل جائے خدا معلوم وہ کیسی بدبو تھی جس نے میرا دماغ ماؤف کر ڈالا تھا تھوڑی دیر بعد پریتم بھی آگیا جس نے بتایا کہ وہ صندوق کو بڑے ڈھائے کے پار پھینک آیا ہے یہاں میں

عرض کر دوں کہ بڑا ڈھابا بخت پور کی آخری حد تھی کیونکہ یہاں سے نشیبی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔

اس بات کو کئی ہفتے گزر گئے ہم دونوں اس واقعہ کو فراموش کر گئے اس دوران شہر میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہوا یوں کہ رات کی تاریکی میں کسی نامعلوم بلا نے دھرم شالا کے برہمچاری اجیت پر حملہ کر دیا اس کے پورے جسم پر گہرے سبز رنگ کے بڑے بڑے داغ ابھر آئے تھے اور وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس واقعہ کی وجہ سے پورے بخت پور میں خوف و ہراس پھیل گیا اس سنگین صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے بصیر نگر پولیس کی نفری بھی پہنچ گئی تھی مگر انسپکٹر سودیش ورما کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا اور لاش کا کریا کرم کر دیا گیا۔

پریتم اجیت کو جلانے کی رسم میں شامل تھا اس کی زبانی معلوم ہوا کہ برہمچاری کے جسم پر ابھرنے والے سبز رنگ کے بڑے بڑے دھبوں کو جن سے سیاہی مائل مادہ خارج ہو رہا تھا دیکھ کر خوف آتا تھا میں نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ ہو سکتا ہے کہ اجیت کو کسی زہریلی چیز نے کاٹ لیا ہو۔ پریتم رام رام کرتا صفائی کرنے لگا۔

اس واقعہ کو ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اسی طرح ایک اور روح فرسا حادثہ رونما ہوا شادی گھر کا منتظم ریشم سنگھ جو علاقے کا مانا ہوا پہلوان تھا اسی حالت میں پایا گیا وہ شادی گھر کے قریب اکھاڑے میں اوندھے منہ پڑا تھا اور اس کے پورے جسم کا وہی حشر تھا جو چند روز قبل برہمچاری اجیت کے جسم کا ہوا تھا۔

پورے بخت پور میں اس دوسری موت کو بھگوان کا انتقام قرار دے دیا گیا سبھی لوگ اس اچانک صورت حال سے اتنے پریشان ہو چکے تھے کہ گھروں سے باہر نکلتے گھبراتے۔ ہر ایک کے ہونٹوں پر سبز موت کا تذکرہ تھا رات کو دلیر قسم کے نوجوانوں نے پہرہ دینا شروع کر دیا مگر اس کے باوجود تیسرے روز بھی ایک خوبرو نوجوان جو قریبی گاؤں سے حصول تعلیم کے لیے بخت پور آیا ہوا تھا اس پُراسرار موت کی نذر ہو گیا وہ بھی اپنے چھوٹے سے مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ ان تینوں کے بعد دیگرے اموات کی ایک چیز مشترکہ تھی جو بھی اس کا شکار ہوا وہ اپنی اپنی جگہ اکیلا رہتا تھا جب اس کی لاش جلائی جاتی تو اس میں سے ناقابل برداشت بدبو اٹھتی جسے بڑی مشکل سے وہاں کھڑے لوگ قبول کرتے کیونکہ ان رسوم کو تو بہر صورت نبھانا ہوتا تھا۔ اب تو بخت پور کے لوگ پولیس کو بھی اطلاع نہ کرتے کیونکہ پولیس نے دوسری بار یہ کہہ کر کارروائی کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ کسی زہریلی چیز کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔

گاڑی کے گزر جانے پر چند سواریاں اس انتظار میں گیٹ پر کھڑی تھیں کہ میں ان کے ٹکٹ دیکھ کر انہیں جانے کی اجازت دوں مگر میں بڑے کیکر کے نیچے بیٹھی اس عورت کو دیکھ رہا تھا جو گیٹ کی بجائے اس طرف جا بیٹھی تھی کیونکہ رات کے وقت کسی عورت کا وہاں جا بیٹھنا بالکل خلاف توقع تھا۔ ایک سواری کے اصرار پر میں اس عورت کو چھوڑ کر ٹکٹیں دیکھنے لگا۔ سب لوگ چلے گئے اب میں اور پریتم پلیٹ فارم پر اکیلے کھڑے تھے یا وہ عورت کیکر کے نیچے لاپرواہی سے بیٹھی تھی۔ میں نے ہمت کر کے پریتم کو اس کی طرف بھیجا تا کہ وہ پتہ کرے کہ وہ عورت ٹرین سے اتری ہے یا جانا چاہتی ہے اگر جانے کے لیے کہے تو کہہ دینا کہ اب کوئی گاڑی یہاں نہیں رُکے گی۔

پریتم کیکر کی طرف بڑھ گیا میں اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا مگر اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

’’کیا بات ہے پریتم؟‘‘

’’جی وہ بیٹھی روئے جارہی ہے میرے بار بار اصرار پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا‘ بابو جی وہ تو مجھے کوئی مصیبت زدہ عورت لگتی ہے آپ خود جاکر معلوم کریں کہ کیا ماجرہ ہے؟‘‘

میں سرہلاتا ہوا اس طرف چل پڑا۔ واقعی وہ عورت بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی میں نے ازراہ ہمدردی اسے اپنی طرف متوجہ کیا اس جگہ ہلکا ہلکا اندھیرا تھا میں اس کو صحیح طور دیکھ نہ سکا مگر میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ اٹھارہ بیس سالہ لڑکی ہے اور مسلسل روئے جارہی ہے میں نے گلا کھنکار کر صاف کیا اور اُسے مخاطب کیا۔

’’محترمہ! آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہے تو آپ بتائیں شاید میں آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔‘‘

’’آپ میری کیا مدد کریں گے میں تو ہوں ہی بدنصیب‘ میرا خاوند مجھے بیاہ کر پونا لے جارہا تھا مگر ویران اسٹیشن پر چھوڑ کر خود گاڑی میں سوار ہوگیا ہے۔‘‘ کہتے کہتے وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔

’’آپ روئیں مت سب ٹھیک ہوجائے گا میں یہ بات روانی سے کہہ گیا۔

’’اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں رات بسر کرلوں۔‘‘ اس نے روتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

’’آپ بھی کمال کرتی ہیں اس ویرانے میں آپ رات بسر کریں گی آئیں میرے ہمراہ اور مجھ پر مکمل بھروسہ کریں۔‘‘

’’شکریہ‘‘ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر میرے ساتھ چلنے لگی جب وہ میرے آفس میں آئی تو میری آنکھیں ساکت ہوکر رہ گئیں۔ بتی کی روشنی میں میرے سامنے ایک اپسرا بیٹھی تھی‘ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس اور سونے سے لدی ہوئی وہ واقعی نئی نویلی دلہن تھی۔ مانگ میں بھرا سیندور‘ مہندی بھرے ہاتھ‘ پاؤں میں قیمتی زری کی بنی جوتی‘ اُس کے دلہن ہونے کا ثبوت پیش کررہی تھی۔

’’آپ فکر نہ کریں میں آپ کے خاوند کو ہر حالت میں تلاش کروں گا۔‘‘ میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔ اس نے اپنی جھکی آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک کا احساس ہوا جیسے سخت گرمی میں شدید دھوپ کی تمازت ہو لحہ بھر کے نظروں کے تصادم نے مجھے جنجھوڑ کر رکھ دیا۔

پریتم دفتر کے باہر کھڑا اس بات کا انتظار کررہا تھا کہ اسے کوئی حکم جاری کروں اسی احساس کے پیش نظر میں نے اُسے دودھ لانے کو کہا۔ وہ ’جی اچھا‘ کہتا ہوا کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ میں اس لڑکی سے بات کرنے کا کوئی جواز تلاش کرنے لگا۔

’’آپ کے میاں کا آپ سے کوئی جھگڑا ہوگیا تھا جو اس نے یہ حرکت کی؟‘‘

’’کوئی بات نہیں ہوئی بس مجھے انہوں نے اسٹیشن پر اترنے کا حکم دیا اور میں اتر گئی جب گاڑی روانہ ہوئی تو وہ بھاگ کر سوار ہوگئے اور میں اسٹیشن پر اکیلی رہ گئی۔‘‘ اس نے ساڑھی کا پلو سر پر درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

’’بڑا بے حس انسان ثابت ہوا ہے۔‘‘ میں نے رجسٹر میں حساب چڑھاتے ہوئے کہا پھر اُسے مخاطب کیا۔

’’آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟‘‘

’’حیدرآباد کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے میرپور وہاں رہتے ہیں ہم لوگ۔‘‘ اس نے

مدھم سی آواز میں بتایا' اتنے میں پریتم چھاگل میں دودھ لے آیا میں نے دودھ پیالی میں ڈال کر لڑکی کے آگے رکھ دیا اور اس سے اس کا نام دریافت کیا۔

''میرا نام لاجونتی ہے۔'' اس نے پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے نام بتایا۔

''آپ ایسا کریں دودھ پی کر پریتم کے ساتھ کوارٹر پر جائیں اور آرام کریں صبح کوئی بندوبست کروں گا۔''

''اور ہاں پریتم تم دیوی جی کو چھوڑ کر میرا بستر دفتر میں لے آنا۔'' پھر میں نے لاجونتی کو مخاطب کیا۔

''آپ کوارٹر کا دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کرلیں جب تک آپ یہ اچھی طرح یقین نہ کرلیں کہ باہر سے آنے والا ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہے دروازہ مت کھولیں۔'' اس نے جواب میں سر ہلا دیا۔ دودھ ختم کر کے وہ پریتم کے ہمراہ کوارٹر کی طرف چلی گئی اور میں اس کے بارے میں سوچنے لگا کہ خدا جانے اس کے میاں نے اسے کس جرم کی پاداش میں یہاں بے یارو مددگار چھوڑ دیا ہے۔ پریتم بھی ہندو دھرم کا تھا اس لیے میں نے کسی بات کا سامنا کرنے سے پہلے ہی اپنا بستر دفتر منگوالیا۔

لاجونتی نے جو ایڈریس پونا اور میرپور کا بتایا تھا اس پر میں نے ہر ممکن رسائی کی مگر اِدھر سے کوئی جواب نہ آیا اُدھر لاجونتی بے فکر میرے کوارٹر میں رہتی تھی۔ اسے آج تیسرا روز تھا میں بھی اس کے آنے پر گھر کے کام سے بے نیاز ہو چکا تھا وہ ہر کام بغیر بتائے کر رہی تھی۔ جیسے وہ شروع سے میرے ساتھ رہتی آ رہی ہو ایک بات جس نے مجھے چونکا دیا تھا وہ دودھ کی زیادتی تھی یعنی پہلے صرف ایک ڈونی پیانہ آتا اب تین آنے لگے تھے کیونکہ لاجونتی صرف دودھ پی کر ہی گزارہ کرتی۔ اسے کھانے کے لیے کہا گیا تو اس نے بتایا۔

''اسے معدے کی تکلیف ہے اس لیے وہ صرف دودھ ہی پی سکتی ہے۔'' میں اس کے جواب سے مطمئن ہو گیا۔ میں جب بھی کوارٹر میں آتا لاجونتی کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کے آثار پاتا مگر وہ ایک ہندو لڑکی تھی اور میں ایک مسلمان تھا اس کے باوجود میرے دل کے کسی کونے میں اس کے لیے گداز سی کرن نمودار ہو رہی تھی جسے میں کوشش کے باوجود نہ دبا سکا۔

بخت پور میں لوگ اس آفت کی وجہ سے اتنے پریشان تھے کہ انہیں دوسرے کام میں مداخلت کرنے کی فرصت نہیں تھی ورنہ پتہ نہیں لاجونتی کے معاملے میں مجھے کیا کرنا پڑتا ویسے بھی پریتم کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ آخری گاڑی گزر جانے کے بعد پریتم کو بتی گودام کی نگرانی کا کہتا ہوا کوارٹر کی طرف چلا کہ لاجونتی کی خیریت وغیرہ دریافت کرلوں۔ بتی گودام میں جو سامان بُک ہوتا تھا میں وہ رکھوا دیتا تاکہ وہ محفوظ رہے۔ جب سامان زیادہ ہوتا تو پریتم کو اُدھر ہی رہنا پڑتا تاکہ کوئی نقصان نہ ہو پائے۔ لاجونتی نے میری آواز سن کر دروازہ کھول دیا۔ اس کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ تھی میں اندر داخل ہو گیا تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔

''لاجونتی! بڑی حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک تمہارے کسی رشتہ دار یا عزیز نے تمہارا پتہ نہیں کیا۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میری قسمت بابو جی!'' اس نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔

"آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔"

"نہیں لاجونتی رہنے دو کیوں تکلیف کرتی ہو۔"

"چائے تو میں نے بنا رکھی ہے۔" لاجونتی نے مسکرا کر جواب دیا اور کمرے سے نکل گئی تھوڑی دیر بعد وہ دودھ اور میں چائے کی پیالی پکڑے ان خدشات کی بات کر رہے تھے کہ ابھی تو صرف اس بات کا پریتم کو پتہ ہے اگر کسی اور کو علم ہو گیا تو میرے لیے مصیبت آ جائے گی لاجونتی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی میں نے پہلی بار ہمت کر کے اس کے بازو کو پکڑ کر ہلایا۔

"کیا بات ہے تم فکر نہ کرو میں تمہاری خاطر سب کچھ سہہ لوں گا۔" اس کا بازو میرے ہاتھ میں تھا اور میرے سارے جسم میں ایک ملائم سی سرسراہٹ کا احساس گونج گیا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے کسی سانپ کو پکڑ رکھا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتا لاجونتی جلدی سے پیالی اٹھا کر باہر نکل گئی اور میں شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔ میں تھوڑی دیر اور بیٹھا اور پھر اسے دروازہ بند کر لینے کا کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔

چاروں طرف خاموش سناٹا اور گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اسٹیشن پر نصب لیمپ کی مدھم روشنی کا شعلہ ہوا کے دوش پر رقص کناں تھا میں لاجونتی کے خیالوں میں گم آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بتی گودام کے باہر پریتم زمین پر بستر بچھائے بیٹھا اپنی چھوٹی سی ناریل کی حقی سے کش لگا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور لاجونتی کی خیریت پوچھی۔ میں اسے بتاتا ہوا اپنے آفس میں آ گیا۔ میرا بستر وہ بڑی میز پر لگا دیتا تھا جو یہاں دفتری کام کے لیے رکھی تھی وہ میرے پیچھے اندر آ گیا کیونکہ وہ روز مجھے دبا کر سوتا تھا آج بھی اس نے میرے لیٹتے ہی میری ٹانگوں کو دبانا شروع کر دیا۔

"بابوجی! ہم لوگ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں آپ نے اس کے پریوار کو پتر بھی لکھے ہیں پرنتو کوئی جواب نہیں آیا۔"

"ہاں پریتم میں اس مسئلے پر کئی بار سوچ بیٹھا ہوں صبح ایک بار پھر خط لکھوں گا تم جاؤ اور خبردار ہو کر لیٹنا۔"

"اچھا بابوجی!" کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا اور میں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا۔

رات کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا اور وہ بستر پر لیٹی بے چینی میں کروٹیں بدل رہی تھی اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کی نقاہت مزید بڑھ گئی وہ ایک ہیجانی سی کیفیت میں مبتلا ہو کر اٹھی اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند روشن ہو گئیں اس کے منہ سے گہرے سبز رنگ کا غبار سا خارج ہونے لگا۔ رات کی تاریکی میں کوارٹر کا دروازہ کھلا اور سبز غبار میں مدغم نسوانی سایہ لہراتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگا۔ بتی گودام کے باہر پریتم دن بھر کا تھکا ہوا بے خبر پڑا تھا وہ نسوانی سایہ تھوڑا سا جھکا پریتم کے جسم کے اوپر سبز غبار پھوار کی مانند پڑا اور وہ بلبلا کر اٹھ بیٹھا اس کے سامنے لاجونتی کھڑی تھی جس کی سرخ انگارہ آنکھیں پریتم پر مرکوز تھیں اور پریتم کا جسم اس سبز غبار میں گم ہونے لگا پریتم نے لاجونتی کا جسم سمٹے دیکھا اور پھر سامنے ایک خوفناک سبز ناگن پھن پھیلائے جھوم رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی کشش نے پریتم کو بے سدھ کر ڈالا' اب وہ ناگن پریتم کے جسم پر رینگنے لگی اس کے خوفناک دانت بار بار پریتم کے جسم میں پیوست ہو رہے تھے اور پریتم کا جسم چونے کی طرح پھٹتا جا رہا تھا۔ رات بھیگ

رہی تھی وہ نسوانی سایہ اس سبز غبار میں دوبارہ نمودار ہوا اور شان بے نیازی سے بڑھتا ہوا دوبارہ کوارٹر کی طرف بڑھنے لگا۔

پریتم کی لاش بتی گودام کے باہر پڑی تھی اور میرے ارد گرد مقامی لوگوں کا ہجوم تھا جو مجھ سے طرح طرح کے سوالات کررہے تھے کیونکہ پریتم کے جسم پر بھی وہی نشانات تھے جو اس سے پہلے ملنے والی لاشوں کے جسم پر نمایاں تھے۔ وہی سبز رنگ کے بڑے بڑے گڑھے اور ابھرے ہوئے گلے سڑے پھوڑے جن سے سبز رنگ کا لیس دار مادہ بہہ رہا تھا۔ میں اپنے ذہن پر زور دے رہا تھا کہ رات کے کس پہر یہ خوفناک واقعہ پیش آیا مگر میرا ذہن کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکا پولیس آئی اور اسے بھی پُراسرار حادثہ قرار دے کر چلی گئی۔

میں پریشان سا کوارٹر میں آیا اور لاجونتی سے تبادلہ خیال کرنے لگا وہ میری باتوں کا جواب اوں ہاں کر کے دیتی رہی میں پریتم کی وفاداری کے قصے بیان کرتا رہا۔ لاجونتی کا چہرہ سپاٹ تھا اور اس پر کسی تاثر کا کوئی ثبوت نہیں نظر آرہا تھا میں اور کچھ دیر رُکتا مگر مجھے ہیڈ کوارٹر میں پریتم کی موت کی اطلاع دینا تھی اور متبادل بندوبست بھی کرنا تھا۔ ویسے بھی میرا اپنا دل خوفزدہ تھا کہ میں بھی اس پُراسرار بلا کے نرغے میں نہ آجاؤں۔

اس واقعہ کو کئی روز بیت گئے تھے مگر میں بڑا چوکنا رہتا' پریتم کی جگہ جو کوٹری سے ملازم آیا تھا وہ ایک عمر رسیدہ شخص اور عیسائی تھا۔ جوزف نام تھا اس کا' خاموش طبع' یہ بزرگ ہر کام بتانے پر کرتا ورنہ بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ جیسے کچھ تلاش کررہا ہو۔

''جوزف......''

''جی بابو جی......'' اس نے چونک کر جواب دیا۔

''جاؤ کوارٹر کی صفائی کر آؤ اور لاجونتی سے پوچھتے آنا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے۔''

کوارٹر کی صفائی سے فارغ ہو کر جوزف نے لاجونتی کو مخاطب کیا۔

''بیٹی! بابو جی نے کہلا بھیجا ہے کہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہیں۔''

''نہیں بابا جی کچھ نہیں۔'' لاجونتی نے پڑے پڑے جواب دیا جوزف جھاڑو رکھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ لاجونتی نے اپنے فیصلے کے پیش نظر اٹھ کر آخری نظر کوارٹر پر ڈالی اور اپنے جسم کو سمیٹ کر ناگن کا روپ دھار لیا۔ ساڑھی زمین پر ڈھیر ہوگئی اور وہ دروازے کی بڑی جھری سے نکل کر جنگل میں روپوش ہوگئی۔ گاڑی گزر جانے کے بعد میں نے حساب بند کیا اور کوارٹر کی طرف چل پڑا چند لمحوں تک میں دروازہ پیٹتا رہا پھر دھکا دے کر اندر داخل ہوگیا۔

''لاجونتی......'' میری آواز نے کوارٹر کی گھمبیر خاموشی توڑی مگر کوئی جواب نہ ملا جب سونے کے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ زمین پر ساڑھی بکھری پڑی ہے مگر لاجونتی نہیں......اس کی سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پڑی تھیں اور وہ ساڑھی بھی جو اس نے پہن رکھی تھی سارے کوارٹر میں' میں اسے تلاش کر کے پھر باہر نکل آیا مگر لاجونتی کہیں نظر نہ آئی میں پریشان ہو کر پلیٹ فارم کی طرف چل پڑا۔

''جوزف تم جب صفائی کرنے گئے تھے تو لاجونتی کوارٹر میں تھی۔''

''جی بابو جی......'' جوزف نے بتی کا شیشہ صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں بابو جی خیریت تو ہے نا۔''

"کچھ نہیں بس وہ کوارٹر میں نہیں۔" کہتا ہوا رجسٹر کھول کر کام کرنے لگا۔ کئی روز ہو گئے مگر لاجونتی کا کوئی پتہ نہ چلا میرے ذہن میں طرح طرح کے خیال ابھر ڈوب رہے تھے۔ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ پایا۔

ادھر بخت پور میں پھر سے سبز موت کی کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں لوگ ڈر کے مارے بھاگ رہے تھے بصیر نگر سے پولیس کی نفری مکمل طور پر بخت پور میں آ چکی تھی مگر وہ بھی اس کا سراغ لگانے میں ناکام ہو چکی تھی۔

"بابو جی...... کہیں لاجونتی بیٹی بھی تو اس بلا کا شکار نہیں ہو گئی جو آج تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔"

"جوزف کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا جاؤ بتیاں روشن کر آؤ۔" جوزف باہر نکل گیا اور میں لالٹین کی روشنی میں حساب جوڑنے لگا۔

ایک عجیب سی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی میں نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا اور دوبارہ کام میں لگ گیا پھر یکدم کوئی خیال آیا اور اٹھ کر دفتر کا دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر لیا۔ تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ وہ ناگوار سی بو پھر محسوس ہوئی' اس بار مجھے یہ بو اپنے بالکل قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی جب میں نے غور کیا تو کمرے میں ہلکا ہلکا سبز غبار سا اڑتا ہوا دکھائی دیا جس میں سبز ذرات جل بجھ رہے تھے۔ میں خوفزدہ ہو گیا مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے موت رقص کرتی نظر آنے لگی' میں خوف سے چیخ اٹھا مگر میری سماعت سے ٹکرانے والی آواز نے مجھے ساکت کر دیا۔

"طارق! گھبراؤ مت میں لاجونتی ہوں جس کے احساس کی خوشبو اب بھی تمہارے دل کے کسی گوشے میں مچل رہی ہے۔" پھر وہ سبز غبار ایک جگہ اکٹھا ہونے لگا چند ساعتیں گزرنے کے بعد لالٹین کی مدھم روشنی میں لاجونتی کا چمکیلا جسم اپنی پوری رعنائی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

"طارق تم میرے لیے پریشان تھے نالو میں آ گئی ہوں' تمہیں اس اذیت سے نکالنے کے لیے' میں کہاں چلی گئی تھی طارق' میں انتقام ہوں۔ انسان کے جسم میں گردش کرتے گرم گرم خون کا' جس نے مجھے یہ روپ دھارنے پر مجبور کیا۔ کاش وہ یوگی میرے ساتھی کو اپنا جاپ پورا کرنے کے لیے پورن ماشی کی رات ہلاک نہ کرتا اور مجھے قید کر کے یہاں نہ پھینکتا' میں کبھی ایسا نہ کرتی' تمہارے طرز عمل اور محبت نے مجھے انسان سے نفرت کے باوجود اس سے محبت کا بھی درس دیا ہے۔ میں تمہاری حد سے نکل کر باہر جا رہی ہوں مگر تم مجھے ہمیشہ یاد آتے رہو گے اور ہاں پریتم کا مجھے اس لیے دکھ نہیں کہ وہ تمہیں غلط مشورے دیتا تھا جس کی سزا میں نے اس کے لیے یہی تجویز کی تھی۔ اب میں جا رہی ہوں۔" کہتے ہوئے لاجونتی اٹھی اور میرا ہاتھ تھام کر ہونٹوں پر لگا لیا۔ مجھے اپنے پورے وجود میں ایک جھرجھری سی اٹھتی محسوس ہوئی وہ غبار ایک دم سمٹ کر ناگن کا روپ اختیار کر گیا اور آنکھوں کے سامنے دیوار کے سوراخ میں گم ہو گیا۔ میرے ہاتھ پر سبز نشان چمک رہا تھا۔ میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے اپنا ہاتھ آنکھوں کو لگا لیا اور میری آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل کر اس سبز داغ میں جذب ہو گئے۔

☆☆......☆☆

سرگودھا سے ارسال کردہ......

تعارف

حافظہ سیدہ مون شاہ بخاری

ادارہ

"حمد اُس خدا کی جو دو جہاں کا بادشاہ ہے۔ اور تمام علوم ارضی وسماوی جس کی کرسی میں سمائے ہوئے ہیں۔ کروڑوں درود حضرت محمد ﷺ پر جو جانِ جہان ہیں، درود آنحضور ﷺ کی آل و اصحابؓ پر جو منبعٔ رشد و ہدایت ہیں۔ معزز اراکین سچی کہانیاں، محترم لکھاریوں اور قارئین کرام السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ......

میرے قلم اٹھانے کا مقصد کسی کو یہ باور کروانا نہیں ہے کہ 'سیدہ مون شاہ' کوئی منفرد قسم کی شخصیت ہے۔ کیونکہ میں اللہ کی مخلوق میں خود کو سب سے 'حقیر' سمجھتی ہوں۔ عاجزی وانکساری اللہ کو بہت پسند ہے۔ بس کچھ پرت ہیں جن کو آپ کے سامنے کھولنا ہے۔ یا شاید میری وحشت مجھے اُکسا رہی ہے کہ میں کچھ لفظوں کو کاغذ پر اُتار کر اندر کی گھٹن سے بچنے کا کوئی طریقہ نکالوں۔

ورنہ میری ذات میں کوئی ایسا جوہر نہیں ہے کہ جو آپ کی نظروں کو خیرہ کر دے۔ نہ میرے قلم میں کوئی ایسی نویکلی داستانیں ہیں کہ آپ سحر زدہ رہ جائیں۔ بس میرے اندر سر پٹختے لفظوں کو نوکِ قلم سے رہائی پانے کی دھن ہے۔ میں نے 18 اگست کو سید گھرانے میں قدم رنجہ فرمایا۔ بلکہ اللہ نے میرے ورود کے لیے سید گھرانے کو چنا۔ صد شکر کہ اُس نے حضور ﷺ کے امتی ہونے کا فخر بخشا۔ اس فخر کے سامنے کسی فخر کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ سب وہم وگمان ہے۔

میرا تعلق شاہینوں کے شہر سرگودھا سے ہے۔ مجھے اپنے شہر سے بہت پیار ہے۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں میرا نمبر آخری ہے۔ ہمارے خوشحال گھرانے میں بھابیاں بھی شامل ہیں۔ مجھے اپنے گھر کے ہر فرد سے محبت ہے۔ میری دعا ہے کہ خدائے بزرگ وبرتر میرے گھر کے جملہ افراد کو ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ میرے بہن بھائیوں کی نسل نیک ہو اور اللہ پاک میرے والدین کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سے بڑی نعمت والدین کا ہونا ہے۔ اللہ کریم کے ہزار ہا شکر مجھ پر واجب ہیں۔ لیکن میرا قلم اُس کی عظمت کے سامنے عاجز ہے۔

وہ کریم ایسا کہ یہ شکرانہ خود ہی قبول فرمالے۔ وہ سخی ایسا کہ بھیگی آنکھوں کے سوال سمجھ لے اور دامن کو بھر دے۔ میری والدہ، بھائی قاری شجاعت علی اور برادر

قاری عثمان غنی قادری مجھے بے حد عزیز ہیں۔ میری ہر سانس اُن کے لیے دعا گو ہے۔ یہ میرا مان ہیں خدا ان کو سلامت رکھے میرے مان کو سلامت رکھے آمین۔

اب بات ہو جائے تعلیمی سفر کی تو میرا یہ سفر بھی جاری ہے۔ 2011ء میں اللہ کی خاص مہربانی سے اڑھائی سال کے عرصے میں قرآن کریم حفظ کرنے کی سعادت حاصل کر چکی ہوں۔ 2018ء میں توفیق خداوندی سے 3 ماہ کے مختصر عرصے میں ترجمہ تفسیر قرآن کورس مکمل کیا۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر ڈپلومہ حاصل کیا۔ تاحال بی اے سال اول کی طالبہ ہوں۔ اللہ کریم نے میرے لیے راہیں آسان کردیں۔ میرے ذہن کو کشادہ کیا ہر حال میں میری مدد فرمائی۔ تعلیم حاصل کرنا میرا شوق میرا خواب ہے۔ خدا پورا کرے مجھے ریاکاری، منافقت، حسد اور غرور و تکبر سے نفرت ہے میں سادہ ہوں اور سادگی پسند ہوں۔ نت نئے فیشن میک اپ، جیولری وغیرہ سے دور رہنا پسند ہے۔

مجھے ذمہ دار مرد اور لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ پردہ کرنا بے حد اچھا لگتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تمام مسلم عورتیں سیدہ فاطمہؓ کے اسوہ سے روشنی حاصل کریں۔ میں محب وطن ہوں اور شکر کرتی ہوں کہ سوہنی دھرتی پاکستان میرا دیس ہے۔ حضرت محمد ﷺ کی ذات والا صفات سے بے پناہ عشق ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ پسندیدہ شخصیت ہیں۔ امام حسینؓ کا کردار بے حد قابل تحسین لگتا ہے۔ سیدہ عائشہؓ کے علمی تدبر سے متاثر ہوں۔ تاریخی اور اسلامی کتابوں کا مطالعہ شوق سے کرتی ہوں۔ کشف المحجوب، مکاشفۃ القلوب، البتول، سیرت نبی ﷺ، یو کین ون، شمشیر کا قرض، جان، اور خاک و خون پسندیدہ کتابیں ہیں۔ قرآن کریم میری جان ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ دل کا سرور ہے، پسندیدہ لکھاری خان آصف، نسیم حجازی، اشفاق احمد، محترم انکل سلیم اختر اور نمرہ احمد ہیں۔ محمد عثمان غنی قادری اور شہباز قمر فریدی پسندیدہ ترین ثناء خوان رسول ﷺ ہیں۔ جبکہ علامہ رضا ثاقب، پروفیسر حسین احمد مدنی اور علامہ سید عرفان شاہ مشہدی کے بیانات شوق سے سنتی ہوں۔ موجودہ زمانے میں پھیلتی بے حیائی اور فحاشی رنجیدگی کا باعث بنتی ہے۔ خدا کرے کہ وطن عزیز کا نظام 'نظام مصطفیٰ' میں تبدیل ہو جائے آمین۔ روضہ رسول ﷺ کی حاضری کے لیے شدید خواہش ہے۔ حرم پاک کا شوق سفر دل میں ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ حضور ﷺ کی نعتیں پڑھنا بے حد پسند ہے۔

مزاجاً سنجیدہ ہوں...... لیکن کبھی کبھار جی چاہتا ہے کہ اس خول سے باہر نکل آؤں...... اور عام لوگوں کی طرح بے فکری سے زندگی بسر کروں، بے فکری میری حیات سے کوسوں دور ہے...... اندر بہت ویرانی ہے۔ دوستی نے میرے مزاج سے زیادہ میل نہیں کھایا۔ حلقہ احباب محدود ہے۔ زندگی میں بہت سے تلخ تجربات ہوئے۔ ان تجربات سے یہی سیکھا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے ہر شخص صرف اپنا مفاد دیکھتا ہے۔ میں بہت عام اور مخلص ہوں کافی حد تک صاف گو ہوں۔ رشتوں کو عزت دینے والے لوگ پسند ہیں۔ کبھی کبھار میرے مزاج میں چڑچڑا پن آ جاتا ہے یہ میری خامی ہے۔

اس کو ختم کرنا چاہتی ہوں کیونکہ اس کی وجہ سے اکثر لوگ مجھ سے خفا ہو جاتے ہیں۔ میں دوسروں سے جلد بے تکلف نہیں ہوتی، اور نہ ہر کسی سے بے تکلفی کا اظہار کرتی ہوں۔ بہت کم لوگ ہیں جو دل میں بستے ہیں اور جو دل میں بس جائیں اُن کی خوبیاں بھلی لگتی ہی ہیں اُن کی خامیاں بھی نظر انداز کر دیتی ہوں۔

عفو و درگزر سے کام لینا پسند ہے۔ نرمی و شائستگی کا عنصر بھلا لگتا ہے۔ کھانے پینے کی خاص شوقین نہیں ہوں۔ بس ذرا 'موڈی' ہوں۔ وہ بھی کسی کسی کے لیے...... خوشامد پسند نہیں اساتذہ کا دل سے احترام

کرتی ہوں۔ اور ان کی منظورِ نظر ہوں۔

مس صبا بشیر، مس روبینہ ضیاء اور مس شائلہ منیر فیورٹ ہیں۔ دینی اور دنیاوی تعلیمی ادارے یکساں لائق احترام ہیں۔ مجھے جامعہ خدیجۃ الکبریٰ میں گزرا عرصہ ہمیشہ یاد رہے گا اور کالج کے زمانے کو بھلانا بھی ناممکن ہے۔ غیر نصابی سرگرمیوں مثلاً تلاوت، نعت، کمپیئرنگ، تقریر میں بھی حصہ لیا اور داد پائی۔ ایثار و قربانی کے جذبے سے معمور سچی محبت، پر یقین ہے۔ اور اگر سوال کیا جائے کہ قلمی سفر کا آغاز کب ہوا؟

تو اس کا جواب بجا طور پر یہی ہوگا کہ قلمی سفر کا آغاز جماعت پنجم سے ہو گیا تھا۔ یعنی کہ جب لفظوں سے آشنائی تو تھی، لیکن اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ آپ کو یہ بات ناقابل یقین لگے گی مگر حقیقت یہی ہے۔

وہ کہانی جانے کہاں کھو گئی؟

بہر حال جماعت ہشتم کی طالب علمی کے زمانے میں باقاعدہ لکھنے کا آغاز کیا۔ سرگودھا کے مقامی اخبارات اوصاف اور نبل میں میری تحاریر شائع ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کی تحریروں میں ناپختگی بھی ہوگی۔ مگر وہ بے فکر دور کی معصوم سی خوشیاں تھیں۔ میرے گھر والے میری کامیابیوں پر خوش تھے لیکن خاندان کے چند لوگ ایسے تھے جنہوں نے تنقید سے کام لیا۔ حالانکہ میرا اور اُن کا عمر کے لحاظ سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

نہ میرا مقصد مقابلہ بازی تھی۔ بہر حال اللہ نے میرا ساتھ دیا۔ میں نے کسی کی پرواہ نہیں کی۔ میں میٹرک کی طالبہ تھی جب میری پہلی کہانی 'راہِ اُلفت' سچی کہانیاں کے صفحات کی زینت بنی اور اس کو انعام بھی ملا۔ 'میری گڑیا رانی' وہ تحریر تھی۔ جسے سب نے سراہا...... اور یہ بھی انعام یافتہ ٹھہری اُن دنوں محترم انکل ناصر رضا مرحوم رسالے کے مدیر تھے۔ خدا ان کے درجات بلند کرے میری گڑیا رانی کے بعد بھی کئی کہانیاں شائع ہوئیں۔ ایک افسانہ دوشیزہ میں چھپا پھر کاشی چوہان مدیر بنے اُن کا عجیب و غریب رویہ مطمئن نہ کر سکا اور میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔

محبوب پرچے سے دوری آساں نہ تھی لیکن مجبور تھی۔ پھر میں نے ردا میں کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ یہاں بھی پذیرائی ملی۔ لیکن سچی کہانیاں ج میری شہرت کے خواب کا سنگ میل ہے اس لیے دوبارہ حاضری دی شہرت میرا جنون تھی۔ لیکن اب اس جنون میں کچھ کمی آ گئی ہے نجانے کیوں؟

بس کہیں کچھ ادھورا پن ہے۔ بہر حال آخر میں محترم منزہ سہام صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ جنہوں نے ہمیشہ حسن اخلاق سے کام لیا بہت پیار سے بات کی اور دوبارہ سچی کہانیاں کا حصہ بنایا۔

امید ہے کہ آپ سب لوگ بھی مجھے خوش آمدید کہیں گے۔ میں آپ کے وقت کی قدر کرتی ہوں کہ جس وقت میں سے آپ اپنے قیمتی لمحات میرے لفظوں کو پڑھنے میں صرف کریں گے۔ محبتیں قرض ہیں اور یہ قرض چکایا نہیں جا سکتا۔ میں آپ سب کی اور اپنے قلمی سفر میں معاون تمام اداروں کی شکر گزار ہوں۔ سب کے لیے دعاگو ہوں۔

آپ کے لیے میرا یہ پیام ہے کہ حضور ﷺ کی محبت سے ایمان مکمل ہوتا ہے اور اس محبت کا تقاضا ہے کہ ہم اُن کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر غرور و تکبر، ذات پرستی، شہرت پرستی، اور جاہ و منصب کے بتوں کو توڑ کر مساوات کا درس دیں کیونکہ......

یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتان وہم و گماں لاالہ الا اللہ......

محبوب قائد محمد علی جناح نے اسی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا تھا، رشتوں کو اہمیت دیں، خوش رہیں خوشیاں بانٹیں اللہ ہم سب کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے آمین۔ امن و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ......

☆☆......☆☆

آج کا شاعر

ساحل قادری......جبیں پہ جن کے محبت لکھی ہے

شگفتہ شفیق

۳۰ سالہ ساحل قادری نو جوان استاد شاعر جنھوں نے ایم اے اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے



کیا ہے اُن کا اصل نام عمر فاروق ہے۔ جو کہتے ہیں۔

ہماری طرح کے بہت کم ملیں گے
ہماری جبیں پہ محبت لکھی ہے

ساحل قادری کہتے ہیں کہ شاعری میں اُن کا کوئی استاد نہیں ہے وہ پیدائشی شاعر ہیں تقریباً دس سال سے لگاتار لکھ رہے ہیں عروض پر خاص دسترس حاصل ہے بے شمار شاگرد اُن کے ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں سردی و پت جھڑ کے موسم کے عاشق ہیں کسی گروپ سے وابستہ رہنا ان کو اس لئے ناپسند ہے کہ لوگ گروپ بندیاں بنا کر سب کو چکروں میں ڈال دیتے ہیں اسی لئے ان کو اپنی آزادی پسند ہے۔ یوں تو ساحل کو شاعری کی تمام اصناف اچھی لگتی ہیں لیکن غزل و نظم زیادہ بھاتی ہیں پسندیدہ شعراء میں جون ایلیاء اور ادا جعفری شامل ہیں ساحل کہتے ہیں کہ مجھے منافقت سے پاک معاشرہ اور لوگ پسند ہیں جو کہ نہیں ملتے ہیں اسی لئے ان کا کہنا ہے کہ زندگی بھی مسکراہٹوں سے مزین نہیں ہوتی ہے۔

روز کہتا ہوں بھاگ جاؤں گا
روز وحشت پکار لاتی ہے

ساحل قادری کہتے ہیں کے ادب چند بے ادب ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے اچھے لکھنے والوں کو آگے نہیں آنے دیا جاتا اور نااہل لوگوں کو مسند پر بٹھا دیا گیا ہے جو قطعی نہیں جانتے کہ ادب کیا ہے؟ ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ عہدِ حاضر میں جھوٹ منافقت اور دوغلا پن آگے بڑھنے کے لئے

ضروری ہیں ساحل کو مالک و مولا سے رشتہ مضبوط رکھنا پسند ہے کلاسیکل موسیقی من کو بھاتی ہے اور اس میں عابدہ پروین غلام علی اور مہدی حسن کے دیوانے ہیں۔

زندگی ہم ترے دیوانے ہیں
تو ہمیں ہم سفر نہیں رکھتی

ساحل قادری ایسا نوجوان شاعر ہے جس کی شاعری میں ذات کا بے ساختہ اظہار ہے اردو غزل جن فکری اور شعوری احساسات سے گذری ہے ساحل کی غزلیات میں اس کا مکمل شعور انتہائی خوبصورتی کے ساتھ کارفرما ہے بے حد حسائیت سے رچے اشعار ایسا لطف دیتے ہیں کہ قارعین ان کی تاثیر تا دیر محسوس کرتا ہے ان کی غزل کا اپنا ذائقہ ہے بے حد روانی اور آسانی سے چھوٹی بحر میں طویل ترین غزلیات لکھنا ساحل قادری کو بے حد پسند ہے انھوں نے بے شمار طویل غزلیں لکھیں ہیں جن کو پڑھ کے غزل کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اس کو ہم ان کی انفرادیت بھی کہہ سکتے ہیں ساحل محبت کے شاعر ہیں اور محبت کا پیغام دنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں ان کی قوت متخیلہ بھی عام شعراء کی نسبت ہٹ کر ہے۔ بے شمار کلام لکھا ہے جو کہ۔۔ آب مژگاں۔۔ کے نام سے زیرِ طباعت ہے اعلی حضرت امام اہلسنت احمد رضا خان صاحب سے بے حد متاثر ہیں اور اسی طرح صوفیانہ کلام بھی ساحل قادری کے ہاں رنگ جماتا نظر آتا ہے غرض کہ ساحل قادری کی جاندار شاعری نہ صرف آج بلکہ آنے والے دنوں میں بام عروج پر جاتی نظر آتی ہے۔۔ اللہ اور ان کے قلم کو رونق و عزت بخشے اور اس کی سحر انگیزی میں خوب ہی اضافہ رہے۔ آیئے کچھ ساحل کا کلام پڑھیں۔

غزل

آپ کی زندگی سے گھائل ہوں



موت کی کج روی سے گھائل ہوں
اُس کے در پہ جھکا پڑا ہو گا
قلب کی عاجزی سے گھائل ہوں
میرے لہجے میں بولنے والے
میں تری خامشی سے گھائل ہوں
تم مرے بن سکو تو آ جاؤ
دشمنو دوستی سے گھائل ہوں
ایسے قاتل ہیں شعر ساحل کے
اُنکی میں شاعری سے گھائل ہوں

............*

ہیں آج بھی ویسے ہی دن رات نہیں بدلے
اس گھر کے کبھی ہمدم حالات نہیں بدلے
جس لمحے ملا تھا تو وہ لمحہ وہیں پر ہے
برسوں میں کہیں جا کر لحات نہیں بدلے

............*

عشق کیا اس قدر ضروری تھا

پھر میں تری عطا سے آگے نکل گیا تھا

............*

اس نے پلکوں پہ کئی بار سجائے جگنو
یہ الگ بات مرے ہاتھ نہ آئے جگنو

............*

جس نے وفا کے نام پہ میرا لہو جلا دیا
پھولوں بھری بہار میں اس کا بھی من جلا کہ یو
ں

............*

روگ دل کو لگا رہے ہیں ہم
اس کا ماتم منا رہے ہیں ہم
یہ نہیں وہ نہیں ابھی جاناں
کیا بہانے بنا رہے ہیں ہم

............*

آبِ مژگاں میں رقص کرتے ہیں
غم کے زنداں میں رقص کرتے ہیں
حسنِ امکاں میں رقص کرتے ہیں
فکرِ یزداں میں رقص کرتے ہیں
ابرِ باراں میں رقص کرتے ہیں
گلِ بہاراں میں رقص کرتے ہیں
ہم وہ صوفی ہیں باصفا لوگو
یادِ انساں میں رقص کرتے ہیں
آپ عنواں میں رقص کرتے ہیں
عاشقوں کا فسوں نرالا ہے
غم کے نقصاں میں رقص کرتے ہیں
دردِ دل کو بھی کھا چکا ہوگا
اب تو درماں میں رقص کرتے ہیں
جا کے ساحل پہ جشن بھی کرنا
ہم بھی طوفاں میں رقص کرتے ہیں

☆☆......☆☆



اپنی ہستی ہی وار دی تو نے
اب سمندر کہوں تجھے کیسے
روح پیاسی ہی مار دی تو نے

............*

خواب ٹوٹے نہیں تھے توڑے تھے
تجھ سے پہلے تو روگ تھوڑے تھے
تم نے پل میں فنا جو کر ڈالے
غم بڑی مشکلوں سے جوڑے تھے
ان کی باتوں سے دل تڑپتا تھا
حرف تھے یا جفا کے کوڑے تھے

............*

نیا لباس اب کہ روشنی کا پہنوں گا
نکل رہا ہوں میں اس خاک کے لبادے سے

............*

ایک پل جھکی تھی تیرے در پہ جبینِ حاجت



لاہور سے ارسال کردہ دہشت ناک تحریر

اسرار غیب

بنا استاد کوئی کام بھی درست انداز میں پائے تکمیل تک نہیں پہنچتا مگر جب تک یہ بات اُس کی سمجھ میں آئی وظائف کے موکل ہی اس کے دشمن ہو چکے تھے

حنا بشریٰ

یہ کائنات اور اس کا ہر گوشہ اسرار میں لپٹا ہوا ہے۔ آسمان کی وسعتوں میں اسرار...... تو زمین کی تہوں میں اسرار...... قطبین میں اسرار تو اس سے اٹھتی ہواؤں میں اسرار...... گو کہ معمولی سے معمولی ذرہ بھی اسرار کی چادر میں ملغوف ہے۔ اگر ان اسرار و رموز کو کوئی جانتا ہے اور ان حقیقتوں سے کلی طور پر واقف ہے تو وہ صرف عالم الغیب ہے......

جو اس کائنات کا نظام اپنی قدرت کاملہ سے سنبھالے ہوئے ہے...... اور پھر اللہ جسے چاہے ان اسرار کا علم عطا کر دے...... کسی کے سینے میں براہ راست علم و عرفان اُتار گیا اور کہیں مرشد و مربی اُتار دیے گئے۔

کیونکہ یہ راہیں اتنی سہل نہیں کہ بغیر مرشد کی رہنمائی کے کوئی ان پر چل سکے اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو صریح غلطی پہ ہے...... اس کی عقل نے اُسے بھٹکا دیا اور جو جھٹکا تو پھر وہ اوندھے منہ ہی گرا۔

بالکل ایسے ہی اوندھے منہ میں گرا تھا اور ایسا گرا کہ بستر مرگ پر ہی آ پڑا موت لحہ بہ لحہ قدم بہ قدم میری طرف بڑھتی جا رہی ہے کسی وقت بھی اس کا شکنجہ میرے خاکی وجود سے اس روح کو الگ کر دے گا۔ اس سے پہلے کچھ سامان عبرت اور کچھ نصیحتیں آپ کے حوالے کر دوں۔ کیا خبر کہ آپ میں سے بھی کوئی میری طرح ان راہوں کا مسافر بن چکا ہو۔

جب سے ہوش سنبھالا غربت اور افلاس کو ہی اپنے گھر میں ڈیرہ جمائے دیکھا۔ میٹرک کر کے میں ایک فیکٹری میں لگ گیا۔ ابا کو فالج ہو چکا تھا اور اماں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی۔ ساتھ میں میری دونوں بہنوں کو بھی لے جاتی' میری تنخواہ اور اماں کی کمائی سے گھر کا خرچہ کسی حد تک چل رہا تھا۔ مگر تعلیم ادھوری رہ جانے کا مجھے ہمیشہ قلق رہتا۔

تو اس غم کو دور کرنے کے لیے کتب مطالعہ سے دل لگا لیا۔ رات کو سونے سے پہلے کچھ دیر کے لیے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھا کرتا تھا۔

☆......☆......☆

ایک روز فیکٹری سے واپس آ رہا تھا۔ شام ہونے کو تھی میری کوشش تھی کہ جلد از جلد گھر پہنچ جاؤں کیونکہ آسمان کو سرخ بادلوں نے گھیر رکھا تھا۔

یکا یک میری نظر سامنے پڑی تو سڑک کے ایک طرف پُرسکون گوشے میں ایک ضعیف العمر شخص پرانی کتب کا ڈھیر لگائے خود بھی غرق مطالعہ تھا۔

کتابوں کو دیکھ کر میری حالت عجیب سی ہونے لگی۔ گو کہ مہینے کا آخر چل رہا تھا اور جیب میں پیسے بھی تھوڑے تھے۔ مگر شوق اور جنون کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔ اُن کتب کی ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ یہ ادب اور افسانوں کی کتابیں نہیں تھیں۔ بلکہ وہاں موجود زیادہ تر کتب وظائف پر مشتمل تھیں۔ ہندی، بنگالی، اسلامی وظائف دیکھ کر میری دلچسپی مدہم پڑ گئی۔

اٹھنے ہی لگا تھا کہ ایک کتاب پر نظر پڑی تو دوبارہ سے بیٹھ گیا۔

''اسم اعظم'' نامی بھی پُرکشش تھا اور فہرستِ مضامین بھی سحر انگیز تھی۔ نا جانے کن کن اولیاء کرام کے اسم اعظم سے مستفید ہونے کے واقعات سے بھری کتاب نے مجھے گرد و پیش سے بیگانہ کر دیا۔

حالانکہ آسمان سرخ تھا اور آندھی کا غبار بھی



اب زمین کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

جیسے جیسے کتاب پڑھتا جارہا تھا میری دلچسپی دو چند ہوتی جارہی تھی۔ آندھی شدت اختیار کرنے لگی تو میں نے دکاندار سے اُس کی قیمت معلوم کی۔

وہاں موجود ہر کتاب کی قیمت درج تھی سوائے اس کے......

''300 روپے۔'' دکاندار کا انداز بھی جلالی اور مزاج بھی رعب دار لگا۔

''جناب...... کچھ کم نہیں ہوسکتے۔'' اُس کی جلالی شخصیت سے مرعوب ہوکر میں ادب سے بولا۔

''نہیں......ایک روپیہ بھی کم نہیں ہوگا۔ اور جس کتاب کو خریدنا چاہو رعایت مل سکتی ہے مگر اس کتاب کی قیمت کم نہیں ہوگی۔'' اُس شخص کی آنکھیں گویا سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

میں اپنی پچیس سالہ زندگی میں بہت سے کتب فروش سے ملا تھا مگر اس طرح کی ہیبت کسی میں نہ پائی تھی۔ مجھے اُس شخص کی ذات پُراسرار سی لگنے لگی تھی۔

''کیوں اس کتاب میں ایسا کیا ہے جس کی وجہ سے اِس کی قیمت کم نہیں ہوسکتی۔'' میری جیب میں اُس وقت ساڑھے تین سو روپے تھے مگر میں نے جھوٹ بولا کہ میرے پاس صرف دوسو روپے ہیں انسان تھا اور ہر انسان کی طرح میری بھی خواہش تھی کہ چیز بھی حاصل ہوجائے اور جیب میں بھی سو پچاس روپے رہ جائیں۔

''نہیں خریدنی تو مت خریدو...... بیکار میں بحث کرکے میرا وقت ضائع نہ کرو...... ویسے بھی جھوٹوں کا اس کتاب سے کیا لینا دینا۔'' اُس کے اس جملے نے مجھے سرتاپا حیرت میں ڈبو دیا۔ آندھی بڑھتی جارہی تھی اور میں اُس سے کتاب کے معاملے میں اُلجھا ہوا تھا۔

اُس نے اپنی ہر کتاب پر پتھر رکھا ہوا تھا ورنہ ابھی تک آندھی اُس کا یہ خزانہ کتب اپنے ساتھ لے جاتی۔

''جھوٹا......'' اس لفظ نے میرے اندر کے تجسس کو آگ لگادی۔

''ہاں تم جھوٹے ہو...... جیب میں ساڑھے تین سو روپے ہیں مگر پھر بھی غلط بیانی کررہے ہو......'' غصے میں اُس کی آنکھیں سلگنے لگیں۔

اُس نے میری جیب میں موجود رقم کے بارے میں ٹھیک انکشاف کیا تھا ایک لمحے کے لیے مجھے اس کا گیان لرزا گیا۔ کہیں یہ شخص جادوگر تو نہیں میں نے سوچا۔

میری جیب میں کتنے پیسے تھے یا تو میں جانتا تھا یا پھر عالم الغیب پھر اس کو کیسے علم ہوا۔

میں نے خود سے سوال کیا۔ مگر کوئی جواب نہ مل سکا میرے اندر بھی حیرانی و پریشانی موجود تھی۔

''ضرور یہ شخص کالے علوم کا ماہر ہے یا پھر کوئی پہنچا ہوا اللہ والا...... جو یوں اندر کی بات بھی جان گیا ہے۔''

میرے دل نے اندازہ لگایا۔

چونکہ اس کتاب پر میرا دل آگیا تھا اور انسانی فطرت ہے جس چیز پر دل آجائے اُس کو حاصل کرنے کی ضد لگالیتا ہے چاہے دل غریب کا ہو یا پھر امیر کا......

''میاں صاحب...... کچھ رعایت کردیں گے تو مہربانی ہوگی۔''

میں نے التجا کی۔

کیونکہ میں کتاب کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہیں نکلنے دے سکتا تھا۔

''نہیں ...... ہرگز نہیں...... خود بھی مرے گا اور مجھے بھی کتے کی موت مروائے گا۔'' اُس شخص نے اس انداز میں کہا کہ میں سہم کر رہ گیا۔

''میں سمجھا نہیں بزرگو......'' تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر سے پوچھ بیٹھا ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ کتاب لوں اور یہاں سے چلا جاؤں۔

مجھے اب اس بوڑھے کی شخصیت اور باتوں سے خوف آنے لگا تھا آسمان کی سرخی بتا رہی تھی کہ کچھ دیر میں ہی زور دار بارش شروع ہونے والی ہے اور بارش سے پہلے ہر صورت مجھے گھر پہنچنا تھا۔

''اِس کتاب کی اصل قیمت دو سو روپے ہے۔'' وہ نہایت کرختگی سے بولا۔ اُس کی بات پر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''خود بھی جھوٹ بول رہا ہے اور میرے سامنے یوں ظاہر کر رہا ہے کہ جیسے اِس دنیا کا واحد سچا انسان یہ ہے۔''

''مگر اِس کی زکوٰۃ سو روپے ہے۔'' اُس نے انکشاف کیا۔

''زکوٰۃ ...... کتاب کی زکوٰۃ۔'' میں ناسمجھی سے بولا۔

''ہاں زکوٰۃ ...... اِس کتاب کی زکوٰۃ...... اس میں موجود وظائف کی زکوٰۃ......'' اُس نے میری کم علمی پر مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''بیوقوف شخص...... وظائف والی کتب کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑتی ہے ورنہ ان جلالی وظائف کے موکلوں کی طرف سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بیچنے والے کو بھی اور خریدنے والے کو بھی......'' وہ شخص اب بارش کی وجہ سے اپنی کتب سمیٹنے لگا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے جیب سے روپے نکالے اور جلدی سے اُسے تھما کر کتاب خریدی اور اپنے کوٹ کی اندر والی جیب میں ڈالا تاکہ بارش میں بھیگ بھی جاؤں تو کتاب پھر بھی محفوظ رہے۔ میں اٹھ کر جانے لگا تو اُس کی ندا نے میرے قدم روک دیے۔

''اس کتاب کا جب بھی کوئی وظیفہ کرنا پہلے کسی نہ کسی غریب کو کچھ ضرور دے دیا کرنا ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا خدشہ ہوتا ہے اور......''

وہ ابھی مزید کچھ کہنا چاہ رہا تھا تو میں اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

''اور یہ کہ اسے بے وضو نہ پڑھنا ورنہ ایسا ہی طوفان بیکار میں مخلوق خدا کو تیری وجہ سے ستائے گا۔'' اُس نے خاصی گہری بات کی مگر مجھے اُس کی کسی بات میں دلچسپی نہیں تھی کیونکہ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا اس لیے مجھے اب اُس کی غیر ضروری باتوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے اُسے مزید کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر قدم بڑھا دیے میں یوں خوش تھا گویا کہ ہفت اقلیم ہاتھ لگ گئی ہو۔

☆......☆......☆

رات کافی بیت چکی تھی۔ بارش تھم چکی تھی مگر سردی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا کہ لحاف کے اندر بھی میں کانپ رہا تھا میں نے کوئلوں کی انگیٹھی جلالی ہم غریبوں کے لیے یہی ہیٹر ہوتا ہے جب تک کوئلے دہکتے رہیں بدن اور کمرہ دونوں گرم رہتا ہے جیسے ہی کوئلے ٹھنڈے ہو جائیں تو پھر سے سردی غریبوں پر قہر بن کر ٹوٹتی ہے۔ رات کو سونے سے پہلے جب کتاب نہ پڑھ لوں مجھے

نیند نہیں آتی۔ گویا کہ یہ میری نیند کی گولی تھی اور آج تو میں نے پورے تین سو روپے میں مہنگی والی نیند کی گولی خریدی تھی۔

میں نے کتاب کھولی ہی تھی کہ باہر عجیب سا شور سنائی دینے لگا...... سائیں سائیں کرتی ہوا کا شور...... حالانکہ عام مشاہدہ ہے کہ آندھی ہمیشہ مینہ برسنے سے پہلے آتی ہے مگر یہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا کہ مینہ برسنے کے بعد بھی آندھی آ رہی تھی۔

دیوانی جنونی ہوا مٹی کے کچے گھروں کو صحن میں پٹخنے لگی تھی۔ چھتوں پر پڑے کاٹھ کباڑ کو ایک چھت سے دوسری چھت پر پھینکنے لگی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ طوفان میں شدت آتی جا رہی تھی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو سرخ آندھی ریگ و خاک سے بھرپور تھی اور ہر شے کو غائب کر کے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ کھڑکیاں اور روشن دان تو یوں جیسے ٹوٹنے کے قریب تھے۔

''یا اللہ خیر...... پھر سے آندھی چل پڑی۔''

اماں کی آواز ساتھ والے کمرے سے ابھری کیونکہ آندھی کی مہربانی نے بجلی بھی غائب کر دی تھی۔

میں نے لائٹر نکالا اور مصنوعی اجالا پھیلایا۔ کتاب ابھی بھی کھلی وہیں پڑی تھی۔ جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔ ہواؤں پہ تو پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔

''اس کتاب کو بے وضو نہ پڑھنا' ورنہ مخلوق خدا کو تمہاری وجہ سے مصیبت سہنی پڑے گی۔'' اس کتاب فروش کی بات یاد آئی تو میں نے کتاب بند کر دی۔ اُسی لمحے آندھی تھم گئی اور ہوائیں ٹھرا سی گئیں۔ ساتھ ہی لائٹ بھی آ گئی تھی۔ یہ خیال یا گمان نہ تھا بلکہ حقیقت اظہر من الشمس کی طرح روشن تھی جیسے میں بچشم سر دیکھ رہا تھا۔ آندھی کے قدم اکھڑے اور پھر وہ انہی قدموں پر واپس پلٹ گئی تھی۔ جیسے کوئی بلا ادھم مچاتے ہوئے کسی کے قابو میں آ جائے اور اپنی تباہ کاریوں سے باز آ جائے۔ یہ بات بالکل بھی غیر اہم نہ تھی جتنی میں اسے سمجھ رہا تھا۔

میرے دل میں ابھی بھی شکوک و شبہات تھے۔ دل کے ترازو میں کتاب فروش کی بات نہایت ہلکی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ سب میرا وہم ہو یا پھر اتفاق...... اس بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میں خواہ مخواہ توہم پرستی کا شکار ہو رہا ہوں۔ میرے تجسس نے مجھے ایک بار پھر تجربے کی طرف مائل کیا...... میں نے کتاب کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے کھولا تو صحن میں آندھی کا شور سنائی دیا۔

ہوائیں بھیانک انداز میں سرسرا رہی تھیں۔ یوں جیسے آسمان سے دیوہیکل مخلوق اتری ہو اور کمزور مخلوق کو بے دردی سے پٹخ رہی ہو۔ ابھی میں غور و فکر کر ہی رہا تھا کہ اماں کی زوردار چیخ دل دہلا گئی۔

میں کتاب کو چھوڑ چھاڑ کر باہر بھاگا تو باہر کا منظر دیکھ کر دل ڈوبنے لگا۔ اماں رفع حاجت سے فارغ ہو واپس آ رہی تھیں کہ ساتھ والے گھر کی چھت سے لکڑی کا مضبوط تختہ آ گرا۔

جان تو بچ گئی مگر ٹانگ پر گہرا زخم آیا تھا۔ اماں درد سے بے حال روئے جا رہی تھیں۔ اس دوران آندھی کا طوفان ایک پل کے لیے بھی نہ تھما تھا۔ میرا دل مجھے کوسنے لگا۔ معمر کتاب فروش کی بات سچ تھی میں تیزی سے کمرے کی طرف بھاگا اور ایک پاک کپڑے سے کتاب پکڑ کر بند کر دی تو آندھی رک گئی۔

واقعی کتاب بہت حیرت انگیز تھی اس ترقی یافتہ دور میں یہ سب میرے لیے بہت حیران کن تھا۔ واقعی میری ذرا سی بے احتیاطی مخلوق خدا کی اذیت کا باعث بنی تھی۔ اب مجھے کسی تجربے کی ضرورت نہ تھی۔ اماں بے چاری زخمی ہوگئی تھیں۔ مجھے کتاب سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

انسانی فطرت ہے کہ جس چیز کو پانے کے لیے تڑپتا ہے اس کے مل جانے پر فوراً بیزار بھی ہو جاتا ہے۔ میرا دل تین سو روپے برباد کرنے پر مجھے ڈپٹ رہا تھا۔

میں نے فوراً فیصلہ کرلیا کہ میں یہ کتاب اُس کتاب فروش کو واپس کردوں گا اور بدلے میں کوئی اور کتاب لے لوں گا۔

☆......☆......☆

اگلے روز فیکٹری سے فارغ ہوتے ہی میں سڑک کے اُس طرف چل پڑا جہاں وہ بوڑھا کتاب فروش کتابیں سجائے بیٹھا تھا۔ مگر آج وہ گوشہ خالی تھا میرے اوپر اوس گرگئی۔ میں جلد از جلد اس کتاب سے جان چھڑانا چاہتا تھا مگر نا جانے تقدیر کو کیا منظور تھا اگلے پانچ چھ دن وہ شخص مجھے نظر نہ آیا۔ بہت سے لوگوں سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ میں مایوس ہوگیا تھا اور اُس کی تلاش ترک کردی۔

☆......☆......☆

میں نے اُس کتاب کو ایک خاکی لفافے میں حفاظت سے بند کر کے اپنی کتابوں والی الماری میں چھپادیا تھا۔ اُسے خرید کر مجھ سے غلطی ہوگئی تھی مگر اب میں کوئی بھی بے احتیاطی کر کے کوئی نقصان نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اُسے رکھ کر تقریباً بھول ہی گیا تھا کہ 'اسم اعظم' نام کی کوئی کتاب میرے کمرے میں موجود ہے۔ علاج معالجے کے بعد اماں اب کافی بہتر ہوگئی تھیں۔ اُن کی تکلیف دیکھ کر بے حد شرمندہ ہوتا جس کا ذمے دار میں تھا۔

میں نے کتاب فروش کو بہت ڈھونڈا وہ نا جانے یوں اچانک کہاں غائب ہوگیا تھا شاید بیمار ہو چکا ہو یا پھر اپنی عمر کی نقدی تمام کر چکا ہو۔ ایسے کئی خیالات میرے دل میں آتے رہتے......

ایک رات فیکٹری سے آتے ہوئے دیر ہوگئی۔ ابھی گھر سے کچھ دور ہی تھا کہ راستے میں خشک میوہ جات کے ٹھیلے پر نگاہ پڑی تو وہیں رک گیا۔

میوہ جات کافی پڑے تھے پر ہم غریبوں کو صرف مونگ پھلی خریدنے کی اجازت کاتب تقدیر نے دے رکھی ہے باقی مہنگے میوہ جات تو امیروں کے لیے اُتارے گئے ہیں۔

ایک تلخ سوچ کو جھٹکتے ہوئے میں نے مونگ پھلی خریدی ابھی جیب سے پیسے نکالنے ہی لگا تھا کہ ایک بے اختیار آسمان کی جانب نظر اٹھ گئی۔ سرخ انگارہ آسمان آندھی اور جنوبی ہواؤں کی زد میں نظر آیا تو میری حیرت دو چند ہوگئی۔ ابھی تو موسم بالکل ٹھیک تھا یہ سب آناً فاناً کیا ہوگیا۔

''بھائی جلدی پیسے دے دیں...... بہت زور کی آندھی چلنے والی ہے۔'' ریڑھی والا موسم کے تیور دیکھ کر عجلت میں بولا۔

اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے درخت کا بھاری بھرکم تنا ٹوٹا اور ریڑھی والے پر گرگیا۔ وہ ایک دلخراش چیخ مار کر گر پڑا۔ وہ بہت زیادہ زخمی ہوگیا تھا اِدھر اُدھر کے لوگ اُسے اسپتال لے جانے کا بندوبست کرنے لگے اور میں حیران و پریشان گھر کی طرف چل پڑا۔ آندھی شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ میں قدم جتنا آگے بڑھاتا اتنی ہی

شدت سے پیچھے دھکیلا جا رہا تھا۔ راستے آندھی میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ جیسے میں کسی ریگستان میں چل رہا ہوں جہاں ہر طرف ریت ہی ریت کا طوفان تباہی مچا رہا تھا۔ گھر کے قریب پہنچا تو احساس ہوا کہ آندھی کا اصل مرکز میرا گھر تھا۔

میں نے دروازے پر دیوانہ وار دستک دی مگر کوئی کھولنے نہ آیا۔ شور ہی اتنا زیادہ تھا کہ شاید سب اندر خوفزدہ دبکے بیٹھے ہوں گے۔

''اماں...... اماں دروازہ کھولو۔'' میں نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹتے ہوئے آوازیں دیں......

آخر اللہ اللہ کر کے دروازہ کھلا میں اپنے کمرے کی جانب لپکا تو کمرے کا منظر میرے ہوش اڑا گیا۔ میری چھوٹی بہن کے ہاتھ میں وہی کتاب 'اسم اعظم' تھی جس کے مطالعے میں وہ محو تھی۔ میرے تو پیروں تلے زمین ڈول گئی۔

''اوہ تو یہ سب اس کتاب کی کارستانی تھی۔''

یہ خیال ذہن میں کوندا تو میں نے جھپٹ کر بہن کے ہاتھ سے کتاب لی تو اُس کی محویت ٹوٹی۔

''کس نے کہا تھا بغیر اجازت میری الماری سے کتاب نکالو...... بولو......'' میں نے اُسے غصے سے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

تو وہ خوفزدہ ہو کر رونے لگی۔ وہ بھی میری طرح مطالعے کا شغف رکھتی تھی۔ اور میری اجازت کے بغیر بھی میری کتابیں اکثر پڑھ لیتی تھی اور میں نے کبھی نہیں ٹوکا تھا۔ مگر آج بات دوسری تھی اور وجہ میں اُسے نہیں بتا سکتا تھا۔ جو ابھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''بھائی...... غلطی ہو گئی اب نہیں چھیڑوں گی آپ کی کوئی کتاب......'' وہ بے چاری سہم کر بولی۔

وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ میں اُسے کتابوں کو ہاتھ لگانے سے منع کر رہا ہوں۔ حالانکہ میں صرف اُس پُراسرار کتاب کو ہاتھ لگانے سے منع کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

آندھی مکمل طور پر رک چکی تھی ہر طرف سکوت ہی سکوت چھایا تھا۔ نصف الیل بیت چکی تھی۔ مگر اُس غریب ریڑھی والے کا خیال مجھے سونے نہیں دے رہا تھا۔ اماں کے بعد یہ دوسرا شخص اُس کتاب کو غلط طریقے سے استعمال کرنے پر شکار ہوا تھا۔

میرا دل' احساس ندامت مجھے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ وہ غریب شخص نا جانے کب تک تکلیف اٹھائے گا رہ رہ کر اُس کی اذیت مجھے غم زدہ کر رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اُس کتاب کو حفاظت سے الماری میں رکھ کر میں نے معصیت والے غار کے دہانے پر پتھر رکھ دیا تھا۔ مگر یہ میری غلط فہمی تھی کوئی بھی میری غیر موجودگی میں اُسے نکال کر پڑھ سکتا تھا اور نتیجہ کسی نہ کسی تباہی کی صورت میں نکلتا۔

میرے دل میں اُلٹے سیدھے خیالات آنے لگے کہ اُس کتاب کو جلا دوں یا پھر دریا میں پھینک آؤں' ابھی انہی سوچوں میں تھا کہ اذان سحر بلند ہوئی تو میں نے وضو کیا اور نماز ادا کی۔ کتاب ابھی بھی میرے سرہانے کے نیچے پڑی تھی۔ سوچا با وضو تو ہوں اب پڑھ کر دیکھتا ہوں دل میں خوف لیے لرزتے ہاتھوں سے کتاب تھامی' دھیان سارا اُس طوفان کی طرف تھا جو ایکدم اور نا جانے کہاں سے آ جاتا تھا۔ دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ مگر آج نہ تو طوفان آیا اور نہ ہی آندھی'

میرا خوف کچھ کم ہوا اُس بوڑھے شخص کی بات کی تصدیق ہو چکی تھی کہ باوضو کتاب کو پڑھنا اولین شرط تھی۔

میں نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ وہ مختلف وظائف سے بھری ہوئی تھی۔ بہت سے جلالی وظائف جو بہت جلیل القدر اولیاء کرام کے تھے مصنف نے کسی خزانے کی طرح اُس کتاب میں محفوظ کیے تھے۔ دلی مراد جلد برآئے...... پسند کی شادی...... اولادِ نرینہ کا حصول' زیارت ارواح' کشف القبور' روزی و رزق کے تیر بہدف وظائف و عملیات...... ایک رات' تین راتوں' یا پھر گیارہ راتوں کے وظائف تحریر تھے۔ ساتھ ہی اُن کی شرائط اور احتیاط' ترک جمالی اور ترک جلالی کے ساتھ ادائیگی زکوٰۃ کا بھی ذکر مفصل انداز میں کیا گیا تھا۔ دل سے کم ہوتا خوف میری کتاب میں دلچسپی بڑھا گیا۔ یہ کتاب خاصی کارآمد تھی اور شرط بہت معمولی تھی یعنی باوضو ہونا ضروری تھا۔

☆......☆......☆

میرا روز کا معمول بن گیا تھا کہ عشا کی نماز پڑھ کر حاجاتِ ضروریہ سے فراغت کے بعد کتاب لے کر بیٹھ جاتا...... کتاب میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ جب تک پڑھ نہ لیتا۔ میرا دماغ اُسی میں اٹکا رہتا کتاب میں وظائف اور اُن کے ثمرات کا ذکر خوبصورت و دلچسپ انداز میں کیا گیا تھا گویا اُس کا لفظ لفظ مجھے پکارتا تھا' بلاتا تھا' کئی دفعہ ارادہ باندھتا کہ چھوٹا موٹا وظیفہ شروع کروں مگر پھر ارادہ ترک کر دیتا مگر چند دنوں بعد ہی ایک مشکل نے میرے ارادے کو ہوا دے دی۔ فیکٹری میں بہت سے ملازمین کو نکالا جا رہا تھا اُن میں میرا نام بھی شامل تھا۔

میرے پاس نہ کوئی بڑی سفارش تھی اور نہ ہی پیسہ...... جو میری نوکری بچ جاتی۔ سو اس مشکل گھڑی میں 'اسمِ اعظم' کو مددگار پایا۔ تین راتوں کا ہلکا سا وظیفہ مقرر کیا اور تکرار بھی شروع کر دی۔ سب شرائط کے ساتھ زکوٰۃ بھی ادا کر دی۔ ابھی ایک ہی دن گزرا تھا کہ چمتکار ہو گیا۔ اُس فہرست میں سے اچانک ہی میرا نام نکال دیا گیا تھا۔ جن کو فیکٹری سے نکالا جا رہا تھا۔ میں حیران بھی تھا اور خوش بھی' ہر کوئی مجھے رشک و حسد سے دیکھ رہا تھا میرے ہاتھ گویا نسخۂ کیمیا لگ گیا تھا۔

☆......☆......☆

اس کتاب کے ساتھ میری وابستگی اور اُس کے وظائف پر میرا اعتقاد بڑھتا گیا۔ وہ کتاب میری متاعِ عزیز بن چکی تھی۔ جسے میں سب کی نظروں سے چھپا کر بہت احتیاط سے رکھا کرتا تھا۔ بہنوں کو سختی سے تائید کی کہ میری اجازت کے بغیر میری کسی کتاب کو ہاتھ نہ لگائیں۔ اماں ابا کو ویسے ہی کتابوں سے دلچسپی نہ تھی سو اُن کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ چھوٹے موٹے وظائف کر کے کئی مقاصد میں کامیابی حاصل ہوئی تو میرا حوصلہ بڑھ گیا۔

اب میں گھر کے حالات سدھارنے کی طرف متوجہ ہوا گھر میں ہمیشہ غربت و افلاس کو ہی حکومت کرتے دیکھا تھا۔ خوشحالی تو گویا ہمارے نصیب میں ہی نہیں تھی۔ میں خوشحال ہونا چاہتا تھا اور اپنے گھر والوں کو بھی آسودہ و خوش باش دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر دولت کے بغیر یہ سب ممکن نہیں تھا میں نے کتاب میں رزق کے وظائف اور عملیات دیکھے غور کرنے پر انکشاف ہوا کہ اِن سے متعلق عمل سخت بھی تھے اور طویل المدت بھی تھے۔

اُن کی شرائط بھی سخت تھیں ان وظائف میں

خاص طور پر درج تھا کہ کسی مرشد کی رہنمائی کے بغیر وہ ہرگز نہ کیے جائیں ورنہ نقصان کا خدشہ تھا۔ مگر میرے سر پر تو دولت اور رزق کی فراوانی کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ بہت فاقوں میں زندگی گزاری' اب خوشحالی پر ہم غریبوں کا بھی حق تھا۔

سو اس خواہش کے پیش نظر میں نے ایک وظیفہ مقرر کیا' جو میرے مطابق آسان بھی تھا اور گیارہ راتوں کا تھا۔

☆......☆......☆

پہلی رات پُرسکون گزر گئی تھی کوئی اچھا یا برا واقعہ پیش نہ آیا میرا حوصلہ مضبوطی پکڑنے لگا' اور میں دل ہی دل میں اس ہدایت کا تمسخر اڑانے لگا کہ اگر مرشد میسر نہ ہو تو وظائف نہ کریں۔

تین رات میں بیت گئیں۔ چوتھی رات عشاء کے بعد میں پڑھائی میں مگن تھا میری آنکھیں بند تھیں۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ سارے شہر میں برفباری ہو رہی ہو گھر والے لحافوں میں مزے سے سو رہے تھے مگر میں دل میں اُن کی خوشحالی کی تمنا لیے ٹھنڈے فرش پر بیٹھا ورد کر رہا تھا۔ میں عمل شروع کرنے سے پہلے دروازہ بند کر لیتا تھا تا کہ کوئی اندر آ کر خلل نہ ڈالے۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ باہر صحن میں کچھ شور شرابہ سا ہوا۔ میں نے سوچا کوئی بلی یا چوہا ہو گا میں مسلسل پڑھتا رہا مگر باہر یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایک سے زیادہ لوگ موجود ہوں۔

''شاید گھر والے کوئی کام کر رہے ہیں۔'' میں نے سوچا۔

مگر اگلے ہی لمحے شور میں تیزی آتی گئی کہ میری ساری یکسوئی غارت ہو گئی۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں تعداد غلط نہ ہو جائے کہ کوئی نقصان نہ ہو جائے۔ میں اسی خیال کے تحت اٹھا اور دروازہ کھول کر جھانکا۔ تا کہ جو بھی ہو اُسے اشارے سے کہہ دوں کہ میں عمل کر رہا ہوں...... شور نہ کرو...... مگر کچھ کہنے کی نوبت ہی نہ آئی اور میری آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ سخت سردی میں پسینے چھوٹ گئے اور بدن لرزنے لگا۔ ہاتھ سے تسبیح چھوٹ کر گر پڑی اور میں تعداد بھی بھول گیا۔ باہر تین دیوہیکل مرد کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں عجیب وغریب سے ہتھیار تھے جنہیں وہ آپس میں ٹکراتے تو بھیانک سا شور بلند ہونے لگتا۔

میں پتھر کا بت بنا انہیں دیکھ رہا تھا اور وہ اپنی اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے اور ساتھ ساتھ وہ بھیانک شور بھی بلند کرتے تھے۔ وہ شور اتنا بھیانک تھا کہ لگتا تھا کہ دل بند ہو جائے گا اور سانس رک جائے گی۔ میں حیران تھا کہ اُن کی آمد اور اُن کا شور وغل باقی گھر والوں کو کیوں سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے کمرے کی جانب قدم بڑھانے لگے۔ میرا وجود بے دم سا ہونے لگا۔ میں نے فوراً کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور خوفزدہ سا ہو کر ایک کونے میں دبک گیا۔ مجھے رونا آ رہا تھا۔ اُن کی خوفناک موجودگی دل لرزا رہی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ابھی وہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوں گے اور مجھے مار دیں گے۔ میرا دل چاہا گھر والوں کو آوازیں دوں مگر خوف کے مارے آواز ہی حلق سے نہ نکلی۔ اُن کے ہتھیار بجانے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

''وہ لوگ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ داخلی دروازہ تو بند تھا پھر وہ اندر کیسے داخل ہوئے۔'' کتنے ہی پل اسی غور وفکر میں گزر گئے۔ اذان سحر مسجد کے محرابوں سے بلند ہوئی تو باہر کا

شور بھی تھم گیا۔ خوف کے مارے میرا عمل ادھورا رہ گیا تھا مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس بات کے نقصانات میں اگلے دنوں میں دیکھوں گا۔ میں لرزتے قدموں سے اٹھا اور دروازے کی جھری سے جھانکا، باہر اب کوئی نہ تھا، صحن خالی تھا۔

''کیا میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا۔''

میں اماں ابا کے کمرے کی جانب بھاگا کہ کہیں اُس خوفناک مخلوق نے انہیں نقصان تو نہیں پہنچایا مگر وہاں خیریت تھی۔ اماں نماز پڑھ رہی تھیں۔ ابا اور بہنیں سو رہی تھیں میں نے سکون کا سانس لیا۔

''اماں آپ کو رات کو کوئی شور سنائی دیا تھا؟'' اُس خوفناک منظر کی تصدیق کے لیے اماں سے پوچھا۔

مگر اماں کے انکار نے میرا خوف بڑھا دیا۔

☆......☆......☆

دن بھر میرا دماغ منتشر رہا۔ میں کسی سے اپنی پریشانی کا ذکر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ جو بھی سنتا وہ مجھے دیوانہ یا وہمی کہہ کر میرا مذاق اڑاتا۔ ویسے بھی اس ترقی یافتہ دور میں ایسی باتوں کو کون مانتا ہے جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلنے لگا مجھے وہ بھیانک منظر یاد آنے لگا۔ میرا وظیفہ پڑھنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا مگر عمل ادھورا ابھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ سو ہمت کر کے میں بیٹھ گیا۔ ابھی پڑھائی کرتے آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ پھر سے صحن میں وہی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کل کی نسبت آج شور بے حد زیادہ تھا۔ میرا وجود خوف کی لپیٹ میں آ کر لرزنے لگا۔ میرے اندر ہمت نہیں تھی کہ میں دروازہ کھول کر دیکھتا۔

''اماں...... ابا...... گڑیا'' میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخا مگر آواز حلق میں رہ گئی۔ میری روح بدن میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی تھی۔ بے بسی سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سوال بہت سے تھے مگر کسی کا بھی میرے پاس جواب نہ تھا۔ اور نہ ہی کوئی رہنمائی کرنے والا تھا۔ بیٹھے بٹھائے زندگی ایک نئی مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ باہر آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں میں نے کمرے کی لائٹ آف کر دی تا کہ دروازہ کھول کر اگر باہر جھانکوں تو وہ مجھے نہ دیکھ پائیں۔ مگر یہ میری کم عقلی تھی۔ دروازے کی جھری سے میں نے جھانکا تو نیا منظر دیکھ کر میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اور جب آنکھ کھلی تو اجالائے سحر پھیل چکا تھا۔ سب گھر والے میرے ارد گرد بیٹھے رو رہے تھے۔ سب مجھ سے وجہ پوچھتے رہے مگر زبان تو جیسے گونگی ہو گئی تھی۔ رات کا منظر پوری جزئیات کے ساتھ اپنی وحشتوں سمیت میرے دماغ میں تازہ ہونے لگا۔

تین سیاہ پوش دیو ہیکل وجود جن کی آنکھیں لہو رنگ تھیں۔ دونوں ہاتھوں میں زنجیریں تھامے شدت سے آپس میں ٹکرا رہے تھے کہ بڑے سے بڑے دل والا سہہ نہ پاتا۔ اُن کی بھیانک سرخ آنکھیں میرے دروازے کی جانب لگی تھیں۔ جیسے ہی میں نے باہر جھانکا انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور میرے کمرے کی جانب پیش قدمی کرنے لگے تھے۔ اُن کا حال حلیہ اور شکلیں کل والی مخلوق سے بھی زیادہ بھیانک تھیں اور زنجیروں کو ٹکرانے سے جو آواز پیدا ہوتی وہ بھی ہیبت ناک تھی۔

☆......☆......☆

میرا دل خوشحالی کی تمنا اور عمل کو جاری رکھنے سے اب مکمل طور پر بیزار ہو چکا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ عمل ترک کر دوں۔ مگر کیا جانتا تھا کہ میں ایسے راستے پر قدم رکھ چکا تھا جہاں سے

ا ایسی مکمل نہیں ہوتی ہے اور منزل صرف موت
ہوتی ہے۔ دن بھر نقاہت اور بخار کے باعث گھر
ہی رہا۔ سردی کا زور تھا ہر شے منجمد دکھائی دے
رہی تھی برف کی مانند...... میں نے کھانا کھایا اور
دوا کھا کر سو گیا۔

رات کو اچانک کسی کی موجودگی کا احساس
مجھے جگا گیا۔ کمرے میں نیلی روشنی کا بلب جل رہا
تھا کمرے کی ہر شے پتھرائی ہوئی لگ رہی تھی۔
آنکھوں کو رگڑتے ہوئے میں نے اندھیرے میں
غور سے دیکھا تو زوردار چیخ مار کر رہ گیا۔ سب گھر
والے دوڑے چلے آئے۔ وہ سب مجھ سے وجہ
پوچھ رہے تھے اور میں بس خوف سے روئے
چلا جا رہا تھا۔ وہ سمجھے کہ شاید میں کوئی برا خواب
دیکھ کر ڈر گیا ہوں مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ کمرے
کے خاموش گوشے میں لکڑی کی کرسی پر میرا ہم شکل
بیٹھا مجھے غضبناک تیوروں سے گھور رہا تھا۔ وہ
بالکل میں تھا۔ میرے جیسے لباس میں تھا وہ خاموشی
سے اٹھا اور میری طرف بڑھنے لگا۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے تکتا جا رہا
تھا۔ مجھے لگا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں وہ میرا
ہم شکل میرے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اُس نے
دونوں بازو اٹھائے جیسے میری گردن دبانے والا
ہو، مگر یہ کیا اُس کے تو دونوں ہاتھ ہی نہیں تھے۔
یہ دیکھ کر میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

میری زندگی سے سکون ختم ہو گیا تھا۔ میں جو
سمجھ رہا تھا کہ اپنی مرضی سے کوئی عمل کروں گا اور
جب دل چاہے گا چھوڑ دوں گا۔ یہ اتنا سہل نہیں تھا
جیسا کہ میرے جیسے نادان جان لیتے ہیں۔ پورا
دن خوف میں گزرا اور رات کو کوئی نا کوئی واقعہ
مجھے نڈھال کر جاتا...... نا جانے میرے ساتھ یہ
سب کیوں ہو رہا تھا۔ فیکٹری سے بھی آئے روز
چھٹیاں کرنے لگا تھا گھر میں تنگی و بے برکتی بڑھنے
لگی۔ اماں ابا کے ہر روز جھگڑے ہونے لگے
جنہوں نے کبھی اونچی آواز میں ایک دوسرے
سے بات نہ کی تھی۔ میری دونوں بہنیں ایک
دوسرے کی جانی دشمن بن بیٹھیں۔ ذرا سی بات پر
مرنے مارنے پر تل جاتیں۔ خوشحالی کی تمنا کرنا
میرے لیے سزا بن گئی تھی۔

رات تو اتنی تکلیف دہ ہو گئی تھی کہ اُس کے
تصور سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ پھر ایک نیا
سلسلہ شروع ہوا کہ سب گھر والے گھبرا گئے۔
میں جیسے ہی کھانا کھانے بیٹھتا تو عجیب سی
بھنبھناہٹ جو غیر واضح ہوتی پھر واضح ہونے لگتی۔

''روٹی دے نا......'' ایک کمزور سی مردانہ
آواز سنائی دیتی۔ میں چاہے گھر ہوتا یا باہر...... یہ
آواز میرا ہر جگہ تعاقب کرنے لگی۔

''روٹی دے نا...... دے نا روٹی۔'' آواز
صرف مجھے سنائی دیتی تھی باقی لوگوں سے پوچھتا تو
وہ لاعلمی کا اظہار کرتے۔

پہلے پکار سنائی دیتی رہتی، پھر دیکھتے دیکھتے ہی
سارا میرا کھانا کوئی نادیدہ مخلوق کھا جاتی...... گھر
والے حیران رہ جاتے مگر وہ نادیدہ مخلوق مجھے کچھ
کھانے نہ دیتی۔

میں کمرے میں چھپ کر کچھ کھاتا تو وہ نادیدہ
مخلوق کو جانے کیسے خبر ہو جاتی۔ اور وہ میرا سارا
کھانا کھا جاتی، پھر اُس آواز کے ساتھ دو ہاتھ بھی
نظر آنے لگے۔ جیسے وہ بھیک مانگ رہے تھے۔
وہ آواز اور وہ ہاتھ ہر جگہ میرے تعاقب میں
رہتے۔ میری زندگی عذاب بن گئی تھی۔ بھوکا رہ رہ
کر میں کمزور اور نڈھال رہنے لگا تھا۔ رات بھر
صحن میں زنجیر زنی ہوتی۔ میرا ہم شکل مجھے

اندھیرے میں خونخوار انداز میں گھورتا رہتا۔ اور صبح ہوتے ہی یہ صدا 'روٹی دے نا' نے میری زندگی اجیرن کردی تھی۔

☆......☆......☆

ایک دن دوپہر کو میں بھوک و پیاس سے نڈھال بیٹھا تھا۔ میں نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ آج میں کچھ کھانا کھا کر ہی دم لوں گا۔ میں نے ایک ہوٹل سے کھانا خریدا اور وحشیوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ دو لقمے ہی حلق سے اترے تھے کہ وہی صدا گونجنے لگی۔

"روٹی دے نا...... دے نا روٹی......" آج مجھ پر بھی جنون سوار ہوگیا تھا کہ کچھ بھی ہوجائے میں اپنا کھانا اُس نادیدہ مخلوق کے حوالے نہیں کروں گا۔ میں اُسے نظرانداز کر کے کھانا کھاتا رہا۔ یہ میری ہٹ دھرمی ہی تھی کہ اب اُس آواز میں التجاء کی بجائے دھمکی محسوس ہونے لگی تھی۔ کوئی بھیڑیے کی طرح غرا رہا تھا۔ وہ ہاتھ مچل رہے تھے۔ مگر مجھے آج کسی بات کی پرواہ نہیں تھی میں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا اور فاتحہ انداز سے ان دونوں پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا۔ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ آگے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ایک سیاہ فام حبشی بوڑھا میری نظروں کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے پر جگہ جگہ سے یوں گوشت ادھڑا ہوا تھا جیسے کسی جنگلی جانور نے پنجے مارے ہوں۔ اُس کے چہرے پر زخم اور اُن میں غلیظ پیپ بھری تھی۔ اُس کا پورا جسم کوڑھ زدہ تھا۔ اُس کے جسم سے اٹھنے والی بو اتنی ناگوار تھی کہ میرا دل متلانے لگا۔ سڑے ہوئے گوشت کی بدبو......

"روٹی دے...... روٹی مجھے......!" وہ شخص پوری طاقت کے ساتھ یوں چیخا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اِدھر اُدھر دیکھا لوگ یوں مصروف تھے جیسے نہ تو وہ کچھ سن رہے ہوں اور نہ ہی دیکھ رہے ہوں۔ یعنی وہ صرف مجھے دکھائی دے رہا تھا مجھے سنائی دے رہا تھا۔ اُس کے حلق سے جانور جیسی غراہٹ نکلی۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر بس یہی گردان کرتا جارہا تھا۔

"روٹی دے نا......روٹی دے نا......!"

اُس کی حالت جنونی ہوتی جارہی تھی کہ جیسے آج وہ میرا پیٹ پھاڑ کر کھانا باہر نکال دے گا۔ جو آج میں زور زبردستی سے کھا چکا تھا۔ پھر وہی ہوا خوف و دہشت سے مجھے ایک زوردار قے آئی اور کھانا باہر نکل گیا۔ اور بس یہی نہیں ہوا خون کی دو تین اُلٹیاں کر کے میں ہوش سے بیگانہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

خوراک کی کمی نے میرا بدن ہڈیوں کا ڈھانچہ بنادیا۔ گھر والے میری حالت دیکھ کر ہر وقت روتے رہتے تھے۔ میں جنہیں خوشیاں دینا چاہتا تھا اب انہیں غم دینے کا سامان بنا ہوا تھا۔ مسکراہٹ اُن کے چہروں سے ہمیشہ کے لیے غائب ہوگئی تھی۔ گھر میں یا تو میرا سوگ منایا جاتا یا ہر وقت لڑائی جھگڑے ہوتے۔ اور میں بے بسی سے انہیں لڑتا مرتا دیکھتا رہتا۔ اُس دن کے بعد میں کچھ بھی کھانے کی کوشش کرتا تو خون کی الٹی ضرور آتی۔ میں اپنی زندگی سے تنگ آگیا تھا ایک شام میں گھر سے نکل پڑا تاکہ خود کو ختم کرلوں۔ میں لاغر قدموں اور کانپتے وجود کے ساتھ دریا پر جا پہنچا۔ میری نظر اُسی معمر کتاب فروش پر پڑی جو انتہائی اطمینان سے سڑک کے دوسری جانب کتابیں لگائے محو مطالعہ تھا۔ اُس پر نظر پڑتے ہی میں گرتا پڑتا اُس کی جانب دوڑا اور اُسے اپنی تمام

کتھاسنا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میری حالتِ زار اور تباہی کا تعلق اُس پُر اسرار کتاب سے جڑا تھا جو میں نے اُس شخص سے خریدی تھی۔ میری ساری کہانی سن کر اُس کے چہرے پر رنجیدگی پھیل گئی۔ اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''تم نے ترکِ جمالی (یعنی جھوٹ' فریب' ریاکاری اور بے حیائی جیسی برائیوں سے بچنا)''

''اور ترکِ جلالی (یعنی ہر قسم کی احتیاط لہسن' پیاز' مچھلی' گوشت' انڈا' ہر قسم کی خوراک سے پرہیز صرف جو کی سوکھی روٹی اور پانی) کا خیال رکھا؟''

''نن...... نہیں......''

''عمل ادھورا رہ گیا تھا؟''

''جی......''

''عمل شروع کرنے سے پہلے زکوٰۃ ادا کی تھی؟''

''نہیں......''

''کسی مرشد یا اہلِ نظر کی رہنمائی کے بغیر عمل کیا تھا؟''

''جی......''

سوال سب مختلف تھے مگر جواب سب کا نفی میں پا کر اُس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

''برخوردار...... تم نے اس عمل کی کوئی بھی شرط پوری نہیں کی تھی۔ یہ عملیات و وظائف تو بہت ہی کڑی شرائط اور احتیاط کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ذرا سی بھول چوک تو گلے پڑ جاتی ہے تم نے اپنے مال اور رزق میں برکت کے لیے جو وظیفہ پڑھا یہ سب اُس کے مضمرات ہیں۔ تمہاری بے احتیاطی کی وجہ سے اور آدھے ادھورے علم اور بغیر کسی مرشد و مربی کی رہنمائی کے عمل کرنا تمہیں نفع کی بجائے ضرر پہنچا گیا۔ اور صرف تم ہی نہیں بلکہ تمہارے گھر والے بھی اس کی زد میں آئے۔''

''وہ لوگ جو تمہیں نظر آتے ہیں وہ اس عمل کے موکل ہیں۔ اور وہ تمہارا ہم شکل تمہارا ہمزاد اور وہ کریہہ شکل کا بوڑھا آدمی جو ہر وقت تم سے روٹی مانگتا ہے وہ تمہارا آدھا ادھورا عمل ہے۔ تم اپنا کام ہر طرف سے خراب کر چکے ہو اور اب بہتری کی کوئی صورت نہیں۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

''موکلات اب تمہاری جان نہیں چھوڑیں گے۔'' وہ عمر کی نقدی ختم ہونے کا اشارہ دے گیا۔

☆......☆......☆

میں اب بسترِ مرگ پر پڑا ہر روز ہر رات کو وہی سب کچھ دیکھتا ہوں۔

''روٹی دے نا......'' کی صدا ہر پل ہر لمحے میں ارد گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ میری آپ سب پڑھنے والوں سے التجا ہے کہ کبھی بھی بلا اجازت و رہنمائی خود سے کوئی عمل نہ کریں۔ بڑوں کی باتوں کو سنجیدگی سے لیں۔ اُن کی ہدایات میں ہماری بہتری پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ اسرار بھری راہیں ہرگز آسان نہیں ہیں جتنا ہم آپ سمجھ لیتے ہیں۔ بہترین وظیفہ صرف خدا کے حضور استغفار اور اُس کے محبوب ﷺ پر کثرت سے درود پاک پڑھنا ہے۔

جن سے ہماری تمام جائز حاجات پوری ہو جاتی ہیں۔ میرا انجام ہر ایک کے لیے باعث عبرت ہے۔ میری باتوں کو میری طرح ہی نظر انداز مت کیجیے گا۔ کیونکہ یہ اسرارِ غیب سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

☆☆......☆☆

وہ سرد رات

علی کو کس نے مارا اور فواد کو زمین کھا

گئی یا آسمان...... یہ راز راز ہی رہا

ڈاکٹر جویریہ ندا

"کیا یار حاشر...... تو بھی ناں' اب تک ٹور کے لیے جگہ بھی طے نہیں کر پایا۔" علی نے تکیہ بستر کے دوسرے کونے پر اچھالتے ہوئے کہا۔

"بتا رہا ہوں تجھے' اس بار فیری میڈوز نہیں جاؤں گا' دو بار ہمیں وہاں کے چکر کھلوا چکا ہے۔ ایک بار فارسٹ نہیں دیکھا تو ایک بار بیال کیمپ نہیں دیکھا۔"

"ہاں اور نہیں تو کیا...... تیرے دوست ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ چھ سات گھنٹے Hiking کر کے ہم اپنی ٹانگیں تڑوا لیں اور میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔" فواد نے چپس منہ میں ڈالتے ہوئے شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"تُو کیا چاہتا ہے کہ تیرا بھائی کنوارا ہی مرجائے۔" باتیں جاری تھیں اور حاشر ان باتوں سے بے نیاز اپنے لیپ ٹاپ میں سر دیے بیٹھا تھا گویا ان کی باتوں سے ذرہ برابر بھی اثر نہ پڑتا ہو۔ علی مزید چڑ گیا۔

"حاشر صاحب! ہم ان دیواروں سے نہیں آپ سے مخاطب ہیں۔"

"آں ہاں...... تم لوگ کچھ کہہ رہے ہو' سوری گائز سنا نہیں۔" حاشر نے کان سے ہیڈ فون نکالتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب بولو کیا کہہ رہے ہو؟ خیریت؟" اب تو علی کا پارہ ہائی ہو گیا۔

"ابے تم ہمیں سن نہیں رہے تھے؟ ہم تجھے کیا نظر آ رہے ہیں گائے بکری یا گدھے جو جانوروں کی بولی بول رہے ہیں۔" علی نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں اب تم لوگ اپنے آپ ہی کو جانور کہنے پر تلے ہو تو چلو مان لیتا ہوں۔" حاشر نے ہنستے ہوئے کہا۔ بس پھر کیا تھا علی اور فواد دونوں اس پر پل پڑے۔

"بیٹے اب تجھے بتاتے ہیں کہ جانور کیسے ہوتے ہیں اور گدھے لات کیسے مارتے ہیں۔" ابھی بھی دھینگا مشتی جاری تھی کہ حاشر کی امی نے کمرے کے دروازے پر دستک دی جو چائے لیے کھڑی تھیں۔ کمرے میں یک لخت خاموشی چھا

گئی۔ حاشر کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی اس کی امی سے بہت ڈرتے تھے۔ تھوڑے سخت مزاج کی تھیں پر دل کی بہت اچھی......

حاشر والدہ کے ہاتھ سے چائے کی ٹرے لے کر واپس آیا۔

''ٹینشن نہ لو یاروں...... اس بار Entirely مختلف جگہ پر جائیں گے ایسی جگہ منتخب کی ہے کہ دل خوش ہو جائے گا فل آف ایڈونچر......'' حاشر نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

''اب نام بھی بتائے گا یا ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ کر پہلے وہاں پہنچائے گا اور سرپرائز دے گا۔'' فواد نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو سنو...... کوئٹہ......'' حاشر نے چپس کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اس بار کوئٹہ چلیں گے اور Explore کریں گے اور ہاں اس بار ٹرین سے جائیں گے ہوائی جہاز سے نہیں۔ بولان میل شام پانچ چھ بجے کے قریب کراچی سے نکلے گی اور اگلے دن دو پہر یا شام سے کچھ پہلے ہم کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پہنچ جائیں گے' میں نے سیٹیں بک کروالی ہیں۔ دو دن بعد روانگی ہے' اپنے اپنے سامان پیک کرلو۔'' حاشر سب کچھ ایک سانس میں بول کر خاموش ہو گیا اور چائے کی چسکیاں بھرنے لگا۔ علی اور فواد منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے رہے۔

''کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہو؟'' حاشر نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔

''گریٹ یار تُو تو چھا گیا۔'' علی نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔



''مطلب ہم تجھے پاگل نظر آرہے ہیں ہم سے پوچھے بغیر ڈسکس کیے بغیر جگہ بھی طے کرلی' سیٹیں بھی بک ہوگئیں اور دو دن بعد روانگی بھی کنفرم ہوگئی' کیا بات ہے جناب کی۔'' فواد سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

''مطلب یار کوئٹہ ہی کیوں؟'' فواد نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہم نے پاکستان کے بیشتر علاقوں کو ابھی Explore نہیں کیا خاص کر ناردرن ایریاز لینڈ اسکیپ میں کوئٹہ کے مقابلے میں زیادہ ہریالی ہے پھر کوئٹہ چننے کی خاص وجہ؟''

''یار تم تو جانتے ہی ہو ناں تمہارے اس بھائی کو پُراسراریت سے خاص دلچسپی ہے اور میں نے سنا ہے کہ کوئٹہ میں صرف تاریخی اور تفریح مقامات ہی نہیں بلکہ اس کے آس پاس کے علاقہ جات ان فیکٹ بلوچستان میں کئی مقامات پُراسرار طور پر جانے جاتے ہیں بس ان کو Explore کریں گے۔'' حاشر نے کہا۔

''کیا؟ وہاں جن بھوت ہیں پُراسرار ہے۔'' علی نے چیختے ہوئے کہا اور دوسرے ہی لمحے حاشر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''شش...... شش...... آہستہ بات کرامی نے سن لیا تو قسم سے جانے نہیں دینا ہے اول ہی وہ کوئٹہ کے ہونے والے آئے دن کے واقعات کے باعث میرے جانے کے خلاف ہیں بہت مشکلوں سے منایا ہے جن بھوتوں پر تو مجھے کمرے میں تالا ڈال کر بٹھا دیں گی۔''

''بات سنو......'' علی نے حاشر کا ہاتھ منہ سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''میں بھی یہی کہہ رہا ہوں اس پُراسراریت سے ہٹ کر کوئٹہ کے حالات تیرے سامنے ہیں' آئے دن کے خودکش حملے' بم بلاسٹ اور فائرنگ' ایسے میں ہمارے ماں باپ کیسے اجازت دیں گے۔''

''وہ تم دونوں مجھ پر چھوڑ دو۔'' حاشر نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

''میں بات کرلوں گا۔ تم لوگ بس وہاں جانے کی ہامی بھرو ویسے بھی اس دفعہ ہم بذات خود نہیں ٹور ایجنسی کے ذریعے جا رہے ہیں تو امید ہے کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے پھر ڈن۔'' تینوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

دراصل حاشر' علی اور فواد تینوں بچپن کے دوست تھے اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ساتھ رہے' ایک کلاس' ایک جیسے شوق غرض دیکھنے والے انہیں سگے بھائی سمجھتے تھے۔ تینوں اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے تو شوق بھی کچھ امیروں والے تھے یونیورسٹی کے سمسٹرز ختم ہونے پر کہیں نہ کہیں ایڈونچر والی جگہوں پر یہ تینوں دوست ضرور جاتے۔ حاشر ان میں زیادہ ایکٹیو تھا سو جگہوں کا انتخاب بھی وہی کرتا تھا۔ اس بار حاشر نے کوئٹہ کا انتخاب اس لیے کیا کیونکہ دونوں نے دھمکی دے دی تھی کہ اس بار فیری میڈوز نہیں جائیں گے اگر جانا ہے تو حاشر اکیلا جائے۔ لہٰذا حاشر نے سوچ سمجھ کر کوئٹہ کا انتخاب کیا تاکہ ایڈونچر کے ساتھ ساتھ اس کی حس تجسس کو بھی طمانیت ملتی رہے ٹھیک دو دن بعد وہ تینوں ٹرین کا سفر کررہے تھے راستے بھر خوب انجوائے کیا۔

فیس بک پر گاہے بگاہے تصویریں اپ لوڈ ہوتی رہیں ہنسی مذاق چلتا رہا انہیں کیا خبر تھی کہ یہ سفر آگے چل کر ان کی زندگیاں یکسر تبدیل کر کے رکھ دے گا۔ اگلے دن سہ پہر تک وہ لوگ کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ٹور ایجنسی کا ایجنٹ انہیں وہاں لینے کے لیے پہنچ چکا تھا اور اسی کی گاڑی میں بیٹھ کر وہ براستہ ارباب کرم خان روڈ' کوئٹہ کی حدود میں پہنچ چکے تھے جہاں مقامی ہوٹل میں ان کی رہائش کا بندوبست پہلے ہی سے ہوچکا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر فریش ہوکر ہوٹل کے آس پاس کا علاقے کا مٹر گشت کرنے نکلے تو اس وقت شام ہوچلی تھی' ہوا

میں خنکی بڑھنے لگی تھی۔

یہ نومبر کے اوائل کے دن تھے کوئٹہ میں سردیاں نومبر کے مہینے سے شروع ہو جاتی ہیں لیکن صرف پہاڑیاں برف سے ڈھکنا شروع ہوتی ہیں اور دسمبر و جنوری تک پورا کوئٹہ عموماً برفباری کی زد میں رہتا ہے یاد رہے کہ کوئٹہ سطح سمندر سے 3,510 فٹ کی بلندی پر ہے۔ خیرات ہونے کے پیش نظر وہ تینوں واپس ہوٹل آ گئے جہاں کھانا اور گرما گرم چائے پینے کے بعد وہ تینوں اپنے اپنے لحافوں میں گھس کر سو گئے۔ سفر کی تھکان کے باعث جلد ہی نیند آ گئی۔

اگلے دن سے ان کا ایڈونچر شروع ہوا۔ پہلے پہل دو دن کوہنہ جھیل، لیاقت بازار اور وادی اُڑک وغیرہ گھومتے رہے لیکن حاشر کے لیے خاص کر اس میں زیادہ مزا نہیں تھا۔ اسے تو پُراسرار جگہیں اور ان کی کھوج پسند تھی۔ ان تینوں کی زندگی نے اس وقت موڑ لینا شروع کیا جب وہ کوہِ چلتن سے واپس آئے جہاں اکیلے سفر کرنا منع ہے کیونکہ وہ پہاڑی سلسلہ Haunted کے نام سے مشہور ہے۔

فواد ذرا ڈرپوک قسم کا تھا وہ تو کوہِ چلتن میں ڈر کے مارے گاڑی سے ہی نہیں نکلا۔ کیونکہ ٹورسٹ گائیڈ نے یہ بتایا تھا کہ کوہِ چلتن پر کہا جاتا ہے کہ 40 بچوں کی لاشیں دفن ہوئیں اور ان کی روحیں آج بھی وہاں بھٹکتی ہیں۔ فواد ہی کی وجہ سے باقی دونوں کو جلد ہی واپس ہوٹل آنا پڑا۔ اب رات کا کھانا کھا کر وہ سب ہوٹل کے لان میں بون فائر کے پاس بیٹھے، کوئٹہ کے روایتی بھاپ اڑاتے قہوے کا مزہ لے رہے تھے۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ درمیان میں کوہِ چلتن اور فواد کی بزدلی کا ذکر چھڑ گیا۔

”ویسے سر! انٹرنیٹ گوگل، فیس بک بھرا پڑا ہے کوہِ چلتن کو لے کر کہ یہ ایک Haunted جگہ ہے، لیکن ایک جگہ اور ہے جس کے بارے میں شاید انٹرنیٹ پر بہت زیادہ کچھ نہیں ملے گا۔“ دلاور خان نے بات شروع کی۔ دلاور خان ان کا ٹورسٹ گائیڈ تھا سرخ و سفید تنومند اور مضبوط ذہن کا مالک تھا عمر پینتالیس سے پچاس کے درمیان رہی ہو گی تاہم اچھی صحت کے باعث چالیس کا لگتا تھا۔ اور یہاں کا بہترین ٹورسٹ گائیڈ تصور کیا جاتا تھا۔ حاشر کے کان اس بات پر کھڑے ہو گئے۔

”کیا مطلب؟ کوئی اور بھی جگہ ہے کیا؟“ حاشر نے بے تابی سے پوچھا۔

”سر آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کوئٹہ میں چار پہاڑ مشہور ہیں کوہِ زرغون، کوہِ تکاتو، کوہِ چلتن اور کوہ مردار......“ دلاور خان نے کہا۔

”زرغون گھر اور تکاتو تو پھر بھی بے ضرر ہیں اور کوہِ چلتن البتہ پُراسرار مشہور ہے لیکن بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کوہِ مردار بھی ان میں سے ایک ہے جو اپنے اندر صدیوں سے گہرے اسرار رکھتے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ لگ بھگ انیسویں صدی میں بلوچستان میں ایک مخلوق مم Mumh بھی ہوا کرتی تھی اور یہ کوہِ مردار اس کا جائے پناہ جب پاکستان بنا بھی نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ بڑی عجیب الخلقت چیز تھی۔ سر عورت کا اور دھڑ کسی جانور کا شاید کسی ریچھ کا یا شیرنی کا، ویسے Mumh مقامی زبان میں ریچھ کو کہتے ہیں۔“ حاشر ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا۔

”بھائی مطلب......“ اچانک علی نے درمیان سے بات کاٹی۔

”مجھے لگ رہا ہے کہ اپنے کراچی کے چڑیا گھر میں موجود ممتاز محل والی مخلوق ہے جس پر ٹکٹ ہوا ہے آج کل دیکھنے کا۔“ یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ حاشر نے غصے سے اُسے گھور کر دیکھا تو سنجیدہ ہو کر بیٹھ گیا۔

”اب واقعہ سنائیے کیا ہے یہ مم؟“ حاشر نے اصرار بھرے انداز میں کہا۔

”سر کراچی کی ممتاز محل کا تو مجھے علم نہیں لیکن یہ واقعہ مجھے میرے دادا نے سنایا تھا جب میں چھوٹا تھا۔ اب تک یاد ہے۔“ دلاور نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔

”دادا اس وقت چھ سال کے تھے اور ان کے

سامنے واقعات ہوئے مم بنیادی طور پر انگریز راج میں نظر آنا شروع ہوئی۔ کہا جاتا تھا کہ اس کا مسکن وادیٔ کوئٹہ کا جنوبی حصہ تھا۔ اس وقت کوئٹہ اور دیگر علاقے قلات سے منسلک تھے جنہیں انگریزوں نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی مقامی لوگوں سے باقاعدہ جنگی جھڑپیں کر کے چھیننا شروع کیا۔ یہاں مقامی لوگوں اور جانوروں دونوں کو نقصان پہنچا جنگلی حیات کافی حد تک یہاں سے نقل مکانی کر گئی تاہم مم کا جوڑا یہیں رہ گیا۔''

''پہلے پہل تو کوئی نقصان نہیں ہوا بعد میں کہا جاتا ہے کہ نر مم حادثاتی طور پر جھڑپوں میں مارا گیا اور مادہ مم نے اسی پہاڑوں کے غار میں پناہ لی جسے آج کوہ مردار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پہلے پہل مقامی لوگوں کی بھیڑ بکریاں غائب ہونا شروع ہوئیں اور بعد میں ان کی اَدھ کھائی لاشیں ملتیں جس پر توجہ نہیں دی گئی۔ مبادا کوئی جنگلی جانور کی حرکت ہو گی۔''

''مم کی طرف توجہ اس وقت مبذول ہوئی جب لوگ غائب ہونا شروع ہوئے خاص کر وہ لوگ جو کوہ مردار کے پاس سے گزرتے۔ جن میں مسافر بھی شامل تھے اور وہ برطانوی فوج کے سپاہی بھی شامل تھے جو ان پہاڑیوں کا برطانوی چھاؤنی کی حفاظت کے پیش نظر گشت لگایا کرتے تھے۔ مم اپنا شکار صرف رات میں اور تنہا لوگوں پر کرتی تھی، اگلے دن کہیں نہ کہیں ان کی اَدھ کھائی یا اُدھڑی لاشیں ملتیں۔ کئی شکاری ٹیمیں ترتیب دی گئیں مم کو پکڑنے کے لیے لیکن بے سود کیونکہ نہ اس کا حلیہ صحیح طور پر پتہ تھا اور نہ ہی اس کا مسکن، ماہرین نے یہ بات تو کنفرم کر دی تھی کہ یہ لاشیں کسی شیر یا بھیڑیے کا کام نہیں۔''

''مقامی لوگ مم کے وجود کو مانتے تھے اور رات کے سفر سے اجتناب کرتے لیکن حلیہ کوئی صحیح سے بتا نہ سکتا تھا جنہوں نے دیکھا تھا وہ بتانے کے لیے زندہ نہ رہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے آخری بار ایک برطانوی آفیسر پر حملہ کیا تھا اور اسے گھسیٹ کر اپنے غار میں لے جانے لگی۔ آفیسر پہلے ہی زخموں سے چور تھا اس کا ہاتھ اپنی جیب میں موجود پاکٹ ڈائری سے ٹکرایا تو اس نے بروقت اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھتے ہوئے فوری فیصلہ لیا اور اپنی ڈائری کے اوراق پھاڑ پھاڑ کر راستے میں ڈالتا رہا یہاں تک کہ مم اسے گھسیٹتے ہوئے غار میں لے آئی۔''

''مقصد صرف یہ تھا کہ اگر کوئی اس کی تلاش شروع کرے تو ان صفحات کی مدد سے اصل جائے پناہ تک پہنچ کر اس مم کا صفایا کر سکیں اور وہ ہی ہوا۔ اگلے دن آفیسر کو نہ پا کر اس کے ساتھیوں نے تلاش شروع کی تو انہیں ڈائری کے پھٹے ہوئے اوراق نظر آئے جس کا تعاقب کرتے ہوئے وہ اس کوہ مردار کے اس غار تک جا پہنچے جہاں ان کا آفیسر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا حیرت انگیز طور مم نے نجانے کیوں اسے مارا نہیں شاید اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اس وقت تو وہ مم چھپی رہی۔ لیکن اگلی رات اس مم کے لیے آخری رات ثابت ہوئی۔ باقاعدہ جال بچھایا گیا جیسے ہی وہ غار سے نکلی اسے وہیں گولیوں سے بھون دیا گیا تاہم وہ آفیسر جن کی وجہ سے اس کا شکار ممکن ہوا وہ بھی اسی رات زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گیا۔'' دلاور خان واقعہ سنا کر خاموش ہو گیا۔ سب خاموش تھے ایک گہرا سکوت طاری تھا نومبر کی یہ ٹھنڈی خنک رات جبکہ چاند کی روشنی بھی زرد اور مدھم پڑی ہوئی تھی۔ بون فائر کی آگ بھی اب سرد پڑتی جا رہی تھی ماحول بڑا پُراسرار ہو گیا تھا۔

''خیر...... مجھے تو پھر بھی اس کا یقین نہیں تاہم مقامی لوگ آج بھی اس کہانی کا یقین کرتے ہیں کہتے ہیں کہ وہ مم مری نہیں ہے آج بھی اس کی روح پھرتی ہے اب اللہ جانے روح ہے یا اس کی نسل یا اس کی آڑ میں کوئی بے وقوف بنا رہا ہے۔ بہرحال میں نے نہیں دیکھا۔ آپ لوگ جا کر سو جائیں رات کافی ہو گئی صبح سیرینہ مارکیٹ اور

قلعہ مری سے ہوتے ہوئے ہم وادیٔ پشین جائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے دلاور خان چلا گیا۔ وہ تینوں بھی اپنے کمرے میں آ گئے۔ حاشر نے ایک لفظ بات نہ کی گویا وہ کسی سوچوں میں گم تھا۔ اور یہی خاموشی علی اور فواد کے ذہن میں کسی خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی کیونکہ وہ حاشر کو سمجھتے تھے۔ بارہا پوچھنے کے بعد بھی حاشر نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔

اگلی صبح وہ سب اپنے اگلے پڑاؤ کے لیے نکلے۔

پروگرام کے مطابق وہ سب سے پہلے سیرینہ مارکیٹ گئے۔ حاشر نے اس بار کھانے پینے کی چیزیں اتنی خریدیں کہ لگ رہا تھا ذخیرہ کر رہا ہے۔ علی نے اُسے کریدنے کی بہت کوشش کی لیکن مجال ہے جو حاشر نے اپنے منصوبے کے بارے میں کچھ بتایا ہو۔ قلعہ مری کی طرف جاتے ہوئے اچانک حاشر کی طبیعت خراب ہو گئی اسے چکر اور اُلٹیاں آنے لگیں۔

ٹورسٹ گائیڈ نے واپسی کا ارادہ کیا لیکن حاشر نے یہ کہتے ہوئے کہ اس کی وجہ سے گروپ کے باقی لوگوں کا مزا کرکرا نہ کیا جائے لہٰذا صرف وہ واپس ہوٹل چلا جائے گا۔ ٹورسٹ گائیڈ کو بڑی چالاکی سے الگ کر دیا۔ حاشر واپس ہوٹل آیا تو ظاہر تھا علی اور فواد کو بھی ساتھ آنا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر حاشر گویا پھر سے ہشاش بشاش ہو گیا۔

''گائز...... سامان جلدی جلدی پیک کرو...... ہمیں اس ٹورسٹ گائیڈ کے آنے سے پہلے یہ ہوٹل چھوڑنا ہے۔'' حاشر نے اعلان کیا۔

''کیا...... کیا؟'' علی اور فواد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''او بھائی...... کیوں...... کس خوشی میں؟''

''خیریت تو ہے ناں؟'' علی نے جلدی جلدی پوچھا۔

''تمہاری طبیعت تو خراب ہوئی تھی ناں، صحیح کیسے ہوئی؟'

''بس ہو گئی صحیح ابھی جو کہہ رہا ہوں وہ کرو، سامان پیک کرو۔'' حاشر نے گویا حکم جاری کر دیا فواد تو اڑ گیا۔

''نہیں پہلے وجہ بتاؤ پھر نکلیں گے۔ ہوٹل سے نکل کر جائیں گے کہاں؟''

''پلیز اگر تم دونوں کو مجھ پر تھوڑا سا بھی اعتماد ہے تو پلیز میری بات مان لو میں راستے میں تمہیں سب بتاؤں گا۔'' حاشر نے ملتجی انداز میں کہا تو دونوں نے خاموشی سے سامان پیک کیا۔ حاشر نے پہلے ہی ایک اور مقامی گائیڈ سے بات کر رکھی تھی وہ گاڑی لے کر تیار کھڑا تھا۔ انہوں نے آناً فاناً ہوٹل چھوڑا اور اب سب نئی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

''اب تو اس تجسس کو ختم کرو یار۔'' علی نے قدرے چڑ کر کہا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں؟''

''ہم بلیلی روڈ کے ذریعے کوہ مردار جائیں گے۔'' حاشر نے اطمینان سے کہا۔

''کوئٹہ سے بلیلی روڈ صرف گیارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے ابھی پہنچ جائیں گے بلیلی روڈ پر ہوٹل میں رُکیں گے اور پھر وہاں سے کوہ مردار......'' علی اور فواد کے سروں پر جیسے بم گر گیا۔

''تُو پاگل ہے کیا حاشر؟'' فواد نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''تجھے پتہ ہے کہ بلیلی روڈ اور اسمانگلی روڈ کا حالات صحیح نہیں ہیں، اوپر سے کوہ مردار کی پہاڑیاں نومبر کے مہینے میں برف سے ڈھکنا شروع ہو گئی ہیں ان تمام باتوں کی وجہ سے کوئی بھی ٹور ایجنسی ان علاقوں کو پروگرام میں شامل نہیں کر رہی ہیں اور تو......''

''ریلیکس یار...... پہلے بتاتا تو سچ بتاؤ کیا تم لوگ میرے ساتھ آتے نہیں ناں! آگے سب اچھا ہوگا' اٹ ول بی بیسٹ ایڈونچر آف آور لائف۔'' حاشر نے بہت جوش سے کہا۔

''واقعی اب تمام باتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔''

وہ اب بلیلی پہنچ چکے تھے۔ یہاں حاشر نے ہوٹل میں کمرا بک کروایا۔
''کھانا کھا کر ہمیں فوراً نکلنا ہے' سو گائز بی ہری اپ۔'' حاشر یہ کہتا ہوا ہوٹل کے ڈائننگ ہال کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں بھی ڈائننگ ہال آ گئے' یہاں اس ہوٹل میں کچھ اور لوگ بھی نظر آ رہے تھے کچھ مقامی اور کچھ ٹورسٹ' کچھ دیر میں کھانا بھی آ گیا سب خاموشی سے کھانے لگے۔
''ایکسکیوزمی......!'' ایک نسوانی آواز پر سب نے سر اٹھا کر دیکھا ایک دبلی پتلی سانولی لیکن پرکشش لڑکی چہرے پر نظر کے بڑے بڑے گلاسز لگائے کھڑی تھی۔ شاید وہ بھی ان کی طرح ٹورسٹ تھی۔
''جی فرمایئے۔'' حاشر نے کہا۔
''دیکھیے میرا نام پلوشہ ہے۔'' لڑکی نے بات شروع کی۔
''میں دراصل اپنی ٹیم کے ساتھ آئی تھی ہمیں کوہِ مردار جانا تھا وہ شاید غلطی سے مجھے چھوڑ گئے مجھے کسی نے بتایا کہ آپ بھی کوہِ مردار جا رہے ہیں تو کیا آپ مجھے ساتھ لے لیں گے۔ میں وہاں اپنی ٹیم کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اب تک تو وہ وہاں پہنچنے والے ہوں گے۔''
''پر آپ کو کس نے کہا کہ ہم کوہِ مردار جا رہے ہیں؟'' علی نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔
''آپ کے یہ ساتھی......'' اس نے حاشر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''اس ڈرائیور سے کوہِ مردار جانے کی بات کر رہے تھے تو میں نے سنا تھا۔''
''ٹھیک ہے آپ ہمارے ساتھ چل سکتی ہیں۔'' حاشر نے کہا۔
''ہم بس نکلنے ہی والے ہیں پندرہ بیس منٹ میں' آپ باہر جائیں ہم بس اپنا سامان لے کر آتے ہیں۔'' لڑکی چلی گئی۔
''حاشر! بس بہت ہو گیا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا اس انجان لڑکی کو ساتھ رکھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟'' فواد کمرے میں آ کر دھاڑا۔
''اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے یار! لڑکی ذات ہے اکیلی یہاں کیا کرے گی۔'' حاشر نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔
''تم نے ہر کسی کی مدد کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا۔'' فواد بولا۔
''یہاں پولیس اسٹیشن بھی ہیں رینجرز بھی ہیں مدد لے سکتی ہے تمہیں کس خوشی میں ہمدردی ہو رہی ہے۔''
''ہری اپ گائز دیر ہو رہی ہے۔'' حاشر نے فواد کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اب فواد کو غصہ آ گیا۔
''دیکھ حاشر تیری ہر بات مان رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر ناجائز بات بھی مان لیں۔''
''کیا مطلب؟'' حاشر نے کہا۔
''مطلب یہ کہ میں نہیں جاؤں گا میرا آخری فیصلہ ہے یہیں رکوں گا اور تم لوگوں کا انتظار کروں گا' کم از کم اس لڑکی کی موجودگی میں تو ہرگز نہیں۔'' فواد نے بھی فیصلہ سنا دیا۔
''یہ کیا کہہ رہا ہے علی سمجھاؤ اسے......'' حاشر نے بھی چیختے ہوئے کہا۔
''صحیح کہہ رہا ہے اب تو میں بھی سوچ رہا ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔'' علی نے کہا۔
''ٹھیک ہے پھر تم فیصلہ کر لو کہ کس کا ساتھ دو گے میرے ساتھ جاؤ گے یا یہاں رکو گے۔'' حاشر نے بھی فیصلہ کن الفاظ میں کہا۔ علی اور فواد آج حاشر کا انداز دیکھ کر ہونچکا رہ گئے۔
''ٹھیک ہے پانچ منٹ دو مجھے سوچنے کے لیے۔'' علی نے کہا۔
''اوکے' صرف پانچ منٹ' میں باہر تمہارا انتظار کر رہا ہوں' پانچ منٹ بعد اگر تم نہیں آئے تو آئی ول گو مائی سیلف۔'' یہ کہتے ہوئے حاشر بیگ اٹھائے پاؤں پٹختے ہوئے نکل گیا۔ فواد کی آنکھوں

میں نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو آ گئے ظاہر ہے جب بچپن کے دوست کا رویہ اچانک ہتک آمیز ہو جائے تو انسان کا دل بڑا دکھتا ہے۔

''فواد......'' علی نے اُسے مخاطب کیا۔

''میری بات سنو...... تم دونوں مجھے بھائیوں کی طرح عزیز ہو' لیکن مجھے کچھ خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے میں حاشر کو اس سفر میں خاص اس کوہ مردار والے سفر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا' تم ہوٹل کے کمرے میں ابھی محفوظ ہو وہ اکیلا پڑ جائے گا میں نہیں چاہتا کہ ہماری وجہ سے کوئی نقصان ہو اور بعد میں زندگی بھر کا پچھتاوا رہ جائے۔ فواد سمجھ رہے ہو ناں میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔'' علی نے فواد کے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ فواد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب غور سے سنو جو میں کہہ رہا ہوں۔ اس پر عمل کرنا۔'' علی نے رازداری سے کہا۔

''میں حاشر کے ساتھ جا رہا ہوں۔ تم ہوٹل چھوڑ کر نہیں جانا' اللہ نہ کرے ہم دونوں وقت پر نہ لوٹے تو ہمارا انتظار کرنا' اگر چوبیس گھنٹوں بعد بھی ہم نہ لوٹے تو یہاں کی پولیس کو اطلاع دینا' خود ہوٹل چھوڑ کر کسی کے بھی بلانے پر نہیں جانا' اوکے اور اگر کوئی آتا ہے کوئی اجنبی ہمارا نام لے کر لیکن جب تک تم ہماری شکلیں نہ دیکھو اس کی بات کا یقین نہ کرنا۔''

علی اسے کسی بچے کی طرح سمجھا رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ فواد فطرتاً ڈرپوک اور جذباتی لڑکا ہے۔ وہ فواد کو اپنا خیال رکھنے کا کہتے ہوئے باہر آ گیا۔

جہاں حاشر اور وہ لڑکی پلوشہ اُس کا انتظار کر رہے تھے۔

''چلیں...... یا کچھ اور باقی ہے۔'' حاشر نے ترش لہجے میں کہا۔

''نہیں...... چلو......'' علی نے مختصراً جواب دیا۔

''ارے...... وہ آپ کے تیسرے دوست کہاں ہیں؟'' پلوشہ نے پوچھا۔

''وہ نہیں چل رہے۔''

''نہیں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ ہوٹل میں ہی رُکے گا۔'' علی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یوں تو بلیلی روڈ سے کوہ مردار کا فاصلہ 75 کلومیٹر کا تھا یعنی ڈیڑھ سے دو گھنٹے میں پہنچ جانا تھا۔

لیکن عین درمیان میں گاڑی خراب ہو گئی' دوسری گاڑی بھی نہیں اور باقیوں نے کوہ مردار جانے سے صاف منع کر دیا کہ آج برف باری زیادہ ہونے کے امکانات ہیں۔

جب ڈرائیور گاڑی ٹھیک کر رہا تھا تو تینوں ایک جگہ پتھر پر بیٹھ کر گاڑی ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

باتوں باتوں میں معلوم ہوا وہ لڑکی لاہور کی رہائشی ہے اور اسٹوڈنٹ ہے اور یہاں اسٹڈی ٹور پر آئی ہے۔ باتوں میں مم کا ذکر بھی آ گیا۔

''آپ کو مم کی کہانی پر یقین ہے؟'' پلوشہ نے پوچھا۔

''ناٹ ریلی' لیکن اسے جاننے کا تجسس بہت ہے۔'' حاشر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آئی وش میں مم کو دیکھوں تو ذرا میڈم کے حال چال بھی پوچھوں کہ چار پاؤں پر چل کر کیسا لگتا ہے۔''

''اوہ ہاں......'' لڑکی نے چونکتے ہوئے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے اپنے دوست کو سمجھا دیا ہے کہ آج کل راتوں میں بلیلی روڈ کی طرف تن تنہا نہ نکلے میں نے سنا ہے کہ بلیلی روڈ کے ساتھ آگے ایک برٹش دور کا قبرستان ہے شاید آپ نے دیکھا ہو وہاں ایک قبر پر اس مم کا اسٹیچو نصب ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس مم کی قبر ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ وہ اس برٹش آفیسر کی قبر ہے۔

جس کی وجہ سے مم کی موت ہوئی اور یادگار کے

طور پر اس کی قبر پر نصب ہے۔ بہر حال یہاں کے مقامی لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مم کی روح آج بھی پھرتی ہے روپ بدل بدل کر اور اگر کوئی رات کی تنہائی میں بلبلی روڈ پر آدمی رات کو نکلے وہ بھی تنہا تو مم اس کا پیچھا کرتی ہے۔ میں اس لیے بتا رہی ہوں شاید ہم واپس ہوٹل نہ جا پائیں مطلب دیر اتنی ہو گئی ہے کہ واپسی پر راستے میں کہیں رُکنا پڑے تو اس لیے پوچھا آپ نے اپنے دوست کو بتا دیا ناں؟''

''نہیں...... ہمیں اس قصے کا پتہ نہیں تھا۔'' علی نے کہا۔

''لیکن بہر حال میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ ہماری غیر موجودگی میں ہوٹل سے نہ نکلے۔ اتنے میں گاڑی ٹھیک ہو گئی اور وہ کوہِ مردار کی طرف روانہ ہو گئے۔

آج پورے دو دن بعد حاشر کو ہوش آیا تو اُس نے خود کو علاقے کے سرکاری اسپتال میں پایا سر میں شدید درد کی لہر اٹھی۔ ہاتھ لگایا تو پتہ چلا کہ سر پر بینڈیج ہوئی ہے اور ہاتھ فریکچر ہو چکا ہے۔

''لیٹے رہیں۔'' ڈاکٹر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ پیچھے پیچھے ایک پولیس والا بھی داخل ہوا۔

''آپ کو آج پورے دو دن بعد ہوش آیا ہے مقامی لوگوں کا کہنا ہے آپ زخمی حالت میں مدد کے لیے پکارتے پائے گئے اور پھر بے ہوش ہو گئے' ہوا کیا تھا کچھ بتائیں گے۔'' حاشر کو جیسے ایک ایک کر کے تمام باتیں یاد آنے لگیں۔

''میں کوہِ مردار پہنچا۔'' حاشر نے لڑکھڑاتے لہجے میں بات شروع کی۔

''علی میرے ساتھ تھا اور وہ لڑکی...... کیا نام تھا اُس کا ہاں ہاں پلوشہ وہ بھی ہمارے ساتھ آئی تھی۔ ہم بہت دیر تک تصویریں بناتے رہے' پلوشہ نے اپنی گمشدہ ٹیم کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ اس کی ٹیم کب کا واپس جا چکی ہے پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔''

حاشر جیسے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہاں یاد آیا علی نے مجھ سے کہا کہ پلوشہ اچانک کہاں غائب ہو گئی میں پریشان ہو گیا کیونکہ اکیلی لڑکی ذات ہے اُس کی ٹیم بھی نہیں ہے' اکیلی کہیں بھٹک تو نہیں گئی۔

شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا وہ بھی تیزی سے میں پاگلوں کی طرح اس کو تلاش کر رہا تھا۔ علی نے مجھ سے کہا کہ پلوشہ کا پیچھا چھوڑو وہ خود کہیں گئی ہے اندھیرا ہونے والا ہے اور برف باری بھی تیز ہو گئی ہے' اپنی جان بچاؤ' لیکن مرد ہونے کے ناطے میری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ میں کسی مجبور لڑکی کو ایسے حالات میں چھوڑ دوں۔

میں اڑ گیا کہ اسے ڈھونڈتا ہے' ڈرائیور الگ ناراض ہو رہا تھا۔

اسے پندرہ منٹ کا کہہ کر ہم کوہِ مردار کے ایسے سنسان حصے میں آ گئے جہاں اونچے پتھروں کے ڈھیر اور چھوٹے بڑے غار تھے۔''

''پھر کیا ہوا؟'' پولیس والے نے سوال کیا۔

''پھر......'' حاشر حافظے پر زور دینے لگا۔

''پھر مجھے اپنے پیچھے سے ایک کراہ کی آواز آئی' مڑ کر دیکھا تو علی زمین پر پڑا ہوا تھا اور زمین اس کے خون سے تر ہو رہی تھی' آگے بڑھ کر دیکھا تو اس کا سر کسی نے بے رحمی سے پھاڑ ڈالا تھا۔ میں اُسے اٹھانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ پیچھے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی مڑ کر دیکھا تو...... تو......''

''وہ لڑکی...... وہ لڑکی نہیں تھی سر وہ تو پتہ نہیں کونسی مخلوق تھی۔ سر تو پلوشہ کا تھا لیکن دھڑ شیرنی کا...... نہیں ریچھ کا پتہ نہیں کیا تھا...... دھڑ تو کسی جانور کا تھا۔

مکروہ ہنسی وہ چار پاؤں پر چل رہی تھی۔ اس کا نوکیلا ناخن والا پنجہ میرے کندھے پر لگا تھا۔ میں جیسے تیسے کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ راستے میں پتھر سے سر ٹکرایا۔ میں پھر بھی بھاگتا رہا۔ مجھے اس کی ہنسی

سنائی دے رہی تھی۔ مجھے بچالیں پلیز۔'' حاشر ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔

ڈاکٹر نے اس کو بے ہوشی کا انجکشن لگا دیا اگلے دن ہوش آیا تو پہلا سوال یہی کیا کہ فواد کو بلوا دیں۔

''جناب والا......'' پولیس والے نے کہا۔

''آپ کے لیے ہمارے پاس دو خبریں ہیں۔ اچھی خبر یہ ہے کہ فواد صاحب نے ہی ہم کو فون پر آپ دونوں کی گمشدگی کی اطلاع دی تھی اور ہم آپ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو پائے انہیں فون کر دیا ہے وہ آنے والے ہیں۔ بری خبر یہ ہے کہ آپ کے دوست علی کی لاش مل گئی ہے لیکن ادھڑی ہوئی' پہچان میں نہیں آ رہی ہے۔'' حاشر کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں کاش وہ اس منصوبہ کی پلاننگ نہ کرتا کاش وہ ان کی بات مان لیتا۔''

''اور ہاں پلوشہ صاحبہ سے میری بات ہوئی ہے جو اس ہوٹل میں ٹھہری تھیں وہ کہہ رہی ہیں کہ وہ وقوعہ کے دن آپ لوگوں کے ساتھ نہیں گئیں۔ میں نے انہیں بلوایا ہے لیجیے آ گئیں۔'' پولیس والے نے کہا۔ پلوشہ سامنے آئی تو حاشر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''سر یہ وہ لڑکی نہیں ہے وہ دوسری تھی۔''

''آر یو شیور......'' پولیس والے نے کنفرم کیا۔

''جی......!''

''کب سے کہہ رہی ہوں میں ان کو نہیں جانتی لیکن آپ لوگوں کو سمجھ ہی نہیں آ رہا' جا رہی ہوں میں اب کنفرم ہو گیا ناں۔'' لڑکی پاؤں پٹختی چلی گئی۔

فواد اب تک نہیں پہنچا تھا۔ آخر کار حاشر نے پوچھ ہی لیا۔

''سر فواد اب تک نہیں آیا۔'' پولیس والے نے ہوٹل کال کی اور پھر کہا۔

''فکر نہ کرو گاڑی کا مسئلہ تھا وہ حل ہو گیا ایک محترمہ یہاں کسی عزیز کو دیکھنے آ رہی تھیں تو وہ ان کے ساتھ آ رہے ہیں' ابھی تو گیارہ بجے ہیں رات کے 12 بجے تک پہنچ جائیں گے۔''

حاشر کے کان کھڑے ہو گئے بلیلی روڈ' رات کی تنہائی اور مم کا تنہا آدمی کا شکار کرنا' پھر بھی وہ دعائیں کر رہا تھا کہ یہ خیالات غلط ثابت ہوں پورا دن گزر گیا لیکن فواد نہ پہنچا۔ ہوٹل کے بندے کو بلوا کر پوچھا تو اس نے کہا۔

''وہ اس محترمہ کے ساتھ کل رات ہی نکل گئے تھے۔'' پھر اس بندے نے حاشر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے صاحب! اب تو جانتے ہیں ناں وہی محترمہ جو آپ کے ساتھ گئی تھیں وہ تو واپس آ گئی تھیں کہہ رہی تھیں کہ آپ دونوں کو کوہ مردار سے آگے کہیں جانا تھا اس لیے وہ واپس آ گئیں۔ جب آپ کی اطلاع ملی تو فواد صاحب کو گاڑی کی پیش کش انہوں نے ہی کی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں آئے حیرت ہے۔''

وہ بندہ اور پتہ نہیں کیا کیا کہتا رہا۔ لیکن حاشر کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

آج اس واقعے کو پانچ سال ہو چکے ہیں حاشر ہوش میں آنے پر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا اور صرف مم کی عجیب و غریب شکلیں دیواروں پر بناتا رہتا ہے علی کی ادھڑی ہوئی لاش کا معمہ حل نہ ہو سکا کہ کس نے مارا اور جنگلی جانور کی درندگی قرار دے کر کیس بند ہو گیا رہا فواد کا معاملہ تو اسے تو جیسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

نہ لاش ملی اور نہ ہی اُس کا اَتا پتہ' سب کے ماں باپ الگ زندہ درگور ہو گئے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ آج بھی کوہ مردار میں مم کی آواز آتی ہے خوفناک طریقے سے رونے کی آواز' آج بھی اس روڈ کے پاس برٹش قبرستان کے پاس لوگ سردی کی خنک راتوں میں گزرنے سے ڈرتے ہیں اور آج بھی وہ شاید انتظار کر رہی ہے کہ کب حاشر جیسے لوگ اس کے چنگل' اس کے فریب میں آ پھنسیں' مم کا پُراسرار وجود آج بھی سربستہ راز ہی ہے۔

☆☆......☆☆

عامل کامل

کالی دنیا، جادو، جنات، ٹونے ٹوٹکوں، سیاہ دل لوگوں کی کالی دنیا، جہاں دوشیزاؤں کو جادو کی بھینٹ چڑھانا، شیطان کو خوش کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا' اس دنیا میں ایک دین اور ایمان والے نے کس طرح ٹکر لی، اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں پیش آنیوالے دلچسپ، عبرت ناک، سبق آموز واقعات......

دین وایمان کی کشمکش کی داستان

پانچویں قسط

پیر شاہ محمد قادری

''شیطان کے جشن کی خوشی میں سالے پاگل ہی ہو گئے ہیں۔'' سردار کا لہجہ انتہائی تحقیر آمیز تھا: ''ان کو ہوش نہیں ہے کہ گھر میں ہیں یا کسی میدان میں......توبہ......!''

مجھے ہنسی آ گئی۔

جو کچھ بھی یہاں ہو رہا تھا اور مزید آگے ہونے والا تھا' اس سے سردار بچل کو میں نے پوری طرح آگاہ کر رکھا تھا' میری یہی کوشش تھی کہ دور رہنے کے باوجود وہ کسی بھی متوقع یا غیر متوقع واقعے کو فوراً ہی سمجھ لے' تاکہ کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ ہو...... کیونکہ اس صورت میں کسی پریشان کن مسئلے میں پھنس جانے کا خدشہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک خاص قسم کی دھن چاروں طرف گونجنے لگی' اس دھن میں کچھ عجیب سی بات تھی...... یہاں میرے لیے اپنے تاثرات بیان کرنا ذرا مشکل ہے...... بہرحال میرے خیال میں یہ دھن ایسی تھی کہ جس سے دل میں ایک عجیب سی سرشاری اور سرور کا احساس ہونے لگتا تھا' یہ شاید ان لوگوں کا اپنا مذہبی گیت تھا...... اور کئی جگہوں پر یہی دھن بجائی جا رہی تھی......

اور پھر مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا' لوگوں نے دونوں طرف قطاریں بنا لی تھیں اور کئی گاڑیاں گلنار کے گھر کے سامنے آ رکیں۔ سب لوگ آگے بڑھے تھے' تاکہ مہمانوں کی سواگت کی



جا سکے۔ ان میں گلنار اور اس کے بھائی پیش پیش تھے۔

یہ بالترتیب پانچ گاڑیاں تھیں' پہلے آنے والی کار میں مہمانوں کے محافظ موجود تھے۔ جن کے پاس اسلحہ بھی تھا' ایسے ہی کچھ گارڈ سب سے آخری کار میں بھی تھے...... درمیان کی تینوں گاڑیوں میں مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔

اب ان کے گاڑیوں سے نکلنے کی باری تھی سب سے پہلے جو شخص کار میں سے برآمد ہوا' شاید وہی کرسی صاحب تھا' کیونکہ وہ سب ہی لوگوں میں نمایاں دکھائی دے رہا تھا اور وہ اپنی کار میں تنہا بھی تھا' باقی دونوں گاڑیوں سے تقریباً چھ افراد نکلے تھے...... نمایاں دکھائی دینے والے شخص نے مسکرا کر سب سے ہاتھ ملایا' کئی لوگوں نے اسے سجدہ بھی کرنے کی کوشش کی۔

یہ شخص اپنی شکل وصورت اور ہیئت سے خود بھی کسی شیطان سے کم نہیں لگ رہا تھا' وہ ادھیڑ عمر تھا' اس کا چہرہ اور سر کے بال انڈے کے چھلکے کی طرف صاف اور شفاف تھے' آنکھیں گول اور بڑی بڑی تھیں' اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا' جس کے بائیں جانب والے کالر پر شیطان کی تصویر چسپاں تھی...... یوں جیسے اسے بھی اس سوٹ کے ساتھ ہی سی دیا گیا ہو...... اس نے آگے بڑھ کر گلنار کے دونوں گالوں پر بوسے دیے...... گلنار نے اس بات پر بے حد خوشی کا اظہار کیا۔

''کتنے بے غیرت بھائی ہیں!'' سردار نے سرگوشی کی۔ ''ان لوگوں کو شرم نہیں آرہی' غیر آدمی ان کی بہن کی عزت پر ہاتھ ڈال رہا ہے......''

''ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو سردار......'' میں نے اپنی ہنسی روکی۔ ''یہ لوگ تو ہیں ہی شیطان کے پیروکار......''

''لعنت ہو ایسے پیروکاروں پر۔'' سردار کی کھوپڑی گھوم گئی تھی۔ میں نے جلدی سے اسے سمجھایا بجھایا اور اعتدال پر لانے کی کوشش کی' مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے کہ جس سے معاملہ گڑبڑ ہو جائے......!''

سب لوگ پھر مکان کے اندر جانے لگے' ان میں چونکہ عام لوگ بھی تھے' اس لیے مجھے اور سردار کو بھی موقع مل گیا' عام لوگوں کی ایک مخصوص حد تھی کہ جس میں وہ اندر کا حال دیکھ سکتے تھے...... میں موقع دیکھ کر سردار کو عقبی حصے کی طرف لے آیا' جہاں دو محافظ آج کھڑے ہوئے پہرہ دے رہے تھے...... ہم دونوں نے ایک ستون کی آڑ لے لی اور پھر میں نے ایک وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا...... ساتھ ہی میں نے نیچے جھک کر زمین سے تھوڑی سی مٹی اٹھالی' وظیفہ ختم ہوتے ہی میں نے اس مٹی پر پھونک ماری اور اسے پہریداروں کی طرف اچھال دیا...... سردار خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا' وہ بولا کچھ نہیں......

''سردار...... ہم اب صرف گلنار ہی کے آسرے پر نہیں رہ سکتے' ہمیں خود بھی کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔'' میں جلدی جلدی بولا تھا۔ ''اب میں تمہیں تہہ خانے کا راستہ دکھا رہا ہوں' تم وہاں جا کر کسی مناسب جگہ چھپ جانا' میں پھر ان لوگوں کے ساتھ وہاں آؤں گا...... اور جب تقریب شروع ہوگی' تو میری طرف سے اشارہ ملتے ہی تم نمودار ہو جانا...... پستول وغیرہ ہے تمہارے پاس......!''

''وہ تو کپڑوں کی طرح ہر وقت جسم سے چپکی رہتی ہے......'' سردار مسکرایا۔

''بہت خوب......'' میرے منہ سے نکلا۔

''اب آؤ...... یہ پہریدار تو تھوڑی دیر کیلیے اپنے ہوش وحواس کھو چکے ہیں...... میں نے عمل پڑھ کر پھونک دیا ہے...... اب آؤ......!!''

سردار بے دھڑک ہو کر میرے پیچھے لپکا' واقعی پہریدار بتوں کی مانند کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے اور میرے عمل نے ان کی آنکھوں پر غائبانہ پٹی بھی باندھ دی تھی...... تھوڑی دیر کیلیے وہ اندھے ہو چکے تھے......

میں اس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا اور سردار کیلیے تہہ خانے کا دروازہ کھول دیا' سردار نے مجھے ہاتھ ہلایا اور نیچے اتر گیا...... تہہ خانے میں اس وقت شاید کوئی بھی موجود نہیں تھا' ویسے میں نے سردار کو اندر سے دروازہ کھولنے کا طریقہ سمجھا دیا تھا...... اب آگے کا معاملہ سردار کی اپنی صلاحیت پر منحصر تھا' ویسے تو مجھے پوری امید تھی کہ تہہ خانہ ابھی خالی ہی ہوگا' کیونکہ یہ بہت خفیہ جگہ تھی۔

اب میں جلدی سے اسی ہجوم میں واپس آ گیا' مہمان اب اندرونی حصے میں داخل ہو چکے تھے اور شاید اب وہ مکان کے اندر کسی کمرے میں جمع تھے' مجھے معلوم تھا کہ اب عام لوگوں کا یہ ہجوم میدان کا رخ کرے گا' چنانچہ جب سب لوگ باہر نکلنے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ ہی باہر نکلا اور محتاط طریقے سے اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

مجھے یہاں گلنار کا انتظار کرنا تھا' اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ وہ جب گھر میں داخل ہو تو میں کہیں چھپ جاؤں...... تاکہ آنے والوں کی مجھ پر نظر نہ پڑ سکے' چنانچہ میں اس کی بتائی ہوئی جگہ صاف کرنے لگا' یہ کمرے کے اوپر بنا ہوا مچان تھا' جس پر کچھ فالتو سامان رکھا ہوا تھا...... میرے اندازے کے مطابق ابھی قربانی کے مخصوص وقت میں کافی دیر تھی۔

لیکن حیرت انگیز طور پر تھوڑی دیر بعد ہی مجھے دروازہ کھولنے کی آواز آئی' میں چونکا اور جھٹ سے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر چڑھ کر مچان پر کود گیا...... یہاں ایسی جگہ موجود تھی کہ میں کمرے کا منظر صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔

آنے والی گلنار ہی تھی' لیکن اس کے ساتھ ایک ہی آدمی تھا اور یہ ان ہی میں سے تھا جو کرسی صاحب کے ساتھ پچھلی گاڑیوں میں موجود تھے' میں گلنار کی ہوشیاری اور تیز رفتاری پر عش عش کرتا رہ گیا...... اس نے کتنی جلدی اپنا کام کیا تھا۔ وہ آدمی قد کاٹھ میں میرے ہی برابر ہوگا اور اس نے سر پر ہیٹ بھی لگایا ہوا تھا۔ ''یہ اچھی بات ہوئی۔'' میں نے دل میں سوچا۔

وہ دونوں ہنستے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے اور پھر میری سمجھ میں جلد ہی آ گیا کہ گلنار کا اتنی جلدی آنے کا کیا مقصد تھا...... جو کچھ وہ مجھ سے طلب کرتی رہی تھی...... وہ اس وقت اس مہمان سے حاصل کرنے کی کوشش میں تھی۔

میں اب کیا قدم اٹھاؤں......؟ میں اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ موقع دیکھ کر گلنار نے مجھے ایک اشارہ کیا' جسے میں فوری طور پر سمجھ گیا...... اس اشارے کا مطلب یہ تھا کہ میں تھوڑی دیر انتظار کروں اور ان دونوں کے درمیان میں خلل نہ آئے...... میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا تھا...... اس لڑکی کے جذبات کس قدر وحشیانہ تھے......!

وہ میرے کس قدر کام آئی تھی...... میرے اشاروں پر ناچتی رہی تھی......! میں نے جو بات بھی منہ سے نکالی تھی وہ اسے پورا کرنے کو تیار

رہتی تھی...... اس لیے اب مجبوراً میرا بھی فرض تھا کہ میں اسے موقع دوں...... ظاہر ہے کہ سور جیسے خبیث جانور کا گوشت کھانے کے بعد یہی سب کچھ ہونا تھا......!! چنانچہ مجھے خاموش اور ساکت دیکھ کر گلنار کی باچھیں کھل اٹھیں' وہ میری اجازت ہی کی منتظر تھی......اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی وہ کمرہ دو وحشیوں کی آماجگاہ بن گیا' ان میں گلنار زیادہ وحشی اور سرشار دکھائی دے رہی تھی...... کیونکہ اسی کی ہلکی ہلکی سسکیوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔

وہ دونوں اب لباس کی قید سے قطعی آزاد تھے اور اپنے مددگار شیطان کو ہر طریقے سے خوش کرنے پر بضد تھے' اس مقصد میں گلنار کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی...... اس نے کئی بار نگاہیں اٹھا کر بھرپور نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے منہ پھیرلیا۔ ویسے بھی یہ اخلاقی جرم تھا' جس کا میں مرتکب ہو رہا تھا...... لیکن میں بھی تو گوشت پوست سے بنا ہوا انسان ہی تھا اور یہاں پر ویسے بھی اخلاق اور سماج کا کوئی قانون دور دور تک لاگو نہیں تھا...... شیطان کی بستی میں قانون کیسا......!

ان کا یہ جنون تقریباً آدھے گھنٹے تک قائم رہا۔ اس کے بعد ہی جب اگلے لمحے میں نے اپنا پاؤں کمرے کے اندر رکھا تو وہ دونوں ہی بے دم ہو چکے تھے...... وہ بے حد نڈھال اور تھکے ہوئے دکھائی دینے لگے' پھر انہوں نے اپنے کپڑے پہنے اور اسی وقت گلنار نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں مجھے اشارہ کیا۔

میں نے ایک طویل سانس لی' پھر میرے ہونٹ جنبش کرنے لگے' اسی وقت میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کو پھیلایا اور اس آدمی کی طرف کرتے ہوئے پھونک ماردی' مجھے اب فوراً ہی اس آدمی کو پکڑنا تھا' چنانچہ میں نے مچان چھوڑا اور نیچے اتر پڑا...... پھر فوراً ہی میں نے آگے بڑھ کر عقب سے اس کی گردن دبوچ لی...... وہ بے چارہ تو پہلے ہی میرے روحانی وار کا شکار ہو چکا تھا' لیکن مجھے گلنار کو بھی تو مطمئن کرنا تھا...... چنانچہ چند لمحوں تک میں اس کی گردن پر اپنا زور صرف کرتا رہا پھر میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر کر ڈھیر ہو گیا۔

گلنار کو اس پر بھی کافی حیرت ہوئی تھی' لیکن وہ تو بس شیطانی ذہن کی مالک تھی' اس نے فوراً ہی مجھ سے پوچھا:

''سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ میرا جسم تمہیں کیسا لگا......؟''

میرا دماغ گھوم گیا' بجائے اس کے کہ وہ اس آدمی کے اس طرح بے ہوش ہونے کے متعلق مجھ سے سوال کرتی' اسے اب بھی اپنے ہی مطلب کی باتوں کا دھیان تھا۔

''اچھا ہے......!'' میں نے بمشکل ضبط کرتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''صرف اچھا......!''

''نہیں...... وقت کی کمی کی وجہ سے ایسا جواب دیا ہے......'' میں نے پھر بات بنائی: ''تم بہت خوبصورت اور دلکش ہو۔''

''اوہ...... اوہ......'' وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ پھر چونک کر بولی: ''اب اس کا کیا کرنا ہے؟''

''تمہارا مطلب نکل گیا......!''

''مجھ پر طنز کر رہے ہو؟'' اس نے مجھے گھورا۔

''ارے نہیں۔'' میں جلدی سے بولا: ''میں کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا' یہ بات یونہی منہ سے نکل

گئی۔“

”اب بنو مت...... میں سمجھ رہی ہوں۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

”تم نے اس وقت بالکل درست آدمی کا انتخاب کیا ہے۔“ میں نے اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کرنے کی کوشش کی: ”یہ قد و قامت میں تقریباً میرے ہی برابر ہے اور اس کے ہیٹ بھی لگا ہوا ہے‘ مجھے کافی مدد مل جائے گی‘ اس کا بہروپ بھرنے میں۔“

”دیکھ لو......“ وہ مسکرائی: ”یہ سب باتیں میرے ذہن میں موجود تھیں‘ اس لیے میں نے اس کا انتخاب کیا تھا‘ اور ہاں...... اس نے کالے رنگ کا چشمہ بھی لگایا ہوا تھا‘ وہ تمہیں اس کے کوٹ کی جیب سے مل جائے گا...... اس سے تم اور بھی محفوظ ہو جاؤ گے......“

”ارے واہ...... تم تو بہت ہی استاد ہو...... چالاک اور ذہین......!“

”خوبصورت نہیں ہوں؟“ اسے پھر یاد آ گیا۔

”یہ بات تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا: ”اور اب تم یہ بتاؤ کہ قربانی کی رسم میں کتنا وقت باقی رہ گیا ہے؟“

یہ سن کر اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی اور اچھل کر کھڑی ہو گئی:

”ارے...... تقریب کا آغاز تو ہونے والا ہے‘ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ ہمیں ڈھونڈنے کھڑے ہو جائیں‘ چلو اب جو کرنا ہے وہ جلدی کرو۔“

یہ سنتے ہی میں اس آدمی کی طرف جھپٹا اور میں نے اس کے کپڑے اتار دیے۔ اب چونکہ میری باری تھی اس لیے میں نے گلنار سے کہا:

”تم اپنا منہ دوسری طرف کر لو......!“

”کیوں......؟“ اس نے انجان بن کر پوچھا۔

”ارے بھئی...... میں اپنے کپڑے بھی اتاروں گا تاکہ اس کے کپڑے پہن سکوں......“ میں جھنجھلا اٹھا۔ مجھے وقت کی بے حد فکر تھی۔

”تو اتار دو...... روکا کس نے ہے......“ وہ اٹھلا کر بولی: ”جلدی کرو نا‘ وقت کم رہ گیا ہے......“

جھلاہٹ میں میں نے واقعی یہی کیا‘ وہ بے حد لالچی نگاہوں سے میرے جسم کو دیکھ رہی تھی‘ پھر جب میں اس آدمی کے کپڑے پہن رہا تھا تو میرے کانوں میں گلنار کی آواز آئی:

”اگر ابھی موقع دو تو میں ابھی تمہارے جسم کے روئیں روئیں کو چوم لوں...... ہاں......!!“

میں نے اس کی بکواس پر دھیان نہیں دیا اور اپنا کام کرتا رہا۔ اس کی جیب سے مجھے چشمہ بھی مل گیا تھا‘ جسے میں نے فوراً ہی آنکھوں پر لگا لیا۔

”ہوں......“ وہ تعریفی نظروں سے بولی: ”کافی ہینڈسم لگ رہے ہو۔“

”چلیں......!“

”ہاں چلو...... لیکن اس گدھے کا کیا کرو گے؟“

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ پھر میں نے فوراً ہی سنجیدگی اختیار کی اور اسے گھسیٹ کر پلنگ کے نیچے ڈال دیا:

”اگر اسے ہوش آ گیا تو......!“ گلنار پھر بولی۔

”صبح سے پہلے ناممکن ہے۔“ میں نے سر ہلایا: ”لیکن اگر رسی مل جائے تو بہتر ہو گا۔“

’’ٹھہرو...... میں دیکھتی ہوں۔‘‘ گلنار نے کہا اور دوسرے کمرے میں گھس گئی‘ جلد ہی وہ واپس آئی تو رسی اس کے ہاتھوں میں موجود تھی۔

میں نے جلدی جلدی اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور گلنار کی طرف متوجہ ہو کر بولا:

’’چلو...... اب جلدی کرو...... ہمیں وہاں پہنچنا ہے......‘‘

’’آرام سے‘ آرام سے۔‘‘ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی: ’’اتنی جلدی کس بات کی ہے؟ مجھے وقت کا اندازہ ہے‘ جب وہ لوگ تہہ خانے کی طرف جانے لگیں گے تو ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔‘‘

’’ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ جلدی کرو......‘‘ میں نے حیران ہو کر کہا: ’’اور اب یہ باتیں کر رہی ہو؟‘‘

’’وہ تو میں تم سے جھوٹ بول رہی تھی۔‘‘ وہ مسکرائی: ’’تا کہ تم بوکھلا جاؤ اور میرے سامنے ہی وہ کام کر ڈالو۔‘‘

’’کون سا کام......!‘‘ میں اب بھی حیران تھا۔

’’کپڑے بدلنے والا......!‘‘

’’اُفوہ...... تم سے تو حد ہے۔‘‘ میں بھنا کر بولا۔ واقعی یہ عجیب ہی لڑکی تھی۔

’’ارے...... اب مجھ پر غصہ مت کرو...... چلو نکلو یہاں سے‘ ٹائم ہو گیا ہے۔‘‘

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی‘ اسی وقت میرا ذہن سردار کی طرف چلا گیا۔ وہ اکیلا بے چارہ وہاں کیا کر رہا ہو گا......؟ کہیں کسی مشکل میں نہ پڑ گیا ہو۔ بہر حال اگر کچھ گڑ بڑ ہوئی تو یقیناً گلنار کو اس کی خبر ضرور ہوتی‘ اور پھر وہ مجھ سے تذکرہ کرتی...... ویسے میں نے اسے اب تک نہیں بتایا تھا کہ ہمارا ایک بندہ پہلے سے ہی تہہ خانے میں پہنچ چکا ہے۔

گلنار جیسے ہی اپنے مکان میں داخل ہوئی‘ تو واقعی کرسی صاحب کا ’’ٹولہ‘‘ تہہ خانے کا رخ کر رہا تھا۔ گلنار کے ایک بھائی نے اسے دیکھ لیا تھا اور ناک بھوں چڑھا کر اشارے میں پوچھا کہ وہ کہاں تھی......

گلنار نے بھی مسکرا کر انگلی گھماتے ہوئے اشارہ کیا کہ وہ گھومنے نکل گئی تھی‘ اس کے بھائی نے سرسری انداز میں ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دوبارہ کرسی صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ گلنار مجھے ان لوگوں سے ذرا ہٹ کر ہی لے کے چل رہی تھی۔

اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اتنی ذہین لڑکی کہاں پھنس گئی ہے۔ اسے تو شہر میں جا کر کسی اچھے عہدے پر فائز ہونا چاہئے تا کہ اس کے تیز طرار ذہن اور خدا داد صلاحیتوں سے لوگوں کو فائدہ حاصل ہو سکیں۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ جب گلنار اپنی سوچ کو مثبت انداز میں استعمال کر لی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم لوگ تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ میرا دل اس وقت نہ جانے کیوں دھک دھک کرنے لگا تھا۔ اب وہ موقع آنے والا تھا کہ جہاں مجھے ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ روحانی قوتوں کو بھی روئے کار لانا تھا...... میں اب تھوڑی ہی دیر باقی تھی کہ اس رسم کا آغاز ہو جانا تھا‘ وہی رسم...... جس میں ایک بے گناہ انسانی جان کا خون ہونا تھا اور اس خون سے شیطان کی مورتی کو نہلانا تھا...... تا کہ شیطان کی طاغوتی قوتوں میں اضافہ ہو سکے‘ تہہ خانہ اب روشنیوں سے جگ مگ کر رہا تھا۔

سب لوگ اس مورتی کے قریب آ کر لائن

سے کھڑے ہو گئے‘ عین اسی وقت تہہ خانے کا دروازہ پھر سے کھلا اور میں نے دیکھا کہ گلنار کے دو بھائی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہے تھے‘ ان کے ہاتھوں میں ایک بڑی سی کپڑے کی بوری تھی‘ سب لوگوں کے قریب آ کر انہوں نے بوری کو فرش پر رکھ دیا۔ سب لوگ بڑی توجہ سے بوری کی طرف متوجہ تھے۔ پھر ایک بھائی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تیز اور چمکدار چھری سے بوری کا منہ کھول دیا...... اور پھر میرا دھک سے رہ گیا‘ کیونکہ بوری کے اندر سے ایک انسانی جسم برآمد ہوا تھا جو کہ نیم بے ہوشی کی حالت میں لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا‘ یہ ایک خوبصورت نوجوان تھا نہ جانے یہ سفاک لوگ اسے کہاں سے پکڑ کر لائے تھے اور مجھے پورا یقین تھا کہ اسے یہاں لانے کا مقصد سوائے شیطانی بھینٹ چڑھانے کے اور کچھ نہیں تھا۔ میری آنکھیں اس نوجوان پر جم سی گئیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے دل کی دھڑکنوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

عین اسی وقت مجھے سردار کچل کا خیال آیا‘ میں نے بے ساختہ چاروں طرف نظریں دوڑائیں ...... لیکن اسے تو میں نے خود ہی پوشیدہ رہنے کی ہدایت کی تھی کہاں چھپا ہوگا وہ......! میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

عین اسی وقت کرسی صاحب کی آواز ہال میں گونجی:

”بہت خوب......! مجھے امید ہے کہ اس سال کی قربانی بھی ہمارے آقا کو بہت پسند آئے گی......!“

”ضرور...... ضرور......!“ کئی آوازیں ابھریں۔

”اب وقت ہوا چاہتا ہے‘ رسم کا آغاز کیا جائے......“ کرسی صاحب دوبارہ بولا تھا۔ گلنار میری شکل دیکھنے لگی۔

ادھر کرسی صاحب کا اعلان سن کر اس کے بھائیوں نے نوجوان کو اٹھایا اور شیطان کی مورتی کے قریب لے آئے‘ اس مورتی کے ہاتھوں کے قریب ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا تھا‘ انہوں نے نوجوان کو اسی چبوترے پر لٹا دیا‘ پھر ایک بھائی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری کو کرسی صاحب کے سامنے ادب سے پیش کر دیا۔

”اے میرے آقا......! ہر سال کی طرح اس سال بھی یہ مقدس فریضہ انجام دیں......“

”ضرور...... کیوں نہیں......“ اس نے ایک مکروہ سی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے چھری اس کے ہاتھ سے لے لی اور پھر اس نے شیطان کی تعریف میں چند جملے بولنے کے بعد نیم بے ہوش نوجوان کی طرف قدم بڑھا دیے۔

وہ گھڑی آ چکی تھی کہ جس کا میں منتظر تھا...... کرسی صاحب کے قدم لمحہ بہ لمحہ اس نوجوان سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے‘ پھر وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس نے ایک نظر نوجوان پر ڈالی اور چھری والا ہاتھ بلند کرنے لگا۔ اچانک ہی ایک گونجدار آواز نے سب کو ہی چونک کر اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا:

”ٹھہرو......!“

☆......☆......☆

یہ یقیناً میری ہی آواز تھی‘ جو کہ سردار کچل سے طے کیا ہوا اشارہ بھی تھا اور کرسی صاحب کو روکنے کا طریقہ بھی۔ چنانچہ دونوں ہی باتیں میری توقع کے عین مطابق ہوئیں۔ شیطان کے مجسمے کے نیچے کافی کشادہ خلاء تھا‘ سردار کچل برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس میں سے نکلا اور رعب

دار آواز میں دہاڑا۔

''تم سب اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو' ورنہ سب ہی کو بھینٹ پر چڑھا دوں گا' خون کی ندیاں بہہ رہی ہوں گی یہاں...... شاباش...... میں تین تک گنتی گنوں گا...... ایک...... دو......!!''

لیکن تین کی نوبت ہی نہیں آئی تھی' اس سے پہلے ہی سب کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے' ان سب میں میں اور گلنار شامل نہیں تھے' ہم دونوں ایک طرف ہٹ گئے۔

''کیا بات ہے سردار سچل......!'' میرے منہ سے نکلا۔ ''تم نے تو کمال ہی کر دیا۔''

''سب تمہاری کرامت ہے بادشاہ سائیں۔'' سردار نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا: ''ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا......!

اب حکم کرو...... بھون ڈالوں ان لوگوں کو......؟''

''مجھے سوچنے دو......'' میں واقعی سوچ میں پڑ گیا: ''کیا کروں......؟ اتنے لوگوں کو دھیان میں رکھنا بھی تمہارے لیے پریشانی کا باعث ہوگا......!''

''اس بات کی فکر مت کرو بادشاہ سائیں!'' وہ مسکرایا: ''اگر پچاس اور بھی لا کر کھڑے کرو گے، تو سچل سب کو اپنی نظروں میں باندھ کر رکھے گا...... اسے...... تم ہاتھ نیچے مت لاؤ...... اوپر کرو...... میں گولی مار دوں گا......!''

آخری جملے اس نے گلنار کے بھائی سے بولے تھے' جو شاید کسی قسم کی ہوشیاری دکھانے کے موڈ میں تھا۔ گلنار کا بھائی فوراً ہی چونک کر سیدھا ہو گیا تھا۔

''اگر تم لوگ بولو...... تو میں رسی لا کر دو......؟'' عین اسی وقت گلنار کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''اوہ...... اوہ...... باغی کتیا......!'' گلنار کے ایک بھائی نے دانت پیسے: ''تو بھی ان لوگوں کے ساتھ مل گئی ہے...... حرام زادی......!!''

گلنار نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی' وہ اب بھی میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی:

''یہ تو بہت اچھا ہوگا......'' میں نے جواب دیا: ''لیکن جتنی جلدی ممکن ہو سکے......''

''اوپر بنڈل رکھے ہیں...... دو تین بنڈل لے آتی ہوں۔''

''کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا......؟''

''نہیں...... مجھے بھلا کون روکے گا......؟'' وہ اس عالم میں بھی مسکرائی۔ میں نے سر ہلا دیا' وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ میرا اشارہ ملتے ہی وہ زینے کی طرف لپکی اور پھر اوپر چڑھ کر غائب ہو گئی۔ عین اسی وقت گولی کا دھماکہ ہوا اور ایک لرزہ خیز چیخ گونجی' ساتھ ہی کرسی صاحب کا ایک ساتھی لہرا کر فرش پر آ گرا:

''سب کو ایسے ہی مار ڈالوں گا......'' سردار سچل کی غراہٹ بہت بھیانک تھی۔ ''اب اگر کسی اور نے یہ حرکت کی تو میں اس کا بھی یہی حشر کروں گا......''

سب کے چہروں پر خوف دوڑ گیا تھا' سردار نے جس پر گولی چلائی تھی' وہ چند لمحے ہی تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں سردار کی شکل دیکھنے لگا۔ لیکن مجھے وہاں لاپروائی اور سفاکی کے علاوہ کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے انسان کا نہیں بلکہ کسی چوہے کو قتل کیا ہو۔

بہرحال اس کا یہ فائدہ ہوا کہ سب ہی الف کی طرح سیدھے ہو گئے' لیکن میں فکر مند ہو رہا تھا

کہ کہیں اس گولی کی گونج نے اوپر والوں کو ہوشیار نہ کر دیا......! سردار پچل نے عجلت میں کافی بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ گلنار سیڑھیاں اترتی ہوئی دکھائی دی‘ اس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کا تھیلا تھا‘ اس نے قریب آکر وہ تھیلا میری طرف بڑھا دیا‘ میں نے دیکھا اس تھیلے میں رسیوں کے گولے موجود تھے۔

عین اسی وقت گلنار کی نظر خون میں لت پت لاش پر پڑی۔ وہ ڈری تو بالکل نہیں البتہ اس نے حیرت سے مرنے والے کو دیکھا:

”یہ...... یہ کیا ہوا......؟“

”گڑبڑ کر رہا تھا...... میرے ساتھی نے گولی ماردی‘ آواز اوپر نہیں گئی......؟“

”یہ ہال ساؤنڈ پروف ہے......“ گلنار نے بتایا: ”بعض وجوہات کی بناء پر اسے اس طرز بنایا گیا ہے کہ یہاں کی آوازیں اوپر نہ جا سکیں......!!“

”اوہ......“ میں نے اطمینان کی طویل سانس لی۔

”بادشاہ سائیں......! یہ رسیاں کرسی صاحب کے حوالے کر دو......“ سردار پچل نے مجھ سے کہا: ”یہ گنجا ہی ہے نا کرسی صاحب!“

”ہاں......“ میرے منہ سے نکلا۔ کرسی صاحب نے ترچھی نظروں سے سردار کی طرف دیکھا تھا اور پھر جلدی سے منہ پھیر لیا۔ میں نے رسیاں اسی کے حوالے کر دیں۔

”اب کرسی صاحب......! اپنے ساتھیوں کے ہاتھ پاؤں خود ہی باندھو‘ لیکن اس میں کوئی ہوشیاری نہیں کرنا‘ کیونکہ میں بعد میں بادشاہ سائیں سے چیک کراؤں گا۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی ہوگی تو تمہیں بھی ہاتھ کے ہاتھ اس کا بدلا مل جائے گا...... اور میرے خیال میں ابھی تمہیں شیطان صاحب کی اور خدمت کرنا ہوگی‘ اس لیے تم کم از کم مرنا تو پسند نہیں کرو گے اتنی جلدی...... کیوں......؟“

کرسی صاحب اب بھی خاموش تھا‘ بہرحال اس نے اپنے ساتھیوں کو خوب ٹھونک بجا کر باندھا اور پھر ہاتھ اٹھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ سردار نے فوراً مجھے اشارہ کیا اور میں نے تمام رسیاں اچھی طرح چیک کیں‘ کرسی صاحب نے اس وقت کافی ایمان داری سے کام لیا تھا۔

اب میری باری تھی‘ چنانچہ میں نے خود کرسی صاحب کو بے بس کیا اور پھر سردار نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال پر پھونک مار کر اسے اپنے کپڑوں میں اڑس لیا‘ گلنار بے حد خاموشی سے ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ سردار اب آرام سے چلتا ہوا میرے پاس آیا اور پرسکون لہجے میں بولا:

”اب کیا کرنا ہے بادشاہ سائیں......!“

”میدان میں مجمع لگا ہوگا اور وہاں لوگ ان سب کا انتظار کر رہے ہوں گے...... اب ان کے بارے میں سوچو......!“

”میرے ساتھیوں نے انہیں بھی چاروں طرف سے گھیر لیا ہوگا...... اگر کہو تو اس میدان میں خون کے دریا بہادوں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں سردار......! کچھ اور سوچنا پڑے گا...... تم کچھ بتاؤ گلنار......!“

”میں...... میں کیا بتاؤں......“ گلنار نے زبان کھولی۔ ”آپ دونوں نے اتنی حیرت انگیز اور جامع منصوبہ بندی کی ہے کہ خود میری عقل بھی دنگ ہے...... اب آپ لوگ خود ہی فیصلہ کر لیں۔“

''ٹھیک ہے......'' میں نے سر ہلایا اور پھر اپنے مؤکلوں سے رجوع کیا' ان کا جواب ملنے کے بعد میں نے سردار سے کہا:
''سردار......! کرسی صاحب کی ٹانگیں کھول دو اور اسے اپنے پستول کی زد پر اوپر لے کر چلو......!!''
''واہ...... بادشاہ سائیں واہ......!!'' سردار جھوم اٹھا: ''کمال کا سوچا ہے تم نے......!!''
''لیکن اوپر بہت لوگ ہیں...... اگر کسی نے موقع دیکھ کر ہم لوگوں کو نشانہ بنا دیا' تو کیا ہوگا......؟'' گلنار نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ میں مسکرادیا اور آہستہ سے بولا:
''تم اس کی فکر مت کرو...... میں نے ابھی جن سے مشورہ لیا ہے' وہ حتمی شکل میں ہے اور اس پر عمل کرنے میں کسی قسم کے نقصان کا سامنا نہیں ہوگا۔''
''کس سے مشورہ لیا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ عین اسی وقت سردار جلدی سے بولا:
''بادشاہ سائیں......! اس بے ہوش سائیں کا کیا کرنا ہے؟'' اس نے قربان گاہ کی طرف پڑے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔
''اسے ہوش میں لانا پڑے گا...... اسے یہیں رہنے دو فی الحال...... بعد میں دیکھتے ہیں......!''
''بادشاہ سائیں......! اسے بھی اوپر ہی لے چلو' ہوش میں آئے گا تو اپنی راہ لے گا......!!''
''نہیں...... ابھی رہنے دو اور کرسی صاحب کو کھولو تاکہ اسے اوپر لے کر چلیں......!''
اور پھر سردار نے کرسی صاحب کے پہلو میں اپنا پستول رکھ کر اسے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ جلد ہی ہم لوگ اوپر پہنچ گئے۔ میں نے گلنار سے کہا:
''کیا تہہ خانے کا دروازہ بند ہوسکتا ہے! یعنی ہمارے جانے کے بعد کوئی اور اسے نہ کھول سکے...... کیا ایسا ہو جائے گا؟''
''ہاں...... نہایت آسانی سے......'' اس نے سر ہلا کر دیوار میں ہی کچھ کیا اور میری طرف گھوم کر بولی:
''اب صرف میں ہی اسے کھول سکتی ہوں اور یہ کسی سے نہیں کھلے گا...... اس کے بارے میں صرف میرے بھائیوں کو معلوم ہے۔''
''یہ تو بہت اچھی بات ہے......'' میں نے سر ہلایا۔
برآمدے میں دونوں پہریدار موجود تھے' میں نے آگے بڑھ کر کرخت انداز میں انہیں صورتحال سے آگاہ کیا اور کہا:
''تم میں سے ایک آگے جائے اور سب کو یہ خبر ہو جانی چاہئے کہ کرسی صاحب اور ان کے تمام ساتھی اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں' کرسی صاحب ہمارے ساتھ ہے اور باقی لوگ تہہ خانے میں ہمارے آدمیوں کی زد میں ہیں' اگر ہمارے ساتھ کوئی غلطی ہوئی تو کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا...... جاؤ...... بول دو جا کر......!!''
انہوں نے کرسی صاحب پر نظر ڈالی اور پھر بوکھلا کر الٹے قدموں دوڑ پڑے......
''بالکل گدھے ہیں......!'' میں بڑبڑایا: ''میں نے ایک کو جانے کیلیے کہا تھا۔''
''کیا فرق پڑتا ہے بادشاہ سائیں......!'' سردار نے گردن ہلائی۔
جلد ہی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور پھر کرسی صاحب کے خاص گارڈ اس طرف آتے دکھائی دیے پھر وہ ہم سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھے کہ کرسی صاحب چلایا:
''وہیں رک جاؤ...... اور یہ لوگ جو کچھ کہہ

رہے ہیں' اس پر عمل کرو...... میں اور میرے تمام ساتھی واقعی ان کے قبضے میں ہیں اور تمہاری کوئی بھی غلط حرکت ہماری جان لے سکتی ہے۔

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ اب ان کو صورتحال کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا

''اب...... اب ہم لوگ کیا کریں کریں صاحب......؟'' ان میں سے کسی نے پوچھا۔

''میں بتاتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا: ''کسی بھی طریقے سے اسی وقت قریبی شہر کے اعلیٰ سرکاری افسران سے ہمارا رابطہ کرواؤ اور ہماری ان سے بات کراؤ......!''

''ٹھیک ہے...... یہ ہو جائے گا......'' کہا گیا۔

جلد ہی مجھے ایک ٹیلی فون سیٹ لا کر دیا گیا جو کہ کسی بھی قسم کے تاروں سے عاری تھا۔ مجھے ایک نمبر بھی ڈائل کر کے دیا گیا اور بتایا گیا کہ ان صاحب کا نام محمود ہے اور یہ آئی جی پولیس کے عہدے پر فائز ہیں۔ جلد ہی کال ریسیو کر لی گئی:

''ہیلو اسلام علیکم...... آئی جی محمود احمد بول رہا ہوں۔ فرمائیے......!!''

میں نے مختصراً اسے صورتحال سے آگاہ کیا' اس نے کافی حیرت کا اظہار کیا اور پھر میں نے ان ہی لوگوں سے پوچھ کر اس علاقے کی نشاندہی کر دی:

''ٹھیک ہے جناب......! ہمیں صرف آدھ گھنٹہ لگے گا...... کیا صورتحال جب تک قابو میں رہ سکے گی......؟''

''ہم کوشش کریں گے......! میں نے جواب دیا: ''اگر ہو سکے تو اس سے پہلے ہی آنے کی کوشش کریں۔''

''جی...... ضرور......!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا...... اور سردار کے کان میں سرگوشی کی:

''سردار......! پولیس والوں کے آتے ہی اپنے آدمیوں کو ہٹا لینا ورنہ پھر......''

''وہ لوگ بہت ہوشیار ہیں......'' سردار نے سر ہلایا: ''خود ہی موقع دیکھ کر چلے جائیں گے......!!''

عین اسی وقت زوردار قسم کے دھماکوں کی آواز گونجی' سب ہی چونک اٹھے' البتہ سردار چل مسکرانے لگا تھا:

''یہ میرے ہی ساتھی ہیں بادشاہ سائیں......! ان تک خبر پہنچ گئی ہے' وہ فتح کا جشن بھی منا رہے ہیں اور میدان میں موجود نفری کو بھی اپنے بھرم میں لے رہے ہیں۔ وہ اس وقت گراؤنڈ کے گرد موجود درختوں میں چھپے ہوں گے۔''

''اوہ......'' میرے منہ سے نکلا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ٹیلی فون سیٹ بج اٹھا' میں نے ہی کال ریسیو کی۔

''ہیلو...... میں آئی جی محمود ہی بول رہا ہوں' آپ مجھ سے رابطے میں ہی رہئے گا۔ بس ہم لوگ تھوڑی دیر میں پہنچ رہے ہیں اور اسی لیے آپ کا رابطے میں رہنا بہتر ہوگا......''

''ٹھیک ہے جناب......!'' میں نے جواب دیا' رابطہ پھر منقطع ہو گیا۔ اب میں سردار چل کی طرف گھوما:

''دیکھو سردار...... یہ کارنامہ ویسے بھی تم نے ہی سرانجام دیا ہے اور تم ہی اس کے اصل ہیرو ہو...... اس لیے میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ہی آگے رکھوں گا' کیونکہ یہی مناسب ہوگا۔''

"کیا مطلب بادشاہ سائیں......؟" اس نے حیرت سے پوچھا' ویسے وہ بے حد چوکنا تھا اور چیتے کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں اس سارے معاملے میں پس پردہ رہوں گا اور ویسے بھی میں اب اپنی منزل کی طرف روانہ ہونے والا ہوں۔ تم پولیس کے افسران سے یہی کہنا کہ تمہیں اس بستی والوں پر کافی دنوں سے شک تھا اور آج انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا ہے......"

"لیکن بادشاہ سائیں......! یہ سارا کام تو آپ کا یہ......!"

"اس بات کو چھوڑو...... میں منظر عام پر نہیں آنا چاہتا' ورنہ میری زندگی کے مقصد میں رکاوٹیں آ جائیں گی اور میرے لیے مسئلے کھڑے ہو جائیں گے......"

"دیکھ لو بادشاہ سائیں......!" اس نے سر ہلایا: "ساری محنت تمہاری ہے......"

"نہیں...... یہ مت کہو۔" میں نے اس کی بات کاٹی: "تم اور گلنار نہ ہوتے تو شاید میں کچھ بھی نہ کر پاتا......اور ہاں...... میں جا رہا ہوں' تم گلنار کو وعدہ معاف گواہ بنا دینا......"

"تم کہاں جا رہے ہو بادشاہ سائیں......!"

"میری منزل مجھے بلا رہی ہے......" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس وقت گلنار نے میرا ہاتھ تھام لیا اور رو دینے والے انداز میں بولی:

"مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو' میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی......!"

"نہیں...... میں تمہیں سردار سچل کے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا: "اور مجھے امید ہے کہ سردار تمہیں اپنی سگی بہنوں جیسی عزت دے گا اور تمہارا خیال رکھے گا......"

یہ کہہ کر میں وہاں سے نکل آیا' میں جانتا تھا کہ گلنار رو رہی ہو گی اور خود سردار سچل بھی میرے اس فیصلے سے پریشان ہو گیا ہو گا' لیکن میں مجبور تھا...... اب یہاں رکنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اپنے مقصد سے ہٹ جاؤں اور کسی اور ہی رخ پر اپنی زندگی کو ڈال دوں' لیکن میں اس کے حق میں نہیں تھا۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا تھا' بہت کچھ دیکھنا تھا...... اصل بات یہ تھی کہ اب مجھے اپنے غائبانہ مؤکلوں سے بھی یہاں سے رخصت ہونے کا اشارہ مل چکا تھا۔

☆☆☆

رات کافی گزر چکی تھی۔ لیکن مجھے اپنا رخت سفر باندھنا تھا۔ چنانچہ میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا' بستی کے سرے پر آ کر میں رکا اور الوداعی انداز میں ایک بھرپور نظر اس شیطان کی بستی پر ڈالی اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرنوں کی آواز سے علاقہ گونج اٹھا۔ سرکاری مدد آ چکی تھی اور اب مجھے یقین تھا کہ سرکاری طور پر اس معاملے کو سنبھال لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں سردار سچل' گلنار اور سچل کے تمام ساتھی معاون ثابت ہوں گے......اب جو لوگ شیطان سے پناہ مانگیں گے' انہیں وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے گا اور باقیوں کو جیل کی سلاخیں نصیب ہوں گی' البتہ کرسی صاحب اور گلنار کے بھائیوں کو میرے حساب سے کڑی سزائیں ملنی چاہئے تھیں۔ کیونکہ یہ لوگ شیطان کے بہت اہم معاون تھے۔

ان ہی سوچوں میں گم ہو کر میں نے قدم آگے بڑھا دیا تھا......تھوڑی دیر بعد ہی میں بڑی سڑک کے قریب پہنچ گیا۔ عین اسی وقت مجھے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی' دور سے دو

گھوڑے دوڑتے ہوئے آرہے تھے اور ان کی ہنہناہٹ کی گونج بھی فضا کے سکوت کو متزلزل کر رہی تھی۔ یہ کون ہوسکتا ہے......! میں نے سوچا۔

''عین اسی وقت وہ قریب آ گئے اور میں نے دیکھا کہ ان گھوڑوں پر سردار پچل اور گلنار سوار تھے...... میں رکا تو وہ بھی میرے قریب ہی آ کر رک گئے۔ میرے دل کی حالت اس وقت عجیب سی تھی:

''نہیں بادشاہ سائیں......!'' سرکار کا انداز کھویا کھویا سا تھا: ''تمہارے بغیر زندگی بیکار ہے...... تم جہاں جا رہے ہو' ہمیں بھی لے چلو......''

اسی وقت گلنار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی' میں نے چونک کر اسے دیکھا اور جلدی سے اس کا شانہ تھام کر بولا:

''ارے......ارے...... یہ کیا کر رہی ہو؟''

وہ اور بھی بلند آواز سے رونے لگی اور جھٹ سے میرے سینے پر سر ٹکا دیا' میں بوکھلا اٹھا اور پیچھے سرکنے لگا:

''اتنا تو حق دے دو مجھے...... اتنی قربت تو دو......!'' گلنار نے روتے ہوئے کہا۔

''اس کی بات میں کافی اثر تھا۔ چنانچہ میں نے اسے سینے سے لگ کر رونے دیا اور اس کا سر تھپتھپانے لگا۔

''سردار......! معاملہ نمٹ گیا......؟''

''ہاں بادشاہ سائیں......!'' اس نے سر ہلایا: ''ابھی عام لوگوں کو تو چھوڑ دیا گیا ہے' باقی کارروائی کل دن کے وقت ہو گی...... بستی اب محاصرے میں ہے...... ہمیں بھی کل شہر جانا ہے تاکہ کاغذی کارروائی پوری ہو جائے...... مجھے اور گلنار بہن کو وہاں لے جایا جائے گا......''

''ٹھیک ہے......'' میں نے جواب دیا: ''میرے خیال سے کرسی صاحب اور اس کے ساتھیوں کو سخت سزائیں دی جائیں گی؟''

''ہاں...... اسی لیے گواہوں کی موجودگی ضروری ہے۔''

''اچھا...... اب مجھے اجازت دو تم دونوں...... میں جاؤں......!''

''آپ کو تو ہم لینے کیلیے آئے ہیں......'' گلنار کا لہجہ ہی بدل گیا تھا: ''آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا......!''

''دیکھو گلنار......! میرے ساتھ کچھ اور قسم کے مسئلے مسائل ہیں' برائے مہربانی تم سمجھنے کی کوشش کرو......''

''آپ واپس چلو اور اطمینان سے مجھے اپنے بارے میں بتاؤ......'' گلنار بولی: ''اس کے بعد میں جو فیصلہ کروں' اگر آپ کو پسند آ جائے تو مان لیجئے گا پھر میں آپ سے کوئی ضد نہیں کروں گی......''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے بادشاہ سائیں......!'' سردار نے بھی اس کی حمایت کی: ''ایک دن اور گزر جانے سے کچھ نہیں ہوتا' آپ کم از کم تھوڑا سا وقت تو ہمیں دے دو...... آپ نے ہم لوگوں کی زندگی کا رنگ ہی بدل دیا ہے' تو کیا ہمارا حق نہیں ہے کہ ہم چند دن آپ کی خدمت کر لیں' آپ کی مہمان نوازی کر کے ہمیں مزید اچھائیاں ملیں گی...... کیونکہ ہماری نظر میں آپ کی حیثیت بہت بلند ہے......''

اب میں نے بے چارگی کے عالم میں مؤکلوں سے مشورہ لیا اور ان کے مثبت جواب کے بعد میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا:

"ٹھیک ہے...... چلو......!!"
"بادشاہ سائیں......!!" سردار نے فلک شگاف نعرہ لگایا۔
"زندہ باد......!" گلنار کھلکھلا کر بولی تھی۔
بے اختیار میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

☆☆☆

سردار بچل مجھے اپنی بستی میں ہی لے آیا تھا' یہاں ابھی بھی دن کا ہی سماں تھا' بستی والوں نے ہم لوگوں کو دیکھ کر خوشی کے نعرے لگائے...... پھر "بادشاہ سائیں زندہ باد' کی گونجیں بھی سنائی دیں۔

پھر ہم تینوں ہی ایک بڑے خیمے میں آ بیٹھے' تھوڑی دیر بعد ہی سردار نے عمدہ قسم کے کھانوں سے میری اور گلنار کی تواضع کی' وہ خود بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شامل رہا تھا:

"نیند تو آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔" گلنار بولی: 'تو پھر کیوں نا آپ ہمیں ابھی اپنے بارے میں سب تفصیل سے آگاہ کر دیں......! اگر آپ کو کوئی زحمت نہ ہو تو......!!"

"تم مجھ سے اسی انداز میں بات کرو......" میں مسکرایا: "یہ لب و لہجہ اچھا نہیں لگ رہا۔"

"میں نے سوچا کہیں آپ کو میری کوئی بات بری نہ لگ جائے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا...... تم اسی طرح مجھ سے اپنا رویہ رکھو' جیسے پہلے تھا...... میری طرف سے اجازت ہے۔"

"شکریہ......" گلنار کے منہ سے نکلا۔

"کھانا کھانے کے بعد میں نے ازسرنو اپنی کہانی کا آغاز کیا' دونوں بڑی توجہ اور انہماک سے میری طرف متوجہ تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں پلکیں جھپکنے کا بھی ہوش نہ ہو۔ پھر جب میں خاموش ہوا تو کافی دیر بعد سردار بچل کے منہ سے نکلا۔

"اوہ...... مجھے تو پہلے ہی شک تھا' لیکن اب یقین ہو گیا کہ آپ واقعی کراماتی ہو' آپ کے پاس وہ فقیری ہے جو بادشاہوں کو بھی میسر نہیں ہوتی۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ میرا سفر بہت طویل ہے۔ مجھے جانے دو......!!"

"اگر میں اس سفر پر آپ کے ساتھ چلنا چاہوں...... تو......!" گلنار نے اچانک ہی پوچھا۔ میں اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب ہے......؟" میں نے پوچھا۔

"میں آج سے پہلے تک شیطان کی پیروکار تھی' گمراہ تھی' بدکار تھی...... لیکن اب میں نے اپنی ایک نئی زندگی کا آغاز کیا ہے اور یہ زندگی بھی مجھے آپ کے...... میرا مطلب ہے کہ تمہارے ہی دم سے ملی ہے...... اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اب یہ نئی زندگی میں بھی انسانیت کی خدمت کیلیے وقف کر دوں...... اور تمہارے اس مشن میں میں ہر لمحہ اور ہر قدم پر تمہارا ساتھ دوں...... اگر ایسا ہو جائے تو میں سمجھوں گی کہ میرے رب نے مجھے معاف کر دیا...... میں بھی اب آپ کے ساتھ مل کر مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں' ان کے کام آنا چاہتی ہوں......"

یہ سن کر میں سوچ میں ڈوب گیا' عین اسی وقت سردار بچل نے لقمہ دیا۔

"اس کی بات پر ضرور غور کرو سائیں......! ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں...... ہاں......!"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلایا: "میں اپنے صحرا والے وظیفے سے فارغ ہو جاؤں' پھر میرا وعدہ ہے کہ میں گلنار کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

یہ سنتے ہی گلنار کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں' اس نے جوش میں آکر سردار کے ہاتھ پر تالی دے ماری' پہلے تو سردار کچل چونکا اور پھر بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ اس کی اس حرکت نے مجھے اور گلنار کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے دو دن وہاں قیام کیا اور پھر دوسرے دن صبح کے وقت میں سردار کچل اور اس کے ساتھیوں سے رخصتی لے کر اور گلنار کی امید بھری آنکھوں کو دلاسہ دے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

دراصل گلنار کے بارے میں مجھے ہدایت بھی مل چکی تھی اور اب یہ لازمی تھا کہ میں اپنے چلے سے واپس آکر گلنار کو اپنے ساتھ لے جاؤں...... یہی وجہ تھی کہ پرسوں رات کے وقت مؤکلوں نے میری روانگی کو مؤخر کر دیا تھا۔

ابھی بھی سردار کی طرف سے پیشکش تھی کہ وہ میرے لیے سواری کا انتظام کر دے گا' لیکن میں نے اسے منع کر دیا اور کہا کہ یہ کام مجھے تنہا ہی کرنا ہے اور اس بارے میں میرے والد صاحب کی یہی ہدایت ہے۔ یہ سن کر سردار خاموش ہو گیا تھا۔

شام کے وقت میں اس عظیم الشان صحرا میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ بات حقیقت تھی کہ اس صحرا کی اپنی ہی ایک اہمیت اور خصوصی تھی۔ جب تیز ہوا کے جھکڑ چلتے تھے تو زمین کی ریت بھی اس ہواؤں سے لپٹ جاتی تھی...... اب چونکہ سورج ڈھلنے والا تھا' اس لیے اس ریت کی گرماہٹ اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی...... میں جس حصے میں داخل ہوا تھا' یہاں دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا...... میں نے آنکھوں پر ہاتھ کی ہتھیلی کا سایہ بنا کر چاروں طرف دیکھا اور پھر ایک ٹیلے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اب اسی ٹیلے کے دامن میں بیٹھ کر مجھے اپنا وظیفہ شروع کرنا تھا' چنانچہ میں ادھر ہی جا بیٹھا میرے سامنے ریت کے گرداب گردش کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر ستانے کے بعد اپنے کام کا آغاز کر دینا چاہئے' چنانچہ میں نے فوری طور پر اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور ٹانگیں پھیلا دیں۔

اس مہیب سناٹے میں دیوانہ وار اور سرکش قسم کی ہواؤں کا شور کافی پر ہول منظر پیش کر رہا تھا۔ میں اس دشت میں تنہا تھا' اگر میرا کوئی مقصد نہ ہوتا اور مجھے وظیفہ کرنے کی آرزو نہ ہوتی تو کیا میں تن تنہا یہاں کا رخ کرتا......! اب دھوپ بھی دم توڑنے لگی تھی اور مجھے سورج کے ڈوب جانے کا انتظار تھا...... میرے خیال میں اس وظیفے کے کامیاب نتیجے کیلیے ضروری تھا کہ میں نے جو وقت مقرر کیا تھا' اسی پر میں وظیفہ شروع کرتا۔ البتہ اس وظیفے کی تیاری کیلیے مجھے تھوڑی دیر بعد ہی اپنے ان کاموں میں مصروف ہو جانا تھا' جو کہ اسی وظیفے سے متعلق تھے' ایک سفری تھیلا بھی میرے ہمراہ تھا۔

ابھی میں تھیلا کھولنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ عین اسی وقت ایک آواز گونجی۔

''آدم زاد......! اے آدم زاد......!!''

میں بری طرح چونک اٹھا' یہ آواز نسوانی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے ہوا کے دوش پر سنائی دی ہو۔ میری نظریں بے اختیار چاروں طرف گھومنے لگیں۔ لیکن وہاں دور دور تک ریت کے ٹیلوں کے علاوہ کیا تھا......؟

''میں ادھر ہوں آدم زاد......!''

پھر وہی آواز گونجی' اگر کوئی مجھے آدم کہہ رہا تھا' تو خود کون تھا......! یہ سوال میرے ذہن میں گونجا۔ ساتھ ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز سے بولا۔

"کون ہو تم......؟ کہاں ہو......؟ سامنے
ؤ......!!"
"میں مجبور ہوں، سامنے نہیں آسکتی۔" آواز
ھر گونجی: "اسی لیے تمہیں پکار رہی ہوں۔ میری
د کردو......!!"
"پہلے یہ بتاؤ کہ تم ہو کہاں......؟"
"اس ٹیلے کے قریب جو بڑا سا پتھر پڑا ہے،
ں اسی کے نیچے ہوں......" جواب ملا۔
میں نے اس طرف دیکھا تو واقعی اس ٹیلے
کے کونے میں ایک کافی بڑا اور وزنی قسم کا پتھر
وجود تھا۔
"اگر تم اس پتھر کے نیچے ہو، تو کیا تم کوئی
نک ہو یا کوئی کپڑا......؟ کیونکہ اس پتھر کے نیچے
ی گنجائش تو نہیں ہوگی کہ کوئی انسانی جسم اس میں
اجائے۔"
"میں انسان ہوں بھی نہیں، جب ہی تو تمہیں
ں نے آدم زاد کہا ہے۔"
"اوہ...... تو پھر تم کون ہو......؟" میں پتھر
کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اپنا وظیفہ فی الحال میں بھول
کا تھا۔
"میں ایک جن زادی ہوں۔" جواب ملا۔
ور مجھے قبیلے کے سردار نے سزا کے طور پر یہاں
د کر رکھا ہے، یوں سمجھو کہ میں زندہ بھی ہوں اور
ن بھی ہوں......!!"
"قبیلے کے سردار نے تمہارے ساتھ یہ سلوک
یوں کیا ہے؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
"وہ میں ضرور بتاؤں گی، پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم
ھے یہاں سے نکال سکو گے؟"
"کس طرح نکالوں......!"
"یہ پتھر اپنی جگہ ہٹادو گے، تو میں نکل آؤں
ں......!"

"ٹھیک ہے، میں ایسا ضرور کروں گا۔ لیکن
تمہاری کہانی سننے کے بعد......!"
"کیا تمہیں اس واقعے سے ڈر نہیں لگ
رہا......؟"
"نہیں، میں ڈرنے والوں میں سے نہیں
ہوں۔ تم نے بالکل درست آدمی کا انتخاب کیا
ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے، کوئی عام انسان
ہوتا تو واقعی بھاگ جاتا......!"
"ہاں...... میں نے کہا نا کہ تمہارا انتخاب
بالکل صحیح ہے، اب تم شروع ہو جاؤ......!!"
"میں ایک جن زادی ہوں......" آواز
آئی۔ "میرا نام صومانہ ہے۔ مجھے سزا کے طور پر
انسانی روپ میں ڈھال کر اس جگہ قید کر دیا گیا
ہے...... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہوش
سنبھالنے کے بعد سے ہی آدم زادوں کی دنیا میں
بسی ہوئی تھی اور ان میں رہ کر میں جوان ہوئی
ہوں...... مجھے کئی بار میری ان حرکتوں پر روکا گیا،
باز پرس کی گئی۔ یہاں تک کہ قبیلے سے خارج کر
دینے کی دھمکی دی گئی، کچھ دنوں تک مجھ پر اثر رہتا
اور پھر میری وہی حرکتیں شروع ہو جاتیں......
سردار اور دوسرے لوگ مجھ سے نالاں ہو گئے،
کبھی بیزار تھے اور مایوس ہو چکے تھے...... آخر کار
ایک دن میری شادی کا فیصلہ ہوا اور......" وہ
تھوڑی دیر کو خاموش ہوگئی۔
"پھر کیا ہوا......؟" اس کے خاموش ہو
جانے پر میں بول اٹھا، اس کی یہ حرکت مجھے بری
لگی تھی کیونکہ کہانی کا تسلسل ٹوٹ رہا تھا۔
"میں نے اس شادی سے صاف انکار کر دیا
اور اس جن کے سر پر ناریل کا پانی لاکر ڈال دیا کہ
جس سے میری شادی طے ہونے والی تھی۔"

''تو ناریل کا پانی ڈالنے سے کیا ہوا؟''

''یہ ہماری روایت ہے کہ لڑکی اس پر ناریل کا پانی ڈالتی ہے' جسے اپنا حقیقی بھائی تسلیم کر لیتی ہے اور پھر اس سے شادی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا......''

''اوہ......'' میرے منہ سے نکلا: ''لیکن تم نے شادی سے انکار کیوں کیا......؟''

''میں اب جنوں کی آبادی میں زندہ نہیں رہ سکتی' انسانی وجود کے سائے میں ہی میری زندگی کی سانسیں پروان چڑھ سکتی ہیں...... میری ہمیشہ سے ہی خواہش رہی ہے کہ میں انسانوں میں رہوں اور اپنی عمر بتادوں......''

''ہوں......تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شادی نہ کرنے کی بناء پر تمہیں یہ سزا ملی ہے؟''

''نہیں......!'' اس نے میری بات روکی: ''میری قید و بند کی یہ وجہ نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا وجہ ہے......؟''

''کیا تم یقین کر پاؤ گے؟''

''میں فی الحال تمہاری باتوں پر یقین کرنے پر آمادہ ہوں......''

''ٹھیک ہے......'' آواز آئی: ''پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کس لیے آئے ہو؟ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ دشت و بیاباں ہے......''

''میں ایک عامل ہوں اور اپنے ایک خاص وظیفے کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔''

''اوہ...... اوہ...... تم عامل ہو......؟ کیا تم جنوں سے بھی مقابلہ کرتے ہو''

''ہاں......اکثر......!''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ میں جس طرح مظلوموں کی مدد کرتی ہوں' اسی طرح آج میں مشکل میں گرفتار ہوگئی ہوں تو تمہیں بھی میری مدد کیلیے یہاں بھیجا گیا ہے۔ورنہ اس ویرانے میں کون قدم رکھتا...... اور بالفرض اگر کوئی آ بھی جاتا تو میں کس طرح اس سے مخاطب ہوتی' تم چونکہ ان باتوں کے عادی ہو' اس لیے تم میری باتیں سن رہے ہو......اف...... میں بھی مالک کا جتنا بھی شکر ادا کروں' وہ کم ہے......!''

''تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ تمہیں کیوں یہ سزا ملی اور تم کن مظلوموں کی بات کر رہی ہو؟'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''میں عورتوں کی مدد کرتی ہوں۔'' اس نے انکشاف کیا: ''تمہاری دنیا کی عورتوں سے مجھے بے حد پیار ہے' محبت ہے...... کیونکہ یہ مخلوق اس کائنات کی سب سے خوبصورت مخلوق ہے...... اس لیے میں جہاں بھی انہیں مشکل میں' پریشانی میں یا کسی مصیبت میں مبتلا دیکھتی ہوں تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا اور میں اس مشکل کو' اس پریشانی کو اور اس مصیبت کو ختم کرنے کی جستجو میں لگ جاتی ہوں......''

''یہ تو...... یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔'' میرے منہ سے نکلا: ''لیکن تمہیں اس نیک راہ پر کس نے لگایا؟''

''کون لگائے گا مجھے اس راہ پر......؟ یہ سب کچھ قدرتی طور پر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری پیدائش کا مقصد ہی یہی ہے کہ میں بنت آدم کی خدمت کروں اور انہیں ناانصافیوں اور مظالم سے نجات دلاؤں۔''

میں اس کی باتوں میں کھو سا گیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اگر یہ سب سچائی پر مبنی تھا' تو میرے ارادوں کو ایک نئی مضبوطی مل سکتی تھی' اگر میں اس جن زادی کو آزاد کر دیتا تو یقیناً مجھے ایک بہترین

مددگار میسر آجاتا۔
''اب یہ بھی بتا دو کہ تمہیں سزا کیوں ملی تھی؟'' میں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔
میری اس بات کا فوری طور پر کوئی جواب نہ ملا اور خاموشی چھائی رہی' آخرکار جب یہی سکوت رہا تو میں نے دوبارہ پوچھا:
''تم خاموش کیوں ہو؟ جواب دو......!''
''بات کچھ ایسی ہے کہ میں بتانے میں تامل محسوس کر رہی ہوں۔'' آواز آئی: ''کیونکہ میں لاکھ آدم زادیوں کی حامی ہوں' ان کی خواہاں ہوں' لیکن ہوں تو جن زادی نا......! اس لیے یہ راز بتانے کیلیے مجھے کافی ہمت کی ضرورت ہے اور میں اس دوران کوشش کروں گی کہ تمہیں اس سے آگاہ کر دوں...... کیونکہ یہ بہت ذاتی سی بات ہے......''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر ہلایا: ''میں تمہیں اس بات پر مجبور نہیں کروں گا...... اب یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کس طرح آزاد کر سکتا ہوں......!''
''یہ پتھر میرے قید خانے کا دروازہ ہے۔'' آواز آئی: ''اگر تم اسے اپنی جگہ سے ہٹا دو' تو میں باہر نکل آؤں گی۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا...... کیونکہ یہ میرے قبیلے کے سردار کا رکھا ہوا طلسی پتھر ہے اور اسے ہٹانا تو دور کی بات ہے......اسے ہلانا بھی کسی انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔''
''مجھے اندازہ ہے۔'' میں نے سر ہلایا: ''میں ابھی اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا' تمہیں بھی ابھی انتظار کرنا ہوگا۔ میں پہلے اپنا وظیفہ شروع کرتا ہوں...... اس کے بعد ہی میں اپنی قوت بروئے کار لاؤں گا......''
''اوہ...... تمہیں کتنا وقت درکار ہوگا......!''
''پوری رات گزرے گی۔'' میں نے جواب دیا: ''کل صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے میرا وظیفہ ختم ہوگا......''
''اچھا......'' آواز آئی: ''ٹھیک ہے میں انتظار کروں گی۔ آج رات میں مجھے کم از کم یہ حوصلہ تو رہے گا کہ صبح مجھے آزادی کا پروانہ مل سکتا ہے......پھر کل جو ہوگا' وہ دیکھا جائے گا۔''
''جو وظیفہ میں شروع کرنے والا ہوں' اس پر عبور حاصل کرنے کے بعد مجھے پوری امید ہے کہ میں تمہیں اس قید سے نکال لوں گا...... رب العزت نے چاہا تو......!!''
''اور مجھے امید بھی یہی ہے کہ تمہیں میری ہی خاطر یہاں بھیجا گیا ہے...... تاکہ مجھے رہائی نصیب ہو سکے' میں نے بھی تو دوسروں کی مدد کرنے کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگائی ہے۔ تو پھر میں بھی کیوں تکلیف اور پریشانی میں رہوں گی......! جو لوگ دوسروں کی مدد کرتے ہیں' غیب سے ان کی مدد ضرور ہوتی ہے۔''
''تمہاری بات بالکل سچ اور حق ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔
''کاش اس دنیا کے مکینوں کو تمہاری اس بات کی سمجھ آجائے تو دنیا سے ہوس' خود غرضی' دھوکے بازی اور مکاری کا خاتمہ ہو جائے اور یہ دنیا مثل جنت ہو جائے...... کیونکہ جب اس دنیا میں نفرت اور کدورت نہیں رہے گی تو محبت پروان چڑھے گی......! اور محبت بذات خود جنت کے کسی خوشبودار پھل کی مانند ہے......!''
''کیا تم اپنا نام نہیں بتاؤ گے؟''
''میرا نام سلمان احمد ہے......!!''
''بہت خوبصورت نام ہے۔'' آواز آئی: ''تم لوگ جو نام رکھتے ہو' وہ مجھے بہت پسند آتے

ہیں۔"

"نام تو تمہارا بھی بہت اچھا ہے...... صومانہ......!"

"شکریہ......!!" آواز آئی: "اب تم اپنا کام شروع کرو، میں اب خاموش ہو جاتی ہوں تاکہ تمہارے کام میں کوئی حرج نہ ہو......!"

"ٹھیک ہے" میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا اور پھر واقعی خاموشی چھا گئی۔ اب میں اپنے وظیفے کی طرف متوجہ ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی میں اپنی پڑھائی کا آغاز کر چکا تھا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا اور اس دوران میں چاروں طرف گہرا اندھیرا چھا گیا...... اب صرف چاند اور ستاروں کی دھیمی اور ٹھنڈی روشنی تھی جو چاروں طرف طلسم بکھیر رہی تھی...... یہ ایک ہوش ربا منظر تھا۔

لیکن اس کی طرف متوجہ ہونے کیلیے میرے پاس قطعی فرصت نہیں تھی...... میں اپنے وظیفے میں ہی گم رہا۔

رات جب اپنے انتہائی عروج پر پہنچی تو اچانک ہی مجھے اپنے مؤکلوں کی طرف سے ہوشیار رہنے کا اشارہ ملا، میں سنبھل کر بیٹھ گیا...... مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں قطعی نہ گھبراؤں اور جو کچھ بھی ہو جائے لیکن میں اپنی جگہ نہ چھوڑوں اور وظیفے کو جاری رکھوں......!

چنانچہ میں ذہنی طور پر کسی نادیدہ حادثے یا حملے کیلیے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ جلد ہی مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، ہوا کے جھکڑ اب بھی چل رہے تھے، لیکن سامنے کے رخ پر اچانک ہی ایک بگولہ سا اٹھا اور ریت سے چند انچ اوپر اٹھ کر تیزی سے فضاء میں گھومنے لگا...... پھر یہ بگولہ کافی تیز رفتاری سے میری سمت بڑھنے لگا...... اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں واقعی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا، لیکن مجھے تو پہلے ہی ہدایت مل چکی تھی، چنانچہ میں اور بھی جم کر بیٹھ گیا۔

اب وہ بگولہ مجھ سے قریب ہوتا جا رہا تھا، قریب......اور قریب......اور بھی قریب!!!

☆......☆......☆

صحرائی گولے بے حد خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ بعض اوقات انسانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور اڑا کر لے جاتے ہیں...... اس کے بعد انسان کا کچھ بھی حشر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان بگولوں کی گردش تو پہلے ہی بہت تیز ہوتی ہے اور اس میں سنبھلنا ایک مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ یہ کہ فضاء میں کہیں پر بھی اس بگولے کی گرفت ڈھیلی پڑے اور اس کے اندر موجود انسان پھر کہیں پر بھی جا پڑے...... اوّل تو اس گردش سے ہی بچنا ناممکن ہوتا ہے اور پھر کسی بھی جگہ اتنی بلندی سے گرنا زندگی کیلیے محال ثابت ہو جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک خطرناک اور خونی بگولہ اس وقت مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اب مجھے تیز قسم کی ہوا کا دباؤ بھی شدت سے محسوس ہونے لگا تھا اور یہ ہوا مٹی اور ریت کو اڑا کر میرے اوپر بکھیر رہی تھی...... میں نے محسوس کیا کہ چند ہی لمحوں میں میرا چہرہ اور سر کے بال اس دھول اور ریت میں اٹ چکے تھے۔

میں اپنی جگہ پر مضبوطی سے جما رہا اور وہ بگولہ اب بالکل میرے قریب آ گیا، میں اس کی گردش کے دباؤ کو برداشت کرتا رہا، یہاں تک کہ مجھے اپنی سانسوں میں تیزی محسوس ہونے لگی...... میرے دل کی دھڑکنیں بھی بڑھ گئی تھیں۔

(اس دلچسپ داستان کے بقایا واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے)

بھکر سے ارسال کردہ سچا قصہ



بلائے جان

سائنس جنات کو نہیں مانتی مگر وہ ہمارے آس پاس ہی ہوتے ہیں مگر ہمیں نظر نہیں آتے...... چلہ ناکام ہونے پر اذیت میں مبتلا ہونے والے نوجوان کا قصہ

ملازم حسین شیرازی

ڈگری کالج ڈیرہ اسماعیل خان سے بی اے کا امتحان دیا ہوا تھا۔ ابھی رزلٹ آنے میں دو ماہ باقی تھے۔ ایک ہفتہ کے لیے اسلام آباد جانا پڑا۔ راولپنڈی ہوٹل میں قیام کیا۔ دوسری صبح اسلام آباد سیکریٹریٹ جانے کے لیے کوچ پکڑی راولپنڈی صدر سے سیکریٹریٹ کے لیے ایک نمبر کوچ ہر دس منٹ بعد چلتی ہے جو 22 کلومیٹر کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے کر کے پہنچتی ہے۔

میں جس وقت کوچ میں سوار ہوا۔ سواریاں تقریباً پوری تھیں صرف ایک سیٹ باقی تھی۔ دو دو اشخاص کے لیے سیٹیں تھیں ایک بزرگ، معزز دکھائی دینے والے نورانی چہرہ، ہلکی سفید داڑھی، سر کے بال تقریباً سفید تھے۔ سفید کاٹن کے شلوار قمیض میں ملبوس، اوپر کالی ویسٹ کوٹ، ہاتھوں میں سالن روٹی کا ٹفن پکڑے تشریف فرما تھے۔

میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا، آنکھوں ہی آنکھوں میں سر کو ہلاتے ہوئے دعا سلام کی۔ انہوں نے اسلام آباد آخری اسٹاپ سیکریٹریٹ کے لیے کرایہ ادا کیا تھا۔ کوچ روانہ ہوئی سواریاں اترتی چڑھتی رہیں لوگوں کے ہنسی مذاق تبصرے تو تو میں میں جاری رہے وہ صاحب سنجیدہ خاموش بیٹھے رہے۔

میں نے سوچا۔ شاید ہیڈ کلرک یا سپرنٹنڈنٹ ٹائپ اہلکار ہوں گے اس لیے کوچ میں سفر کر رہے ہیں پھر سوچا اگر سرکاری ملازم ہیں تو اسلام آباد میں ہر ملازم چوکیدار سے لے کر 22 گریڈ کے اعلیٰ افسر کے لیے سرکاری رہائش گاہیں الاٹ ہوتی ہیں۔ یہاں راولپنڈی میں کیا کام؟

اس سوچ بچار میں وقت کٹ گیا۔ آخری اسٹاپ آ گیا تھا وہ صاحب بھی اتر گئے۔ میں بھی اتر گیا اور اپنی اپنی منزل کی طرف رواں ہوئے۔

تیسرے دن پھر یہی اتفاق ہوا اس وقت میں کوچ میں بیٹھا تھا کہ وہ صاحب آتے دکھائی دیے۔ ڈرائیور کنڈیکٹر نے انہیں تعظیم دی۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی انہوں نے ہاتھ ملایا اور خاموشی سے بیٹھ گئے

راستے میں خاموشی رہی منزل پر پہنچتے وہ بھی اتر گئے میں نے بھی خدا حافظ کہا اور اتر گیا۔

جس دن میری ڈیرہ واپسی کی تیاری تھی اس سے ایک دن پہلے میں جناب سعید الزماں ڈپٹی سیکریٹری سے ملنے ان کے آفس سیکریٹریٹ گیا۔ وہ ڈگری کالج میں لیکچرار تھے اور ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ CSS کرنے کے بعد ڈپٹی کمشنر پشاور ہوئے تھے اور اب پلاننگ ڈویژن میں ڈپٹی سیکریٹری تھے میں جب اسلام آباد جاتا ان سے ملاقات لازمی کرتا وہ بہت مہربان اور مخلص انسان تھے۔

اپنے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کو کہا میری پیٹھ پیچھے داخلی دروازہ تھا۔ جہاں سے آنے والے حضرات داخل ہوتے تھے بات چیت کر رہے تھے کہ اچانک کسی کو داخل ہوتے دیکھا فوراً کھڑے ہو گئے۔ آنے والے حضرت کو سر سر کہنے لگے۔

''مجھے حکم دیا ہوتا۔'' میں نے مڑ کر دیکھا کہ کن صاحب کا استقبال کیا جا رہا ہے۔ دیکھا تو وہی صاحب تھے جو راولپنڈی سے بذریعہ کوچ آتے تھے اور دو تین دفعہ میرے ہمسفر بھی تھے انہوں نے مجھے دیکھا پہچان گئے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا اور خیریت دریافت کی۔

چار منٹ ان کی گفتگو جاری رہی جو کہ دفتری سرکاری امور سے متعلق تھی۔ پھر وہ واپس مڑ گئے میں نے تجسس کی حالت میں ڈپٹی صاحب سے پوچھا۔



"سر یہ کون صاحب تھے؟"

"آپ نہیں جانتے انہوں نے تو آپ سے خوش دلی سے ہاتھ ملایا۔ خیریت دریافت کی۔"

"میں نے کوچ کا ذکر کیا کہ دو تین دفعہ اِن کی ہم سفری میں راولپنڈی سے اسلام آباد آنا ہوا۔"

"یہ محترم شاہ صاحب ہیں۔ 22 گریڈ کے اعلیٰ افسر سیکریٹری پلاننگ منسٹری' بہت ایماندار' بہت نڈر' اُن کی اہلیت قابلیت صلاحیت کے سب معترف ہیں۔ انہوں نے صدر مملکت وزیراعظم' چیف سیکریٹری' سے کہہ رکھا ہے کہ بلاضرورت انہیں نہ تو بلایا جائے اور نہ ہی وہ یا ان کے نمائندے بلاضرورت بے مقصد ان کے پاس آئیں۔" مزید کہنے لگے۔

"شیرازی صاحب...... یہ وہ بندہ خدا ہے جس کے ایک لیٹر پر حکومت پاکستان کو آئی ایم ایف ورلڈ بینک' ودیگر بین الاقوامی اداروں سے بوقت ضرورت قرض ملتا ہے A-1 کیٹگری کے بنگلے کے اہل ہیں۔ دو عدد گاڑیاں ہمہ وقت ان کے لیے مخصوص ہیں نوکر وغیرہ سب سہولتیں میسر ہیں لیکن انہوں نے یہ سب لینے سے معذرت کرلی ہے کہ انہیں اُن کی ضرورت نہیں۔ ان کی صرف ایک بیٹی ہے جو اوٹاوا کینیڈا میں یواین او کی نمائندہ خصوصی ہے۔ اس کے علاوہ گھر کا اور کوئی فرد نہیں۔ پھر یہ سب آسائشیں کیوں؟ انہیں Avail کرنے سے حکومت کو نقصان ہے بے جا مصرف ہے۔"

"محترم اسی کا نام دنیا ہے اگر برائی عام ہے برے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں تو اللہ کے نیک اور اچھے بندے بھی ہیں جن کی وجہ سے یہ نظام قدرت چل رہا ہے شاہ صاحب ان میں سے ایک ہیں۔"

"بہت حیرت ہے لیکن ان کا راولپنڈی سے روزانہ آنا؟"

"صدر راولپنڈی میں راحت بیکری کے سامنے ایک فلیٹ کرایہ پر لیا ہے اسی میں اُن کی رہائش ہے کھانا وغیرہ خود پکاتے ہیں اور لنچ اپنے ساتھ لاتے ہیں۔"

"ناقابل یقین ان کی بیٹی کے علاوہ باقی فیملی کہاں ہے؟"

"ایک بیٹی کے علاوہ دوسرا کوئی رشتہ دار نہیں یہ تو آپ کے شہر ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق رکھتے ہیں۔"

میں نے ذہن پر زور دیا کہ ڈیرہ کے قدیم اور پوش محلے علاقہ میں سیدات فیملی تھی۔ بہت بڑا گھر تھا جس کے مالک اسلام آباد میں رہتے ہیں باقی نوکر چاکر اسی گھر میں رہتے ہیں۔ آج پتہ چلا کہ اسی گھر کے مکین اور وارث یہی شاہ صاحب محترم ہیں۔ میری نظر میں ان کی عزت احترام بہت بڑھ گیا تھا۔ ان سے ملنے کی خواہش تھی لیکن دوسرے دن ڈیرہ آنا ضروری تھا۔ یہ تمنا اسلام آباد میں پوری نہ ہوئی۔

ایک سال بعد شاہ صاحب سیکریٹری کی پوسٹ سے ریٹائرڈ ہو گئے تھے اور پھر وہ اپنے گھر ڈیرہ اسماعیل خان تشریف لائے اکیلے ہی تھے نوکر' چاکر' مریدین عقیدت مند ساتھ تھے۔

میری گورنمنٹ لٹریزی آفس میں تعیناتی ہوگئی تھی میں کبھی کبھی ان کے آستانے پر حاضری دیتا تھا۔ شاہ صاحب کے والد' دادا' بزرگ مانے ہوئے مرشد پیر تھے۔ شاہ صاحب بھی علم عملیات میں کامل تھے۔ انہوں نے کئی چلے کاٹے تھے۔ اب وہ ضرورت مندوں کی داد رسی کرتے' ان

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ درختوں کے جھنڈ تلے ہوا بند ہو پتے نہ ہل رہے ہوں ایسے میں درخت کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں دن کو یہ درخت آکسیجن چھوڑتے ہیں اب کوئی شخص ان درختوں کے نیچے رہے تو یہ کاربن گیس کی زد میں آتے ہیں اور عام فہم لوگ سمجھتے ہیں کہ جنات نے حملہ کردیا۔

سب اپنی تاویلیں اور دلیلیں دے رہے تھے حقیقت وہی تھی جو میں محسوس کررہا تھا۔ نہ تو میں درختوں کے نیچے گیا نہ اپنی مخصوص جگہ سے نورات حرکت کی میں تو کھلے میدان میں آلودگی سے دور تھا۔

گھر میں تیس چالیس اعلیٰ نسل کے کبوتر تھے روانہ رات کو تین چار مرجاتے صبح گھر میں مری حالت میں ملتے۔

حالانکہ گھر میں کبوتر کو رکھنا کوئی گناہ نہیں کبوتر گھر میں موجود جنوں کے بچوں سے کھیلتے ہیں اور گھر کے مکین اُن کی شیطانی حرکات سے محفوظ رہتے ہیں یہ ساری کارروائیاں نادیدہ شیطانی قوت کے زیر اثر تھیں (جب میں صحت یاب ہوگیا تو ان کبوتروں کا مرنا ختم ہوگیا تھا)۔

تین دن تین راتیں بڑے عذاب میں گزاریں۔

ڈاکٹر، حکیم، عامل کی دوائیاں، دم، تعویذ اثر نہ کررہی تھیں۔ میری چیخوں اور درد ناک آوازوں سے ہمسائے اور قرب وجوار کے لوگ ڈر اور خوف میں مبتلا تھے۔

میرے گھر والے جانتے تھے کہ میرا محترم شاہ صاحب کے پاس آنا جانا ہے ان کے دم درود سے یہ اذیت ختم ہوسکتی ہے لیکن وہ تو ملک سے باہر تھے۔

آخر میری اس ناگفتہ بہ حالت کے چار دن بعد شاہ صاحب ڈیرہ تشریف لائے والد صاحب اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ فوراً ہمارے گھر آئے میری حالت دیکھ کر سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے سب کو کمرے سے باہر نکال دیا۔

کچھ ضروری چیزیں جیسے کلیجی، بکری کا دودھ وغیرہ منگوایا۔ دروازہ بند کرکے میرے سرہانے دوزانوں بیٹھ گئے۔ اور اونچی آواز سے کلمات پڑھنے لگے۔ اُن کی آواز میں بہت سوز درد تھا جونہی وہ کلمات پڑھتے جارہے تھے میرا جسم حرکت میں آرہا تھا۔

کلیجی بھون کر کھلائی دودھ پلایا۔ وہ سارا دن میرے پاس رہے۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت میں پورے حواس میں آگیا۔ اب انہیں اور گھروں کو پہچان سکتا تھا حالت بہتر ہورہی تھی درد، تکلیف، مفقود تھی۔

اطمینان حاصل ہورہا تھا تین چار دن بعد میں پوری طرح صحت یاب ہوگیا۔ جنات خلائی مخلوق، شیطانی چیلے سب دفع دور ہوگئے تھے۔

بقول شاہ صاحب کہ میں نے احتیاط نہ کی، گوشت دیکھنے سے سب کچھ الٹ گیا۔ سورۃ یٰسین کا حصار اور کلام پاک کی برکتوں سے صحت یاب ہوا اب کبھی چلہ وغیرہ کی بات نہ کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔

المیہ یہ ہے کہ آج کا ڈاکٹر، دانشور، پڑھا لکھا طبقہ جنات کو نہیں مانتا۔ حالانکہ قرآن پاک میں کئی جگہ ان کا ذکر ہے ہمیں بحیثیت مسلمان ایمان لانا ہے۔

”میں پناہ مانگتا ہوں جن و انسان کے شر سے۔“ (قرآن پاک)

☆☆......☆☆

''میں تمہیں نیک وارفع مقاصد کے حصول کے لیے دس روزہ چلہ بتاتا ہوں۔ اسے اگر کامیابی سے ادا کیا اور اس کی انجام دہی میں سرخرو ہوئے تو تم کامل انسان ہو گے۔ انہیں اچھی طرح یاد کرلو۔''

''قبلہ سائیں آپ کی بڑی عنایت' نوازش' میں ہمہ تن گوش ہوں' آپ فرمائیں۔''

''گھر سے دور کسی ویران سنسان' غیر آباد علاقے میں چلہ کاٹنا ہوگا۔ اپنے ساتھ جائے نماز' تسبیح' سورۃ یٰسین' پاک صاف چادر رکھنی ہوگی دس دن رات باوضو رہو گے پنج وقت نماز ادا کرو گے۔''

''ایسی جگہ کا انتخاب کرو گے جہاں کسی کا گزر نہ ہو۔ جائے مخصوصہ کا انتخاب کر کے ایک دائرہ کھینچنا ہوگا اس جگہ کو صاف کر کے چادر' دری بچھا دیں۔ جائے نماز' سورۃ یٰسین' تسبیح آگے رکھیں۔ ہو سکے تو کوئی صراحی لوٹا یا کوئی ایسی چیز اپنے ساتھ رکھو جس میں ہر وقت پانی موجود رہے تاکہ وضو کے لیے تمہیں اِدھر اُدھر نہ جانا پڑے۔''

رات بارہ بجے سے صبح بوقت اذان و نماز اسی جگہ قیام کرنا ہوگا۔''

''انہوں نے عمل بتایا کہ اس کا ورد کرنا ہے چلہ کے دوران 3 باتیں سختی سے قائم کرنی ہوں گی۔''

''گھر سے آتے جاتے کسی جنازے پر نظر نہ پڑے مردہ نہ دیکھو۔''

''قبرستان کے قریب سے نہیں گزرنا نہ کوئی قبر دیکھنی ہے۔''

''دس روزہ چلہ کے دوران اور چھوٹے بڑے گوشت سے پرہیز کرنا ہے گوشت نہ تو کھانا ہے نہ ہی دیکھنا ہے۔''

''جس وقت بسمہ اللہ پڑھ کر چلہ شروع کرو گے پہلی رات تم کو اپنے وجود میں کاہلی سستی محسوس ہوگی ایسا محسوس کرو گے جیسے جسم میں حرکت نہیں۔''

''دو چار رات بخار کی کیفیت رہے گی پسینے آئیں گے دورانِ خون بند ہوتا نظر آئے گا کسی نے نچوڑ کر نحیف و کمزور کر دیا ہے ہر رات یہ تکلیف بتدریج بڑھتی گھٹتی رہے گی۔''

''پانچویں رات تمہیں دکھائی دے گا کہ کوئی خلائی مخلوق' جنات تمہارے آگے پیچھے دندنا رہے ہوں۔''

چھٹی رات اس رات جنات کی چیخوں کی آوازیں بہت بلند ہوں گی تمہیں ہرگز نہیں ڈرنا' تمہاری طرف پیش قدمی کریں گے خوف زدہ کریں گے تم قطعی خوف نہ کھانا آتشی مخلوق ہوں گی۔''

ساتویں رات اس رات جنات کے ہاتھوں میں تیر' بھالے' نیزے ہوں گے جو تم پر وار کرنے کے لیے دکھائیں دیں گے فضا میں خونریزی کا سماں دکھائی دے گا۔ ہر طرف آسیب کے سایے ہوں گے۔''

آٹھویں رات اس رات جنات کے ہمراہ شور مچاتیں عورتیں' ننگ دھڑنگ بچے اچھلتے کودتے نیزوں کی انیوں کی طرح دانت نکالے دائرہ کی طرف رجوع کریں گے۔''

''نویں رات ہر طرف شور سرابہ چیخ و پکار سنائی دے گا مختلف اوزاروں سے تمہارے چہرے خصوصاً آنکھوں کو نشانہ بنائیں گے۔''

''دسویں رات تمہارے چلے کا اختتام ہوگا اس رات تم دیکھو گے کہ زمین و آسمان فضاؤں میں شیطانی رقص کیے جا رہے ہیں۔ تیر پھینکے جا رہے ہیں۔ نیزوں سے حملے ہو رہے ہیں لوہے

کی آگ پھینکتی سلاخیں تمہارے جسم کو نشانہ بنا رہی ہیں آتشی مخلوق تمہیں قابو کرنے کے درپے ہوں گی۔ چلے کے دوران تمہیں بڑی ہمت' جرأت' بے خوفی' قوت ارادی کو اجاگر کرنی ہوگی۔ ڈر خوف کے قریب بھی نہ پھٹکنا ہوگا۔ تمہیں اپنے دل میں یہ یقین پختہ کرنا ہوگا کہ ان شیطانی چیلوں اور جنات کے مقابل قرآنی عمل ہوگا۔ سورۃ یٰسین کا پاک کلام ہوگا۔ پڑھتے وقت ورد کی موجودگی میں تمہارا کچھ نہ بگڑے گا۔ اگر کسی لمحے ڈر گئے۔ خوف زدہ ہوئے بے توجہی ہوئی تو پھر تمہارا بچنا مشکل ہوگا اگر چلے میں کامیاب ہوگئے تو پاک پروردگار تمہیں نیک صالح بندہ بنادے گا۔ خلق خدا کے لیے برکتوں اور وسیلوں کا باعث ہوں گے۔"

شاہ صاحب نے جو ہدایات دیں میں نے اچھی طرح ازبر کرلیں۔

میں بڑے غور اور انہماک سے یہ باتیں سن رہا تھا ایک بات دل میں آئی پوچھا۔

"شاہ صاحب...... جنات کو کیا دشمنی ہوتی ہے کیوں راہِ راست پر چلنے والوں اور نیک کلام پڑھنے والوں کے لیے بالائے جان ہوتے ہیں۔"

"یہ سب ان کے گرو شیطان کی کارستانی ہوتی ہے جو ان جنات اور طاغوتی قوتوں کے ذریعے لوگوں کو نیکی کے راستے سے بدظن کرتے ہیں کہ خلق خدا اپنے پاک پروردگار اور قادرِ مطلق کی طرف رجوع نہ کرے۔"

دوسرے دن شاہ صاحب اسلام آباد روانہ ہوگئے اور وہیں سے اُن کی کینیڈا رات کی فلائٹ تھی۔ پندرہ دن بعد اُن کی واپسی متوقع تھی ان کے جانے کے بعد میں اس عمل کی ادائیگی کے لیے تیار ہوگیا۔

موٹر سائیکل لی ایک صاف وردی' جائے نماز' سورۃ یٰسین' ایک عدد تسبیح' چمڑے کی بنی پانی کے لیے چھوٹی سی مشک لی' والدہ صاحبہ اور گھر والے تشویش میں تھے کہ کیا ہو رہا ہے میں نے انہیں بتایا۔

"مقابلے کی امتحان CSS کی تیاری کر رہا ہوں۔ اپنے دوست کے گھر مل کر پڑھائی کریں گے۔ دس روز کی معروفیت ہوگی۔ رات کو روانگی ہوگی صبح واپسی ہوگی۔"

گھر سے دور دس کلومیٹر ایک وسیع' غیر آباد' ویران علاقہ تھا جہاں آج کل گومل یونیورسٹی ہے یہ نواب آف ڈیرہ کی ملکیت تھی۔ انہوں نے ہزاروں کنال اراضی حکومت پاکستان کو گومل یونیورسٹی کے لیے عطیہ دی۔ تاکہ قرب وجوار کے اضلاع کے طالب علم اپنی علم کی پیاس بجھا سکیں۔"

اس یونیورسٹی کی بنیاد 1975ء میں رکھی گئی اور تین سال میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس کے پہلے وائس چانسلر نواب آف ڈیرہ اللہ نواز خان تھے جنہوں نے کیمبرج یونیورسٹی لندن سے بار ایٹ لاء کیا تھا۔ ان کے اس وقت روم میٹ عبدالحفیظ پیرزادہ کے والد عبدالستار پیرزادہ تھے جو بعد میں وزیراعلیٰ سندھ ہوئے قیام پاکستان سے قبل اور بعد نواب صاحب صوبہ سرحد (اب کے پی کے) کے اٹھارہ سال ڈپٹی اسپیکر و اسپیکر رہے تھے۔

اس ویران اور سنسان علاقے میں اپنے لیے جگہ پسند کی میں نے وہاں تک پہنچنے کے لیے ایسے راستے کا انتخاب کیا تھا جہاں مذکورہ بالا اعمال میں کوئی رکاوٹ یا خدشہ نہ پڑے۔

"نو راتیں بڑی اذیت اور تکلیف میں گزریں کھانے پینے سے رغبت جاتی رہی۔ کمزوری بڑھ گئی صحت خراب ہونے لگی چہرے کا

رنگ اڑ رہا تھا۔ گھر والے پریشان تھے میں نے بتایا کہ پڑھائی کی وجہ سے یہ حال ہے۔ اب تو کیفیت یہ تھی کہ موٹر سائیکل نہ چلایا جا رہا تھا اکثر گر پڑتا تھا۔

شاہ صاحب نے درپیش آنے والی جو صورت حال سے آگاہی دی تھی وہ ہو بہو عملی طور پر واضح ہو رہی تھی میں قوت ارادی اور نیک نیتی کے جذبے سے سرشار اس عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنے تئیں بہت کوشش کر رہا تھا۔ ہر وقت رب العزت سے توبہ استغفار کرتا اور کامیابی کے لیے دعائیں مانگتا رہتا عمل کے دوران شیطانی اور طاغوتی قوتیں اپنے مذموم افعال میں بہت ہراساں کر رہی تھیں۔ ڈرا رہی تھیں۔ خوف زدہ کر رہی تھیں میں نے نو راتیں اس عمل میں گزاریں دیں اب دسویں رات باقی تھی آخری رات یہ اگر کامیابی سے کٹ جاتی تو میرا چلہ مکمل ہو جاتا۔

نویں رات ختم ہوئی صبح نماز پڑھی رات موٹر سائیکل نہیں لایا تھا خرابی صحت کی وجہ سے چلانا مشکل تھا۔ وہیں نزدیکی گاؤں سے رکشہ پکڑا اور گھر روانہ ہوا۔ میں نے ان نو راتوں میں بہت تھوڑا کھایا پیا تھا۔ اب شدت سے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ سوچا کہ گھر جاتے وقت بیکری سے ڈبل روٹی مکھن، جام، جیلی وغیرہ لے لوں گھر جا کر ڈھنگ سے ناشتہ کروں گا۔

کیا پتہ تھا بازار سے خریداری مہنگی پڑھ گئی۔ ساری محنت کاوش پر پانی پھر جائے گا۔ ہوا یہ کہ صبح 6 بجے کا وقت تھا میں بازار سے گزر رہا تھا کہ ذبح خانے سے ذبح شدہ گائے کو گاڑی میں لایا جا رہا تھا جسے قصائی کی دکان پر پہنچانا تھا۔ سرکاری لازمین اس گوشت پر اوکے کے ٹھپے لگا رہے تھے۔

میری نظر اس گوشت پر پڑی میں تھرا کے رہ گیا۔ پریشان و ہراساں ہو گیا۔ آنا فانا میری قمیض کی اگلی جیب سے روئی جیسا نرم گولا جو کہ تیز پیلے رنگ کا تھا شوں کر کے جیب سے نکلا اور فضاؤں میں بکھر گیا۔ اس روئی جیسے گولے نے اردگرد کے ماحول کو زرد کر دیا تھا۔

عجیب آوازیں سنائی دے رہی تھیں میرے جسم میں خنجر پیوست ہو رہے تھے مجھے یقین تھا کہ یہ سب کچھ مجھے دکھائی دے رہا ہے باقی لوگوں کو خبر ہی نہ تھی میرا جسم درد سے پٹا جا رہا تھا۔ میں گر گیا پھر مجھے ہوش ہی نہ رہا۔

وہاں پر موجود لوگ مجھ سے آشنا تھے میرے گھر کا پتہ جانتے تھے مجھے میرے گھر بے ہوشی میں پہنچا دیا۔ گھر والوں کو بتایا۔

''بیکری سے سودا لینا چاہتا تھا کہ کمزوری کی وجہ سے گر گیا۔'' میرے گھر والے بہت پریشان تھے ڈاکٹر کو بلایا گیا انہوں نے انجکشن لگایا۔ دوائی دی نیند کی گولیاں دیں لیکن یہ سب بے سود تھا میں تڑپ رہا تھا۔ چیخیں مار رہا تھا یہاں تک کہ میرا جسم سارے کمرے میں تھرک رہا تھا۔ میں کسی کے قابو میں نہ آ رہا تھا کیفیت یہ تھی کہ میرا جسم تھرکتا ہوا چھت سے ٹکرا جاتا۔

لہولہان ہو جاتا گھر والوں نے بیڈ باہر نکال دیا صرف فرش پر میٹرس پر لٹا دیا اور میرے ہاتھوں اور پیروں کو زنجیروں سے جکڑ دیا کہ میں حرکت نہ کر سکوں۔ گھر میں آہ و بکا اور موت کا سماں تھا عاملوں کو بلایا گیا بقول ان کے رات کو گھنے درختوں کے نیچے جانے سے جنوں کے کھیلتے بچے زخمی ہوئے ان کے پیروں تلے آ گئے۔ پھر جنوں نے حملہ کر دیا۔ جس کی وجہ سے یہ حالت ہوئی جبکہ

کے مسائل حل کرنے میں مدد دیتے' فی سبیل اللہ درود کرتے' کسی سے کوئی نذر نیاز تھے ہرگز نہ لیتے تھے۔

انہوں نے اپنے پیش کاروں کو سختی سے ہدایت دی ہوئی تھی کہ کسی سائل موکل سے کچھ نہیں لینا۔ وہ اللہ پاک کی رضا کی خاطر خدمت خلق کے جذبے سے سرشار دوسروں کی تکلیفوں میں مدد کرنے میں ہروقت تیار رہتے۔ اللہ پاک نے انہیں بہت کچھ دے رکھا تھا آبائی اراضی تھی جنگی آمندی سے وہ اپنے مریدوں کو نوازتے تھے۔ انہیں اس زمانے میں 35 ہزار روپے ماہوار پنشن ملتی تھی جو ان کی گزر اوقات کے لیے کافی تھیں۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ بہت مان سمان دیتے میں بھی اُن کی حتی الوسیع دل سے خدمت کرتا تھا۔

اب ان سے ملاقات کرنے والوں میں بیورو کریٹ' فوجی جنرلز' ریٹائرڈ' حاضر سروس اعلیٰ سرکاری ملازمین تھے وہ ان کی بہت عزت احترام تعظیم کرتے تھے۔

ان کی دیکھا دیکھی مجھے بھی شوق چرایا کہ میں کوئی چلہ کاٹوں' دوسروں کے کام آؤں۔

ایک دن فارغ اوقات میں شاہ صاحب سے گزارش کی کہ مجھے بھی کوئی علم عملیات عطا فرمائیں۔ کوئی چلہ بتائیں آپ کے نقش پا پر چلنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے فرمایا۔

''بیٹا یہ علم عملیات چلہ کوئی آسان نہیں بہت جاں جوکھوں کا کام ہے انہیں حاصل کرنے کے لیے کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔''

''قبلہ سائیں میں ان کی ادائیگی میں ہر کٹھن امتحان کے لیے تیار ہوں میری دلی آرزو ہے کہ میں خدمت خلق میں اپنی باقی زندگی گزاروں۔''

''آپ کا پریوار ہے خاندان ہے سرکاری ملازم ہے ذمہ داریاں ہیں ان حالات میں انہیں حاصل کرنا نہایت دشوار ہوگا۔''

''قبلہ سائیں آپ کی دعا شفقت اور نظرِ التفات شامل رہی تو مجھے کوئی ڈر خوف نہ ہوگا۔''

''اچھا سوچیں گے پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔''

کچھ دنوں کے بعد شاہ صاحب نے مجھے بلایا۔ فرمارہے تھے کہ میں دس پندرہ دنوں کے لیے اپنی بیٹی کے پاس اوٹاوا (کینیڈا) جارہا ہوں گھر میں خدمت گار ہوں گے لیکن اندر والے کمروں کی چابیاں اپنے پاس رکھیں۔ ان کمروں میں میری نایاب کتب' تبرکات ہیں ان کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔''

دوسرا چلے کے بارے میں سوچا اگر تم اصرار کرتے ہو تو نیک نیتی اخلاص کے ساتھ عمل کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں اجازت دیتا ہوں میری باتیں دھیان سے سنو۔''

''ہر چلہ مثبت بھی ہوتا ہے اور منفی بھی' منفی یہ کہ عامل غلط راہ اختیار کرتا ہے دھن' دولت' دنیاداری کے لوازمات اس کا مطمع نظر ہوتا ہے جادو ٹونا کالا علم' تعویذ گنڈے وغیرہ اس کا حاصل ہوتا ہے دراصل شیطانی راہوں پر چلنا اپنا مقصد حیات سمجھتا ہے۔''

''مثبت یہ کہ کسی کی بیماری' جنات کا حملہ' چھوٹے موٹے امراض' نفسیاتی اُلجھنیں' ایسی حالت میں مریضوں کے کام آنا پاک کلام کا ورد کرنا' دم درود رکھنا بغیر کسی لالچ' حرص طمع کے' یہ مثبت ہے کارِثواب ہے۔'' شاہ صاحب سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے۔



کراچی سے ارسال کردہ ہیبت ناک سچی کہانی

کالا جادو

’ہوشیار باش!

کالے جادو اور سفلی عملیات نے ہمارے معاشرے کو بری طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے‘ غیر تو غیر اپنے بھی ذاتی مقاصد کے لیے گندا کھیل کھیل جاتے ہیں......

ارم ناز

’’ رافعہ بیٹا اسکول سے آ کے سب چیزیں اِدھر اُدھر نہ پھینک دیا کرو۔ لڑکیوں کے یہ طور طریقے نہیں ہونے چاہئیں۔ اپنے کپڑے ہینگر میں ٹھیک طرح سے لٹکاؤ موزے جوتوں کے اندر رکھو اور جوتے اسٹینڈ پر رکھو۔ بیڈ سے اپنا بیگ اٹھاؤ اور اسے اپنی جگہ پر رکھو۔ کب تک یہ چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھاتی رہوں گی۔ اگلے گھر جاؤ گی تو مجھے بہت کچھ سننے کو ملے گا کہ ماں نے تمیز نہیں سکھائی۔ ابھی سمیع کالج سے آتا ہو گا وہ بھی اسی طرح اپنا سامان اِدھر اُدھر پھینکے گا سارا دن گھر سمیٹتے گزر جاتا ہے۔‘‘

’’ میں مسز نزہت امین ہوں رافعہ اور سمیع میرے دو بچے ہیں رافعہ میٹرک کی طالبہ ہے جبکہ سمیع سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہا ہے۔ میرے شوہر امین خان ایک ہینڈسم اور خوبصورت مرد ہیں وہ ایک کامیاب بزنس مین ہیں۔ وہ ایک اچھے شوہر اور بہترین باپ ہیں۔ مجھے اپنے شوہر سے بے انتہا محبت ہے اور وہ بھی مجھے پوجنے کی حد تک چاہتے ہیں۔ امین کہتے ہیں کہ تم ایک سلیقہ شعار‘ سگھڑ اور گھر گرہستی والی عورت ہو نزہت تم نے گھر کو جنت بنایا ہوا ہے۔ تین تین ملازم ہونے کے باوجود میں کھانا اپنے ہاتھ سے پکاتی ہوں۔ امین کو میرے ہاتھ کا بنا کھانا بہت پسند ہے۔ خاندان والے میری اور امین کی محبت کی مثالیں دیتے ہیں۔ میری ارینج میرج ہے مگر محبت لیلیٰ مجنوں جیسی ہے۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں مگر امین کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا وہ میری چھوٹی سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ میں امین کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں ان کا کوئی بھی کام ملازموں سے نہیں کرواتی یہاں تک کہ اُن کے جوتے بھی خود ہی پالش کرتی ہوں۔ مجھے امین کے کام کر کے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں ہر وقت اپنے رب کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اُس پاک ذات نے بہت نوازا ہے ہمیں‘ کسی چیز کی کمی نہیں تھی بنگلہ‘ گاڑی‘ ڈرائیور نوکر چاکر ہر چیز موجود تھی مگر اس کے باوجود مجھے ذرا بھی غرور نہ تھا۔ میں خدا کی راہ

میں خرچ کرنے سے کبھی پیچھے نہ رہتی ہر ضرورت مند کی کسی نہ کسی طرح مدد کرتی رہتی تھی اور مجھے بے حد خوشی اور دلی سکون ملتا۔

امین صاحب آج آفس بڑی تیاری سے جا رہے تھے۔ چم چم کرتے جوتے، بلیک کلر کا سوٹ جس پر انتہائی قیمتی پرفیوم کا اسپرے کیا گیا تھا سلیقے سے جمائے ہوئے بال اور سنہرے فریم کی نازک عینک لگائے میں ان کو دیکھ کر مسکرانے لگی اور ساتھ ہی ساتھ پوچھ بیٹھی۔

''امین صاحب آج خیریت تو ہے نا؟ بڑی خاص تیاری سے جا رہے ہیں کس سے ملنا ہے؟''

امین نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''جانو آفس جا رہا ہوں آج کچھ اسٹوڈنٹس نے آفس کا وزٹ کرنا ہے۔ اسٹوڈنٹس بزنس سے متعلق معلومات حاصل کرنے آئیں گے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا جی میں تو آپ کی تیاری دیکھ کر سمجھی کہ ڈیٹ پر جا رہے ہیں۔'' امین میری بات سن کر ہنسنے لگے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ دن اور رات پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ ایک صبح میں سو کر اٹھی تو میرے بائیں بازو میں درد تھا میں سمجھی کہ ایک کروٹ سونے سے درد ہوگیا ہے۔ میں نے پین کلر کھالی اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ شام ہوتے ہی بازو کا درد شدید بڑھ گیا میں سمیع کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کیا اور دوائیں لکھ دیں میں گھر آگئی۔ مگر درد کے بارے میں امین کو کچھ نہ بتایا کہ بے چارے خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔ صبح سے شام



تک آفس میں سر کھپاتے ہیں اب رات میں بیوی کی تیمارداری کریں گے۔ میں نے دوائیں لیں اور ساتھ میں ایک گلاس نیم گرم دودھ بھی پی لیا کیونکہ کھانا کھانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ دوائیں کھا کے مجھے نیند آنے لگی میں نے رافعہ سے کہا۔

"میں سونے جا رہی ہوں آپ سونے لگو تو لائٹس آف کر دینا۔" رافعہ نے کہا۔

"مما آپ بے فکر ہو کر سو جائیں۔" میں اپنے بیڈ پر لیٹی تو نیند نے آلیا۔ دواؤں کی غنودگی میں تھی عجیب عجیب خواب نظر آ رہے تھے میں خواب میں اپنے آپ کو بیمار اور بہت لاغر کمزور دیکھ رہی تھی۔ دو سرخ سرخ انگارے جیسی دہکتی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں ان سے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر چھپ نہیں پا رہی تھی اچانک میری آنکھ کھل گئی میرا پورا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھ کر اندازہ لگایا تو صبح صادق کا وقت تھا۔ کچھ دیر میں لیٹی رہی میرے کانوں میں فجر کی اذان کی آواز آئی اور میں اذان سننے لگی۔ جب اذان ختم ہوئی تو میں نے سوچا۔

اٹھ کر نماز پڑھتی ہوں رات کا کھانا نہیں کھایا تھا تو شدید بھوک لگی تھی۔ بازو کا درد ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھ سے اٹھا نہیں گیا۔ ایک' دو' تین' چار ہر دفعہ میں اٹھنے میں ناکام رہی یوں لگ رہا تھا کہ میرا پورا جسم بے جان ہو گیا ہے۔ بس میری آنکھیں اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہیں اور دماغ سوچ رہا ہے' میں نے سر کو جنبش دی تو میرا سر ہلا میں نے اپنا ہی نام پکارا 'نزہت' تو میری نحیف سی آواز میرے کانوں میں آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں بول اور سن سکتی ہوں مگر میرا پورا جسم ناکارہ ہو چکا تھا۔

میرے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا کہ مجھ پر فالج کا اٹیک ہو گیا ہے میں نے اپنی پوری طاقت جمع کر کے سمیع کو آواز دی مگر میری آواز کمرے سے باہر نہیں جا سکی۔ میں الگ کمرے میں سوتی تھی کیونکہ امین رات تک لائٹ آن کر کے اپنے بزنس کی فائلیں دیکھتے اور حساب کتاب کرتے تھے۔ اب مجھ میں آواز دینے کی بھی ہمت نہیں تھی مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ میری ٹانگیں میرے وجود سے کاٹ کے الگ کر دی گئی ہیں۔ البتہ میرے ہاتھ حرکت کر رہے تھے۔ میں اسی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی۔

رافعہ اسکول جانے کے لیے اٹھی تو اُس نے دیکھا کہ مما ابھی تک سو رہی ہیں کیونکہ میں اُس کے اسکول جانے سے پہلے ناشتہ ریڈی کر لیتی تھی۔ رافعہ کو تشویش ہوئی تو وہ آوازیں دیتی میرے کمرے تک آ گئی وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور پوچھنے لگی۔

"مما آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے آپ اب تک اٹھی نہیں ہیں؟" میں نے اشارے سے رافعہ کو بلایا تو وہ میرے قریب آ گئی میں نے آہستگی سے کہا کہ میں معذور ہو گئی ہوں میری ٹانگیں کام نہیں کر رہی ہیں اور یہ کہتے ہوئے میں رونے لگی۔ مجھے دیکھ کر رافعہ بھی رونے لگی۔ اُس نے فوراً امین اور سمیع کو جگایا تو وہ دونوں فوراً میرے کمرے میں آ گئے۔ جیسے تیسے انہوں نے مجھے گاڑی تک پہنچایا اور مجھے شہر کے سب سے بہترین اور مہنگے پرائیویٹ اسپتال لے گئے۔ میرا مکمل چیک اپ ہوا۔ ایکسرے ہوا اور الٹراساؤنڈ کے علاوہ خون اور پیشاب کے ٹیسٹ ہوئے۔ ڈرپ میں انجکشن ڈال کر لگائی گئی۔ دو گھنٹے کے بعد میرے سارے ٹیسٹوں کی رپورٹ آ گئی اور رپورٹ بالکل کلیئر تھی سب کچھ نارمل تھا۔

میرا بلڈ پریشر' شوگر' اور کولیسٹرول وغیرہ سب نارمل اور ٹھیک تھا۔ ڈاکٹر کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے رافعہ میرے پاس تھی۔ امین اور سمیع چھٹیوں پر تھے۔

ڈاکٹرز کی مہنگی مہنگی دواؤں اور انجکشنز سے صرف اتنا فرق پڑا کہ میں اٹھ کر بیٹھنے لگی۔ مگر میری ٹانگیں بے کار ہو چکی تھیں۔ جب ڈاکٹرز ناکام ہو گئے تو مجھے اسپتال سے چھٹی دے دی گئی اور میں گھر آ گئی۔ امین نے میرے لیے ایک کل وقتی نرس کا انتظام کر دیا جو چوبیس گھنٹے میرے ساتھ تھی۔ میں بالکل بستر سے لگ کر رہ گئی تھی۔ دونوں بچے پریشان تھے۔ امین آفس کے ساتھ ساتھ میرا خیال بھی رکھ رہے تھے۔

گھر میں کام والی جو عورت شہناز آتی تھی وہ میری کافی پرانی ملازمہ تھی اس بے چاری نے گھر پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح معذور ہو جاؤں گی۔ ہفتے میں ایک بار چیک اپ کے لیے اسپتال جاتی تھی۔ مجھے وہیل چیئر پر بٹھا کر گاڑی تک لے جایا جاتا' میں اللہ سے اپنی صحت کے لیے رو رو کر دعا کرتی ابھی میرے بچوں کو میری ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ بس اتنی زندگی دے کہ میں اپنی بیٹی کو عزت سے رخصت کر دوں مگر میری حالت کیا سنبھلتی دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ میں سخت چیزیں چبا کر نہیں کھا سکتی تھی۔

دانتوں میں طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ کوئی چیز چباتے جبڑا دکھنے لگ جاتا۔ شہناز مجھے سوپ بنا کر دیتی یا ابلی ہوئی سبزی چمچ سے کھلاتی حیرت کی بات یہ تھی کہ میں پانی نہیں پی سکتی تھی۔ جب بھی میرے سامنے پانی آتا مجھے فوراً ابکائی آ جاتی ایسا لگتا تھا جیسے پانی سے شدید تعفن اٹھ رہا ہے۔ بہت شدید پیاس کی صورت میں جوس یا سوپ پیتی تھی پانی تو جیسے مجھ پر حرام ہو گیا تھا۔ سارا دن عجیب بے چینی رہتی مجھے کسی پل چین اور سکون نہ تھا۔ میں جو تہجد گزار تھی اب ایک وقت کی نماز بھی نہیں پڑھ سکتی تھی۔ میری حالت ایسی تھی جیسے سو سالہ لاغر اور کمزور بوڑھی عورت ہوں۔ میری یہ حالت دو یا تین مہینوں میں ہوئی تھی۔

اس بیماری میں پورے چھ ماہ گزر گئے بہترین علاج جاری تھا مگر میری حالت میں کوئی بہتری نہ آئی بچے اپنی پڑھائی میں مصروف تھے اور امین صاحب اپنے کاروبار میں' میری دوائیں چل رہی تھیں جو کہ میں باقاعدگی سے کھا رہی تھی مگر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ میں تڑپ تڑپ کر روتی اور اللہ سے اپنی صحت یابی کی دعا کرتی مجھے دیکھ کر شہناز بھی روتی' جب درود پاک کا ورد کرتی تو سامنے دیوار پر عجیب سے سائے بے چین ہو جاتے اور درود پاک کا ورد کرتے ہوئے اچانک میری زبان رک جاتی اس بات کا ذکر میں نے شہناز سے کہا تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی اور کہنے لگی۔

''باجی مجھے لگتا ہے کہ کسی نے آپ پر کچھ کر دیا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شہناز میرا اور تمہارا ساتھ جب کا ہے جب میری شادی ہوئی اور میں بیاہ کر اس گھر میں آئی۔ تم میری عادت کو جانتی ہو کہ میں کتنی خدا ترس اور ہمدرد ہوں ہر کسی کے ساتھ بھلائی اور اچھائی کرتی ہوں تو میری کسی سے کیا دشمنی ہے۔ میرا کوئی دشمن نہیں ہے تو کون مجھ پر کچھ کروائے گا؟'' شہناز کہنے لگی۔

''باجی آپ کی ہمدردی' محبت' اچھائی اور خدا ترسی کسی نہ کسی کو ضرور کھٹکتی ہو گی آپ میری مانو یا نہ مانو مگر ہے یہ جادو......'' میں نے شہناز کی بات ہنس کر ٹال دی۔

''نہیں نہیں مجھ پر کسی نے کیا جادو کروانا ہے؟''

اب ہر دوسرے یا تیسرے دن شہناز مجھ سے کہتی۔

''باجی آپ میری بات کا یقین کریں آپ پر کسی نے کچھ کیا ہے۔'' مگر میں اس کی بات کا یقین نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔

ایک دن شہناز کہنے لگی۔

''باجی پورا سال ہوگیا ہے آپ کی حالت ویسی کی ویسی ہے اتنا مہنگا علاج ہو رہا ہے مگر آپ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو آپ میری بات پر غور کریں اور میں ایک عامل کو جانتی ہوں وہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں آپ کسی طرح ایک بار میرے ساتھ تو چلیں۔''

شہناز کی بات سن کر میں خاموش ہوگئی اور اس کی بات میرے ذہن میں اٹک گئی۔

بات تو شہناز کی ٹھیک تھی پورا سال ہوگیا تھا مہنگا علاج ہو رہا تھا مگر کسی بھی دوا سے ذرا بھر افاقہ نہیں تھا۔ دیواروں پر سائے اور خواب میں بھی لمبے لمبے سائے اِدھر سے اُدھر جاتے دیکھنا اور درود پاک کا ورد کرتے اچانک میری زبان کا رک جانا اس بات کی علامت تھا کہ شہناز کی بات میں سچائی ہے۔ میں نے شہناز کی کہی بات کا ذکر امین سے کیا۔ تو وہ ہنسنے لگے اور کہا۔

''نزہت تم عجیب بات کرتی ہو پڑھی لکھی عورت ہو کر شہناز جیسی اَن پڑھ اور جاہل عورت کی باتوں میں آ گئی ہو۔ تم بیمار ہو اور میں بہت بڑے اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے بہت مہنگا علاج کروا رہا ہوں تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی اور شفا ملے گی۔ بس تم باقاعدگی سے دوائی کھاتی رہو اور فکر نہ کرو۔'' امین کی یہ بات سن کر میں خاموش ہوگئی۔

دوا تو میں پورا ایک سال ہوگیا باقاعدگی سے کھا رہی تھی مگر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ میرے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی کہ کیا یہ بہتر ہوتا امین میرا روحانی علاج بھی کرواتے۔ مجھے معذور ہوئے سال سے اوپر ہوگیا تھا امین اپنے بزنس کے سلسلے میں پندرہ بیس دن کے لیے اسلام آباد گئے ہوئے تھے اُس روز مجھے بہت بے چینی اور گھبراہٹ تھی نیند بھی نہیں آ رہی تھی ایک پل سکون اور قرار نہ مل رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے میرا زور زور سے دھڑکتا ہوا دل میرے سینے کی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا اور میرا سر درد سے پھٹ جائے گا۔ تو میں نے شہناز سے کہا۔

''تم نے جس عامل بزرگ کا ذکر کیا تھا مجھے کسی طرح اُن کے پاس لے چلو۔'' شہناز نے فوراً سمیع کی مدد سے مجھے وہیل چیئر پر بٹھا کر گاڑی میں شفٹ کیا اور وہیل چیئر بند کر کے گاڑی کی ڈگی میں رکھ دی۔ میں ہاسپٹل بھی اسی طرح جاتی تھی۔ گاڑی کچے پکے راستوں سے ہوتی ہوئی ایک سبز رنگ کے گھر کے آگے جا کر رُکی جس پر سبز رنگ کے جھنڈے لگے تھے وہاں کافی چہل پہل تھی بہت سارے مرد، عورتیں اور بچے موجود تھے۔ سمیع اور شہناز نے مجھے وہیل چیئر پر بٹھایا اور سمیع وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اندر لے گیا۔ اندر تو ایک لائن لگی تھی اتنا رش تو میں نے ہاسپٹل میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ خواتین اضطرابی کیفیت میں اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھیں۔

سہ پہر کا وقت تھا بہت سے لوگ مجھے ہمدردی کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد مجھے اندر جانے کا اشارہ ملا۔ شہناز وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی اندر لے گئی کیونکہ اندر کچھ خواتین بھی موجود تھیں اس لیے سمیع باہر کھڑا رہ گیا۔ تخت پر بیٹھے بزرگ جن کا نورانی چہرہ سفید داڑھی، کاٹن کا سفید بے داغ سوٹ پہنے انگلیوں میں یاقوت اور مرجان کی انگوٹھیاں سر پر کروشیہ سے بنی سفید ٹوپی پہنے خاصے رعب اور دبدبے والے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے ان کو اشارے سے سلام کیا اور اپنی بیماری سے متعلق تمام معلومات بتا دیں جسے سن کر وہ حضرت کچھ دیر مراقبے کی حالت میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ انہوں نے فوراً کچھ پڑھ کر مجھ

پردم کیا۔ ان کے دم کرنے کی دیر تھی کہ یکدم مجھے سکون مل گیا۔ میری بے چینی اور گھبراہٹ ختم ہوگئی میرے سر کا درد بھی ٹھیک ہوگیا اور دل کی دھڑکن بھی نارمل ہوگئی۔ انہوں نے بتایا۔

''بی بی آپ کالے جادو کے زیر اثر ہیں اور بہت سخت عمل کیا گیا ہے۔'' شہناز کی بات پر حضرت نے تصدیق کی مہر لگادی۔ میں نے کہا۔

''حضرت میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں پھر کون اس طرح کرسکتا ہے؟'' حضرت نے کہا۔

''ہم اپنے منہ سے کسی کا نام نہیں لیتے مگر بہت جلد کسی بچے کے منہ سے دشمن کا نام سن لوگی۔'' حضرت نے مجھے پھر دم کیا دو تعویذ دیے ایک کو چمڑے میں سلوا کر گلے میں ڈالنا تھا اور دوسرا پانی میں بھگو دینا تھا اور وہ پانی پینا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے کہا۔

''صدقہ خیرات کرو اور ایک ہفتے بعد دوبارہ آنے کا کہا۔'' میں گھر آگئی شہناز تعویذ چمڑے میں سلوا لائی جسے میں نے فوراً گلے میں پہن لیا اور تعویذ والا پانی پیا۔ آج مجھے اس پانی سے نہ ہی تعفن کی بدبو آئی اور نہ ہی ابکائی آئی۔ پانی پی کر مجھے بہت سکون ملا اب میں پیٹ بھر کے کھانا کھانے لگی اور پانی بھی پینے لگی۔ میری طبیعت سنبھلتی جا رہی تھی اب میری ٹانگیں بھی حرکت کرنے لگی تھیں اور میں تھوڑا بہت چلنے پھرنے لگی تھی۔ ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔

شہناز اپنے ساتھ اپنی چار سالہ نواسی کو لائی اس نے بتایا کہ میری بیٹی گاؤں سے آئی ہوئی ہے تو بچی میرے پیچھے لگ گئی کہ نانی آپ کے ساتھ جاؤں گی تو میں اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ میں نے شہناز سے کہا۔

''اچھا کیا بچی کو ساتھ لے آئی ہو۔'' میں نے بچی کو اپنے پاس بلا کر پیار کیا اور بچی کے ہاتھ میں پیسے رکھ کر کہا۔

''آئس کریم وغیرہ کھالینا۔'' بچی میری طرف غور سے دیکھنے لگی اور دیکھتے دیکھتے تتلا کر بولی۔

''انکل امین اور باجی رافعہ نے آپ کو بیمار کردیا ہے۔'' پہلی دفعہ تو میں نے بچی کی بات سنی ان سنی کردی مگر جب اس نے تین چار دفعہ یہی الفاظ دہرائے تو میں نے اُسے اپنے پاس بٹھالیا اور پوچھا۔

''بیٹا کیا کہہ رہی ہو؟'' تو بچی بولی۔

''انکل امین اور باجی رافعہ نے آپ کو بیمار کردیا ہے۔'' تو مجھے حضرت کی بات یاد آگئی کہ جس نے آپ پر کالا جادو کیا ہے اُس کا نام کوئی بچہ بہت جلد بتائے گا۔ میں بے یقینی کی کیفیت میں تھی اور حیران و پریشان تھی کہ امین میرا محبوب شوہر جسے میں نے پوجنے کی حد تک چاہا اور رافعہ میری اپنی پیدا کی ہوئی اولاد مجھ پر جادو کروائیں گے۔ میں تو سکتے میں آگئی میں نے شہناز کو کہا۔

''مجھے ابھی حضرت کے پاس جانا ہے۔'' تو شہناز نے کہا۔

''باجی کل چلیں گے۔'' حضرت سے ملنے والے معاملات میں نے امین اور رافعہ سے پوشیدہ رکھے۔ میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ شہناز کی نواسی سچ بات کہہ گئی ہے۔ میں اگلے دن شہناز کو لے کر حضرت کے پاس گئی۔ اپنی باری آنے پر میں نے حضرت کو بتایا۔

''ایک چھوٹی بچی نے میرے شوہر اور میری بیٹی کا نام لیا ہے کہ ان دونوں نے مجھے بیمار کیا ہے۔ آپ کے تعویذ' دم اور پانی پینے سے میں بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں۔'' حضرت نے مجھے پھر دم کیا اور

پانی کی ایک بوتل دم کر کے دی اور ساتھ تاکید کی کہ یہاں آنے کے متعلق گھر میں کسی کو نہ بتانا اور معاملے کی تحقیق کرو۔ شوہر اور بیٹی کے کیا مشاغل ہیں ان پر نظر رکھو۔ چنانچہ میں گھر آ گئی اور حضرت کو نذرانے کے طور پر پانچ ہزار روپے دیے۔

حضرت کے علاج سے میں دن بدن بہت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ مگر میں نے یہ سب امین اور رافعہ سے پوشیدہ رکھا۔ میری ایک دوست کی بیٹی رافعہ کے ساتھ پڑھتی تھی میں نے اُسے موبائل پر کال کر کے رافعہ کی مصروفیت پوچھی اور اسے بہت بڑی قسم دے کر رافعہ کے حالات پوچھے تو اُس نے بتایا کہ رافعہ ایک لڑکے کو پسند کرتی ہے 'یہ وہی لڑکا ہے جس کو آپ نے ڈانٹ کر گھر سے نکالا تھا۔ وہ لفنگا اور آوارہ لڑکا رافعہ کو قابو کر چکا ہے اور انکل امین یہ بات جانتے ہیں وہ رافعہ کو یہ بات کہہ چکے ہیں کہ تعلیم مکمل کر لو اور جیسے ہی تمہاری تعلیم مکمل ہوئی تمہاری شادی تمہاری پسند کے لڑکے سے کر دوں گا۔ رافعہ اُس لڑکے سے روزانہ ملتی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میرے فون کے متعلق رافعہ کو نہ بتانا تو اُس نے وعدہ کیا کہ رافعہ کو کچھ نہ بتائے گی۔ امین کی معلومات میں نے امین کے آفس کے ایک لڑکے سے لیں۔ اُس لڑکے نے حیرت انگیز انکشاف کیا کہ امین صاحب ایک نوعمر لڑکی سے شادی رچا چکے ہیں یہ لڑکی تقریباً ایک سال پہلے کسی کالج کے اسٹوڈنٹس کے ساتھ آفس کا وزٹ کرنے آئی تھی۔ غریب گھر کی لڑکی تھی دولت کی چمک دیکھ کر اُس نے امین صاحب کو اپنے جال میں پھنسایا۔

امین صاحب نے اپنے جوان بچوں کی پرواہ کیے بغیر اُس نوعمر لڑکی سے شادی کر لی اور اُسے ایک فلیٹ خرید کر دیا ہے۔ اُس لڑکے کا انکشاف سن کر میں سناٹے میں آ گئی اور حیران پریشان بیڈ پر ڈھے گئی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی اُس روز میں بہت روئی اپنے شوہر کی بے وفائی پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ لڑکی کا چچا کالے علم کا ماہر تھا وہ کالا علم کر کے پیسے کماتا تھا۔ لڑکی اپنے چچا سے مجھ پر کالا جادو کروا رہی تھی اور وہ لڑکی جو کچھ دیتی وہ امین رافعہ کو دیتے اور رافعہ مجھے سوپ میں ملا کر پلا دیتی امین کی شادی سے سمیع لاعلم تھا۔ سمیع ویسے بھی خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا لڑکا تھا۔ میں نے شہناز کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے پکا ہوا کھانا کھلائے۔

میں حضرت کے آستانے کے چکر لگاتی رہی۔ ان سے دم کرواتی اور ان کا دم کیا ہوا پانی پیتی ان کا دیا ہوا تعویذ چوبیس گھنٹے میرے گلے میں رہتا۔ اب میں بالکل ٹھیک تھی چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ مجھے اب کوئی تکلیف نہیں تھی میں پہلے کی طرح نارمل زندگی گزار رہی تھی۔

مگر مجھے اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ امین نے مجھے دھوکہ دیا ہے میں نے خود کو امین اور رافعہ سے بالکل الگ کر لیا تھا پانچ وقت کی نماز ادا کرتی اور قرآن پاک کی تلاوت کرتی جس سے مجھے بہت سکون ملتا۔ بے پناہ محبت کرنے والے شوہر اور میری کوکھ سے جنم لینے والی میری سگی اولاد نے مجھ سے خوب دشمنی نبھائی تھی مگر میں نے سب معاملات اپنے اللہ پر چھوڑ دیے تھے۔ وہی پاک ذات نیتوں کے حال جانتا ہے میں نے اللہ سے لو لگا لی تھی جب دشمنی پر اتر آئے تو کیا اپنا اور کیا پرایا۔

☆☆......☆☆

ننکانہ صاحب سے ارسال کردہ سچا پُراسرار واقعہ

چڑیلوں کا مسکن

وہ چار شیطان چڑیلیں تھیں سارا لاہور اُن سے تنگ تھا......

لاہور شہر کے پرانے باسی اس قصے کو آج بھی یاد کرتے ہیں......

محمد حنیف شاکر

اچانک کمرے میں کئی آسیبی وجود نمودار ہوئے ان کی صورت مسکین جیسی تھی۔ آنکھوں میں التجا اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔ یہ سب کی سب اپنی آزادی کے خواہاں تھے۔ اور پھر......

لوگ سچ کہتے ہیں کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جمیا ہی نہیں (پیدا ہی نہیں ہوا) لاہور جو آج کل بہت بڑا شہر ہے ایک کروڑ سے زیادہ کی آبادی کراچی کے بعد پاکستان کا دوسرا بڑا شہر جس کا شمار دنیا کے بڑے بڑے خوبصورت شہروں میں ہوتا ہے۔

جہاں اب تجارت، صنعت وحرفت، تہذیب و تمدن اور علمی ترقیوں کے لحاظ سے اس وقت یہ پاکستان کا دل کہلاتا ہے۔ شہر کی رونق اور خوبصورتی کا اندازہ تو اس سے ہوسکتا ہے کہ اس شہر میں سینکڑوں خوبصورت عالی شان محل نما کوٹھیاں، بیسیوں کالج، ہزاروں اسکول، درجنوں یونیورسٹیاں سینکڑوں مدرسے، بے شمار اسپتال، بڑے بڑے دفاتر، ہائیکورٹ اور کچہریاں، گورنر ہاؤس، اسمبلی ہال، ایئرپورٹ اور لاکھوں مسجدیں، بے شمار مارکیٹیں، کشادہ و وسیع سڑکیں جن پر فراٹے بھرتی چمچاتی گاڑیاں، تاریخی عمارتیں، بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، شالا مار باغ، مقبرہ نور جہاں، دریا راوی کے بیچ بارہ دری، چار برج (چوبرجی) شہر خموشاں (میانی صاحب) میٹرو اور اورنج ٹرین اور پھر بزرگانِ دین کے مزار مبارک حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش، حضرت عزیز الدین پیر مکی شاہ، حضرت موسیٰ آہن گر، حضرت میراں حسین زنجانی، حضرت حیدر شاہ، حضرت مادھولال حسین شاہ، بی بیاں پاکدامن، حضرت شال جمال اور بہت سے بے شمار بزرگان دین کے مزار مبارک کے علاوہ تجارت کے لحاظ سے ایک بہت بڑی منڈی ہے۔

شہر کے شاندار اور پُررونق بازار بڑی کثرت سے سرسبز پارک و باغات، کھیلوں کے میدان منٹو پارک یعنی مینار پاکستان، انار کلی بازار اور خوبصورتی اور شادابی کے لحاظ سے پاکستان کی

جنت کہلاتا ہے۔
سچ کہتے ہیں جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جمیا ہی نہیں شہر لاہور میں میوزیم اور بہت بڑا چڑیا گھر بھی موجود ہے یہ کیا میں لاہور کا نقشہ کھینچنے بیٹھ گیا ہوں۔
جی ہاں میں اس وقت کی بات کر رہا ہوں جب ابھی پاکستان معرض وجود میں نہیں آیا تھا یعنی پاکستان کی سرزمین بھی ہندوستان کا ہی حصہ تھی اس وقت کے لاہور اور آج کے لاہور میں بھی بہت فرق تھا لاہور اس وقت چھوٹا سا شہر تھا جو صرف بارہ دروازوں، روشنائی گیٹ، کشمیری گیٹ، مستی گیٹ، خضری/ شیرانوالہ گیٹ، ذکی / یکی گیٹ، بھاٹی گیٹ، ٹکسالی گیٹ، موچی گیٹ، شاہ عالمی گیٹ، لوہاری گیٹ، دہلی گیٹ، اکبری گیٹ ان بارہ دروازوں کے علاوہ ایک بہت چھوٹا دروازہ موری گیٹ بھی ہے اُس وقت کا لاہور ان دروازوں کے اندر ہی اندر سمٹا ہوا تھا صرف چند ایک ہی ارد گرد چھوٹی چھوٹی بستیاں موجود تھیں لوہاری منڈی کا چوک جو آج کل جھنڈا چوک کہلاتا ہے اس میں کوچہ پیر بھولا موجود ہے پیر بھولا کے مزار مبارک کے سامنے گلی میں مشرق کی جانب سکھوں کی ملکیت ایک بڑی چار منزلہ کوٹھی نما عمارت جس میں کافی سارے کمرے بنے ہوئے تھے جو آج بھی اپنی جگہ پر قائم ودائم ہے۔
اس عمارت میں سکھ فیملی کی رہائش کے ساتھ ساتھ مافوق الفطرت مخلوق بھی رہائش پذیر تھیں جو





صرف اس گھر کے مکینوں کو تنگ کرتی تھیں بلکہ لاہور شہر میں کئی دکانوں اور گھروں کو بھی نقصان پہنچاتی تھیں۔ ان سے نہ صرف اس گھر کے مکین تنگ تھے بلکہ پورا شہر لاہور بھی اذیت میں مبتلا تھا۔

کیونکہ یہ مافوق الفطرت نہ صرف مالی نقصان پہنچاتی تھیں بلکہ آئے روز جانی نقصان بھی کرتی تھیں۔

ان کی روک تھام کے لیے گھر کے مکینوں نے اپنی ہمت وطاقت سے بڑھ کرزور لگایا۔

لیکن جوں جوں دوا کی مرض اور بھی بڑھتا ہی گیا والا مصداق ہوا سکھ فیملی نے بڑے بڑے گروؤں، پنڈتوں، پادریوں، بھگت بھکشوؤں، پیروں، فقیروں اور عاملوں سے رابطے کیے، جیسے ہی وہ کسی عامل یا پیر فقیر کو عمارت میں ان کو نکالنے کے لیے لاتے تو آنے والے عامل حضرات ان ہوائی چیزوں کو مکان سے نکالنے کے بجائے ان سے مقابلہ کرنے کی بجائے مافوق الفطرت کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈر کرخود تتر بتر ہو جاتے ان کے تتر بتر ہونے پر نہ صرف سکھ فیملی پر تکلیفوں کا دائرہ وسیع ہوتا بلکہ پورے شہر بھر میں یہ مافوق الفطرت بہت ہی تباہی پھیلانے کا سبب بنتیں۔

شہر کے دوسرے لوگ اور سکھ فیملی کافی بلکہ بہت ہی کافی عرصہ تک اس ناگہانی مصیبت میں مبتلا رہے لاہور نگری کے لوگ ان سے بہت دکھ اٹھا رہے تھے دکھی کیوں نہ ہوتے کیونکہ اس نظر نہ آنے والی مخلوق نے ان کے سکھ اور خوشیاں جو چھین لی تھیں۔

شاید میں ان بارہ تیرہ دروازوں کے اندر رہنے والے باسیوں پر آئی آفت کے سبب اُن کے دکھوں غموں مصیبتوں اور تکلیفوں کا مکمل طور پر احاطہ نہیں کر پا رہا ہوں یہ تو وہی سمجھ سکتے ہیں جن پر کبھی کوئی ایسا برا وقت آیا ہو جو کسی انجانے دکھ یا مصیبت میں گرفتار ہوئے ہوں لاہور یئے بھی ان پرانے گزرے ہوئے وقت میں ایسے ہی انجانے دکھوں میں مبتلا تھے ان کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے کسی قسم کے بھی حفاظتی انتظامات نہ تھے اس وقت کی موجودہ حکومت بھی بے بس تھی وہ بھی ان کے لیے کچھ نہیں کرسکتی تھی دن تو ایسے تیسے کر کے گزر ہی جاتا۔

لیکن جیسے ہی مغرب کی جانب دور افق میں سورج ڈوبتا ہوا دکھائی دیتا اور تاریکی چھپا کر رات کی آمد کا اعلان کرتی تو لوگوں کے دلوں پر بھی غم و پریشانی کی تاریکی چھا جاتی۔ ہر ایک کے دل میں یہی وسوسہ ہوتا کہ نہ جانے رات کو کس گھر پر مافوق الفطرت کا حملہ ہو کون ان کے ظلم کا نشانہ بنے گا۔

کس کے گھر میں صبح ماتم کا راج ہوگا یہ منظر ہر رات کو پیش آتا۔

مگر جب سورج طلوع ہوتا تو کسی کے لیے مسرت و شادمانی کا پیامبر ہوتا۔ کسی کے لیے مصیبتوں اور تکلیفوں کا پہاڑ ہوتا، کسی پر خوشیوں کی بوچھاڑ ہوتی تو کوئی غموں کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا کوئی اپنوں سے ملے گا تو کوئی اپنوں سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائے گا۔

کسی کی تمنا پوری ہوگی تو کوئی آرزوؤں کا دھواں دل میں لیے ہوئے ہوگا کسی کو وصالِ یار ہوگا اور کوئی فراقِ یار میں تڑپ رہا ہوگا کہیں کسی کی شادی ہو رہی ہوگی اور کہیں کسی کا جنازہ نکل رہا ہوگا۔ کوئی ہنس رہا ہوگا تو کوئی زار و قطار رو رہا ہوگا۔

مگر وہاں پر موجود لوگوں کے لیے تو ہر دن

اور ہر رات دکھ ہی دکھ اور غم ہی غم تھے اس مصیبت سے نکالنے کے لیے ان کے پاس کوئی حل نہ تھا اُف اللہ اتنی کربناک تکلیف' خوفناک تنہائی' کتنی دہشت ناک ویرانی وسنسانی' لاہوریوں کو مندرجہ بالا اندوہنا کیوں کا سامنا کرنا پڑتا کہ کتنا گہرا سکوت' خاموش سرسراہٹ اور دردانگیز سائیں سائیں اُف...... کیا کریں...... کدھر جائیں...... لوگ سوچتے یا اللہ کیا تمام زیست ایسے ہی تکلیفوں اور پریشانیوں میں گزر جائے گی۔

ساری زندگی ویران صحراؤں میں بسر ہوگی اور یہ پوری عمر تاریکی کے گھپ اندھیروں میں بسے گی اِدھر جس گھر میں ان ہوائی چیزوں کا مسکن تھا ان کو تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ریگستان کے دشوار گزار صحرا میں بھٹک رہے ہیں یہ لوگ سوچتے تھے کہ یہ ہمیں کس جرم کی سزا مل رہی ہے ہم سے کیا قصور ہوگیا ہے۔

ہمیں کیوں انجانی موت کی طرف بے گناہ دھکیلا جارہا ہے۔

خداوند قدوس کا کرنا ایسا ہوا کہ حالات نے کروٹ بدلی جو اچانک خوشیوں کی نوید لے کر آئی لوگوں کے لیے تنہائیاں' نغموں میں بدل گئیں اندھیرے اجالوں میں' تاریکی روشنی میں اور سیاسی سفیدی میں ڈھل گئی۔ سکوت قہقہوں میں بدل گیا ویرانی کے بادل چھٹ گئے۔ جہاں پہلے تنہائیاں تھیں وہاں اب محفلیں آباد ہوگئیں۔ سائیں سائیں کی خوفناک سرسراہٹ' شیریں آوازوں میں تبدیل ہوگئیں۔ افسردہ اساس اور بے چین دل خوشی و مسرت اور چاہت سے مسحور ہوگئے۔

کہاں لاہور جیسے پورے علاقے میں خوف و ہراس' غم اور دکھ' مصیبت اور پریشانیاں سب دیکھتے ہی دیکھتے آن کی آن میں یکدم دور ہوگئیں اس دنیا میں اگر کوئی سیر ہے تو اللہ رب العزت وحدہ لاشریک نے اس پر سوا سیر بھی پیدا کر رکھا ہے۔

ہر بھجن سنگھ سکھ فیملی کے سربراہ کو کسی نے بتایا کہ سردار جی آپ کو ایک ایسی ہستی کا بتاتا ہوں جو بہت ہی پہنچی ہوئی سرکار ہیں وقت کے غوث و قطب ہیں جو آپ کی اس مصیبت کو ایک پل میں دور کرسکتے ہیں وہ تو ایسے ہیں کہ جب سال میں ایک دفعہ گھر سے باہر اپنے مریدوں کے لیے دورے پر نکلتے ہیں تو گھر سے قدم نکالتے وقت اور گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے خواتین کی طرح پردے میں ہوتے ہیں یعنی برقعہ پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔

ہر بھجن سنگھ نے پوچھا۔

''وہ کیوں جی؟'' بتانے والے نے کہا۔

''سردار جی وہ اس لیے کہ کوئی غیر عورت ان کا چہرہ مبارک نہ دیکھے لیکن جب وہ دورے سے واپس گھر تشریف لاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو گھر سے یہ نیت کرکے نکلے تھے کہ اس بار کسی نہ کسی کو اللہ کا ولی بنا کر آئیں یعنی دین دے کر آئیں گے لیکن یہاں تو ہر کوئی دنیاداری کی ہوس میں پڑا ہوا ہے۔

کوئی کہتا ہے شاہ جی میرے گھر اولاد نہیں مجھے بیٹا چاہیے' کوئی کہتا ہے باوا جی ہمارے گھر رزق کی کمی ہے دعا کریں کہ ہمارے گھر میں دولت کی ریل پیل ہوجائے۔ کوئی کہتا ہے پیر صاحب ہمارے بیٹوں بیٹیوں کے لیے اچھے رشتے مل جائیں اور کوئی کہتا ہے بیمار ہوں تعویذ دے دیں صحت یاب ہوجاؤں ہر کوئی اپنی اپنی غرض لے کر آتا ہے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ مجھے اللہ

ور اس کے پیارے رسول ﷺ سے ملا دیں
گوں کی خواہش پوری کرتے کرتے ہماری
واہشیں دل میں ہی رہ جاتی ہیں اور ہم واپس
جاتے ہیں۔

ایسی ہستی ہمیں کہاں پر ملے گی ان کا نام کیا
ہے اور کس جگہ ان کا ٹھکانہ ہے سردار جی پریشان
نہ ہوں اوکاڑہ شہر کے شمال میں بیس بائیس میل
دور بنگلہ گوگیرہ ہے۔

جو انگریزوں کا دارالخلافہ ہے گوگیرہ کے
مشرق میں تقریباً آٹھ نو کلومیٹر کے فاصلے پر شیخو
شریف گائں ہے وہاں پر یہ سرکار جن کا اسم
مبارک سید سردار عالم شاہ ہے اگر وہ آپ کے
ساتھ آجائیں تو اس افتاد سے نہ صرف آپ کو بلکہ
قرب وجوار کو بھی بچا سکتے ہیں۔

سکھ فیلی کے سرکردہ ہربجن سنگھ اپنے دو
بھائیوں تارا سنگھ اور نرمل سنگھ کے ساتھ بتانے
والے کی پختہ یقین دہانی پر کہ سید سردار عالم شاہ
صاحب جو خالص گیلانی خاندان سے تعلق رکھتے
ہیں اس ناگہانی بلا سے بچا سکتے ہیں یوں کہنا
کہ......

سخاوت سے خزانوں میں کمی آتی نہیں ہرگز
نکالو جس قدر دریا سے پانی اور بڑھتا ہے

تینوں سردار بھائیوں نے راستہ کی تفصیل
سے آگاہ ہونے پر اوکاڑہ کے لیے روانہ ہو گئے
اور پھر پوچھتے پوچھتے شیخو شریف پہنچ کر سید سردار
عالم شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے
دکھوں، غموں، مصیبتوں اور پریشانیوں کی پٹاری
کھولی اور بتایا۔

''شاہ جی اس سے پہلے ہم سینکڑوں کی تعداد
سے گرودں، پنڈتوں، پادریوں، بھگتوؤں،
بھکشوؤں، پیروں، فقیروں اور عاملوں کو لے
جا چکے ہیں مگر ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ ان
ہوائی چیزوں پر قابو پا سکیں ان ہوائی اشیا سے ڈر
کر نہ صرف ہمیں بیچ منجدھار میں چھوڑ کر راہ فرار
اختیار کر چکے ہیں بلکہ اُلٹا ہمارے لیے اور زیادہ
تکلیف کا موجب بنے ہیں وہ اس لیے کہ جب
عامل آ کر ان بلاؤں کو نکالنے کی کوشش کرتے تو وہ
اور زیادہ چڑ جاتی یعنی غصے میں آ کر ہمارا بہت
نقصان کرتی ہیں اب کسی نے آپ سرکار کا بتایا
ہے تو آپ کے پاس بہت سی امیدیں لے کر
آئے ہیں۔''

سرکار ان کی بپتا سن کر سرداروں کے ساتھ
چل پڑے لاہور پہنچ کر انہوں نے ان ہوائی مخلوق
کو حاضر کر لیا پہلے تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ کیا
ہیں۔ یہ تین عدد چڑیلیں تھیں دو تو سگی بہنیں اور
تیسری ان دونوں چڑیلوں نے جسے اپنے پیچھے
چھپایا ہوا تھا شاہ صاحب کے پوچھنے پر ان دونوں
چڑیلوں بیک زبان سے بتایا کہ یہ ہماری خالہ زاد
ہے۔

سرکار نے ان سے پوچھا۔

''تم نے اس گھر میں کیوں ڈیرہ ڈالا ہوا ہے
نہ صرف ان گھر والوں کو نقصان پہنچا رہی ہو بلکہ
قرب وجوار کو بھی ملیا میٹ کرنے پر تلی ہوئی ہو
تمہیں کوئی نکیل ڈالنے والا آج تک نہیں ملا آج
میں تمہیں روکنے آیا ہوں اور یہاں سے نکالنے آیا
ہوں تم یہاں کیسے رہ سکتی ہو اور انہیں کیسے نقصان
پہنچاتی ہو۔''

شاہ صاحب کی باتیں سن کر چڑیلیں بڑے
طیش میں آتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''جاؤ چلے جاؤ تم جیسے بہت سے سینکڑوں کی
تعداد میں پیر فقیر عامل، ہمیں یہاں سے نکالنے کے
لیے آئے لیکن سب کے سب منہ کی کھانے کے

بعد اپنی جان بچا کر چلتے بنے تم کس باغ کی مولی ہو ہم کوئی اتنی نادان اور انجان نہیں ہیں کہ تمہاری گیدڑ بھبکیوں سے ڈر کر بھاگ جائیں۔“

سرکار نے جواب میں فرمایا۔

”تو تم بھی اپنے کان کھول کر بلکہ دل کے کان کھول کر سن لو کہ میں بھی کوئی ایسا ویسا عامل و پیر نہیں ہوں کہ تمہارا ڈرانے دھمکانے سے ڈر جاؤں گا میں تو تمہیں جلا کر بھسم کر دوں گا۔“

”تو شاہ جی تم بھی کان کھول کر سن لو ہم بھی تمہاری گردن توڑ کر رکھ دیں گی اور پھر ان سکھوں کا بھی کریا کرم کر دیں گی نہ یہ رہیں گے اور نہ ہی پھر کوئی عامل پیر ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے آئے گا۔“

سرکار نے کہا۔

”ٹھیک ہے پھر ہو جائیں دو دو ہاتھ میں تم سب کو کہتا ہوں یہ گھر چھوڑ دو بلکہ اس پورے شہر لاہور کو چھوڑ دو کسی اور شہر چلی جاؤ۔“

تو چڑیلیں بڑے تکبر اور کروفر سے بولیں۔

”یہ منہ اور مسور کی دال کہ ہمیں نہ صرف پورا علاقہ بلکہ ہمارا اپنا یہ مسکن چھوڑنے کے لیے کہہ رہے ہو خبردار...... یہاں سے چپ چھپاتے (خاموش) چلے جاؤ......ورنہ......“

”ورنہ کیا......“

”ورنہ یہی سردار جو تم کو یہاں لے کر آئے ہیں تمہاری ٹوٹی لاش چھوڑنے تمہارے گھر جائیں گے۔ لہٰذا اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو جیسے آئے ہو ویسے ہی چلے جاؤ۔“ سرکار نے فرمایا۔

”کم بختو اگر میں نے تم کو حاضر کر لیا ہے تو نہ صرف اپنا بچاؤ کرنا جانتا ہوں بلکہ تمہارا تیاں پانچا کر کے ہی جاؤں گا۔ یعنی تم کو ٹھکانے لگا کر ہی جاؤں گا کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔“

”شاہ جی تم کو پہلے بھی بتایا ہے کہ تم سے پہلے بھی بہت سے عامل پیر، فقیر، پادری، گرو، بھگوان بھگت، بھکشو آئے جنہوں نے ہمیں تمہاری طرح لوبان اور گوگل کی دھونی دے کر حاضر بھی کیا یہاں ہمیں ہمارے مسکن سے نکالنے کی دھمکیاں دیں۔

ہمیں جلا کر بھسم کرنے کے دعوے بھی کیے مگر ان کے دعوے کھوکھلے دعوے ہی رہے بلکہ ان سب کو اپنی جانوں کو بچانے کے لالے پڑ گئے ڈر کر ایسے بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔“ سرکار فرمایا۔

”میں کوئی عامل و فقیر، پادری یا گرو، بھکشو یا بھگت نہیں ہوں کہ کھوکھلے دعوے کر کے چلتا بنوں مسلمانوں کے دین اسلام میں تین قول ہوتے ہیں میں یہ تین قول پورے کروں گا پھر اس کے بعد دیکھنا میرا کھیل جو میں تم سے کھیلوں گا۔ اب میں تمہیں کہہ رہا ہو تو تم ٹس سے مس نہیں ہو رہی ہو بلکہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہو پھر تم مجھے کہو گی تو پھر میں نہیں مانوں گا۔ بہتر ہے کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی نو دو گیارہ ہو جاؤ پھر تمہیں موقع نہیں ملے گا۔“

”میں تمہیں حضرت سلیمان بن داؤدؑ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اب بھی وقت ہے میری بات مان لو۔“

وہ بڑے کروفر ڈھٹائی سے بولی۔

”یہ کیا سلیمان پیغمبر کے واسطے دینے لگ گئے ہو ہم تو ہندو ہیں کسی پیغمبر کو نہیں مانتیں۔“

”اگر تم نہیں مانتیں تو نہ مانو ہم اب اپنا کھیل شروع کرتے ہیں۔“

”پہلا قول......تم یہاں سے چلی جاؤ یہ جگہ چھوڑ دو۔“

"نہیں ہرگز نہیں چھوڑیں گی۔"

"دوسرا قول یہاں سے چلی جاؤ یہ جگہ یہ علاقہ چھوڑ دو۔"

"تیسرا قول...... میں کہتا ہوں یہاں سے دفع دور ہو جاؤ۔"

"ہم بھی کہتی ہیں ہم نہیں تم یہاں سے دفع دور ہو جاؤ۔"

یہ سننا تھا کہ سرکار بہت غصے میں آ گئے چہرہ مبارک غضبناک ہو گیا۔ سرکار کی ایسی حالت دیکھتے ہی چڑیلوں نے بھی اپنا چہرہ بدل لیا جو بہت ہی ہیبت زدہ خوفناک ہو گیا یکدم اتنے بڑے قد کے کمرے کی چھت کے ساتھ ان کے سر لگ گئے بڑے بڑے بھدے دانت یوں لگتا تھا جیسے ابھی سب کو کچا چبا جائیں گی۔

سرکار نہ تو ان کی یہ حالت دیکھ کر خوفزدہ ہوئے بلکہ اپنی روحانی طاقت سے جو خداوند قدوس نے انہیں عطا کی تھی ان تینوں کے بالوں کو اپنے دائیں سے پکڑ لیا تو چڑیلوں نے اپنے آپ کو سرکار سے چھڑانے کی بہت کوشش کی بہت چیخی چلائیں بہت روئیں مگر معاملہ یکدم اُلٹا ہو گیا۔ وہی چڑیلیں جو پہلے بہت اکڑ فوں دکھا رہی تھیں اب منت سماجت پر اتر آئیں بولیں۔

"ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آپ واقعی اتنی پہنچی ہوئی سرکار ہیں ہم تو یہی سمجھ رہی تھیں کہ پہلے والے ہزاروں عامل، پیر، فقیر، گرو، بھکشو، بھگت، پنڈت ہمیں نکالنے آئے تو ہمارے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔"

"ہم آپ کو آپ کے اسی پیغمبر حضرت سلیمانؑ کا واسطہ دیتی ہیں کہ ہمیں چھوڑ دو ہم نہ صرف اپنا مسکن یہ علاقہ بلکہ شہر لاہور ہی چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔"

سرکار سید سردار عالم شاہ صاحب نے فرمایا۔

"پہلے میں تمہاری منتیں سماجتیں کر رہا تھا تو تم ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھیں۔ میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ تم نے میری منت سماجت کرنی ہے تم نے مجھے حضرت سلیمانؑ کا واسطہ دیا ہے تو میں اتنا ظالم نہیں ہوں جتنی تم ظالم ہو اللہ کے نام کے طفیل تم پر اتنا رحم کر رہا ہوں کہ تمہیں جلا کر خاک نہیں کروں گا۔ حالانکہ تمہارے عزائم اور جرائم جن کی تفصیل بہت لمبی ہے کو دیکھتے ہوئے تم نے اب تک اس گھر کے مکینوں پر اور پورے علاقے پر ڈھائے تو تم اس سزا کی مستحق ہو لیکن تم نے مجھے واسطہ ہی ایسا دیا ہے جسے میں ٹھکرا نہیں سکتا۔ لہٰذا تمہیں عمر قید کی سزا سناتا ہوں اسی جگہ تمہیں تمہارے ہی مسکن میں اس سامنے والے کمرے کو تمہارے لیے زنداں بناتے ہوئے قید کرتا ہوں۔"

یہ سن کر تینوں پھوٹ پھوٹ کر زار و قطار رونے لگیں۔ چیخ رہی تھیں چلا رہی تھیں بار بار اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے واسطے دے رہی تھیں۔

سرکار نے فرمایا۔

"جب تم اس گھر کے مکینوں پر اور لاہور شہر کے باسیوں پر ظلم کرتی تھیں تو یہ روتے تھے تو تم بہت خوشیاں مناتی اب تمہاری رونے کی باری ہے اور ان کے ہنسنے کی اور خوشیاں منانے کی سچ کہتے ہیں جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔"

ان کے واسطے مسلسل جاری تھے۔ لیکن سرکار نے ان کی ایک نہ سنی تو وہ روتے ہوئے بولیں۔

"ہم جو دو بہنیں ہیں ہمیں قید کر لیں مگر یہ جو تیسری ہماری خالہ زاد ہے یہ ہماری مہمان ہے اسے چھوڑ دیں۔"

سرکار نے ان کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے اس کوٹھی کی دوسری منزل پر ایک کمرے میں قید کر کے دروازے پر اسم اعظم پڑھ کر کیل دیا۔

تاکہ کسی بھی صورت میں باہر نہ نکل سکیں اور دروازے پر بہت بڑا تالا لگا دیا۔

سکھ فیملی نے پاس ہی بیٹھ کر یہ سب ماجرا دیکھ اور سن رہے تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ سرکار نے انہیں قابو کر کے قید کر دیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔

یہ خبر اردگرد کے لوگوں میں پہنچی بلکہ پورے شہر میں ایسے پھیلی جیسے خشک جنگل میں آگ پھیلتی ہے شہر کے لوگ جو پہلے بہت خوف زدہ ڈرے ڈرے سے رہتے تھے آج اس اچانک تغیر وتبدیلی پر خوشیاں منانے کے ساتھ ساتھ مٹھائیاں بھی بانٹی جارہی تھیں۔

سرکار نے ایک راجگیر کو اس کمرے میں ڈیڑھ مربع فٹ کا سوراخ بنوایا اس پر لکڑی کی ایک کھڑکی بنوا کر لگا دی پھر گھر کے مکینوں کو کہا۔

”ہربھجن سنگھ......“

”جی سرکار......“

”میں نے یہ کھڑکی اس لیے لگوائی ہے کہ تم لوگوں نے ہر روز شام کو دال پکا کر ساتھ چھ سات روٹیاں اس کھڑکی کے راستے ان کو دے دیا کرنا۔“

سکھ فیملی کے تمام چھوٹے بڑے گھر کے افراد سرکار کی یہ کرامت دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے ان سب گھر والوں نے علیحدگی میں جا کر آپس میں مشورہ کیا اور پھر سرکار کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے۔

”جی فرمایئے اب کیا بات ہے۔“ تو گھر کے سربراہ ہربھجن سنگھ نے کہا۔

”سرکار ایک عرض ہے اگر قبول ہو......“

”کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔“ کہنے لگا۔

”سرکار پہلے ہمیں یہ یقین دہانی کرائیں کہ جہاں ہم پر اتنی بڑی بلکہ بہت بڑی پہاڑ جیسی مصیبت اور آفت کو دور کر کے ہم پر بہت ہی بڑا احسان کیا ہے وہاں ہماری اس عرض کو بھی قبول کرنے کا وعدہ کریں تو پھر بتائیں گے۔“

”ٹھیک ہے اگر قبول کرنے والی بات ہوگی تو ضرور قبول کروں گا۔“

”سرکار اب آپ آرام کرلیں رات کافی ہوگئی ہے پھر آپ نے پورا دن ان چڑیلوں سے مغز ماری بھی کی ہے یہ بات اب صبح ہی بتائیں گے۔“

اگلی صبح بہت سے لوگ سرکار کی زیارت کرنے آرہے تھے۔ لوگوں کا آنے جانے کا تانتا بندھا ہوا تھا ایک بجے تک سرکار نے کہا۔

”سردار جی اب مجھے آپ لوگ اجازت دیں اور ہاں جانے سے پہلے آپ مجھے اپنی عرض بتادیں جس کے قبول کرنے کے لیے مجھ سے وعدے لے رہے تھے۔“

ہربھجن سنگھ نے آگے بڑھ کر شاہ صاحب کے سامنے ایک بڑا بند خاکی لفافہ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”سرکار ہمارے گرو اور آپ کے اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت کچھ دے رکھا ہے اس لفافہ میں اس کوٹھی کی ملکیت کے کاغذات ہیں۔ جو ہم نے آپ سرکار کے نام کروادی ہے یہ مکان آپ کو اپنی طرف سے تحفے کے طور پر دیتے ہیں ہماری طرف سے یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمائیں۔“

”نہیں میں کوئی تحفہ لینے کے لیے ان کو

کا لئے نہیں آیا' اگر آپ کچھ دینا چاہتے ہیں تو آپ میرے اللہ اور میرے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لے آئیں۔"

"سرکار آپ کی اس بات پر ضرور سوچیں گے آپس میں صلاح مشورہ کریں گے پھر آپ کو اطلاع کر دیں گے لیکن اب ہم اس مکان میں نہیں رہیں گے۔ کیونکہ یہ مکان ہم آپ کے نام کروا چکے ہیں۔ سرکار یہ نذرانہ تو بہت کم ہے ہمارا تو ان چڑیلوں نے بہت نقصان کیا ہمیں بہت زیادہ پریشان کیا۔ ہم اب آئندہ بھی اپنی حیثیت کے مطابق جناب کی خدمت کرتے رہیں گے۔"

سرکار کو مجبوراً یہ کوٹھی نما مکان قبول کرنا پڑا اور پھر اس میں رہائش اختیار کرنا پڑی وہ بھی سکھ فیملی کے بے حد اصرار پر......

سرکار روزانہ شام کے وقت دال اور روٹیاں اپنے ہاتھ سے ان چڑیلوں کو ڈالتے' موصوف کے نانا میاں غلام محمد سرکار کے مرید تھے سرکار نے انہیں خلافت سے نوازا ہوا تھا۔ ایک دن کہنے لگے۔

"یا حضرت میں ان چڑیلوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"میاں صاحب تم ان کو نہیں دیکھ سکو گے۔"

مگر میاں صاحب کے بے جا ضد اور بہت اصرار کرنے پر کہا۔

"چلو ٹھیک ہے تم انہیں دیکھنا ہی چاہتے ہو تو آج شام کا کھانا میں نہیں تم ہی ان کو دینے جاؤ گے اور ہاں زیادہ دیر کھڑکی کے پاس کھڑے نہ رہنا صرف ایک جھلک دیکھ کر کھڑکی بند کر دینا۔"

"جی سرکار ایسا ہی کروں گا۔" انہوں نے کہا۔

شام کو میاں صاحب نے دال روٹیاں لیں اور کھڑکی کو کھولا جیسے ہی کھانا اندر کیا چڑیلوں نے جھٹ سے پکڑ لیا اور ایک دوسرے سے چھین کر کھانے لگیں۔

میاں صاحب ان کی چھینا جھپٹی کافی دیر تک دیکھتے رہے جب اچھی طرح دیکھ لیا اور جی بھر گیا تو جیسے ہی کھڑکی کو بند کیا۔ ساتھ ہی زمین پر دھڑام سے گر پڑے۔

پیچھے شاہ صاحب اپنے چند مریدوں کے ساتھ کھڑے تھے ان مریدوں نے شاہ صاحب کے کہنے پر آگے بڑھ کر میاں غلام محمد کو اٹھا کر نیچے کمرے میں جا کر لٹا دیا اور شاہ صاحب سے کہنے لگے۔

"یا حضرت! میاں صاحب کو تو بہت تیز بخار ہو گیا ہے۔"

سرکار نے میاں صاحب کو دم کیا اور پانی بھی پڑھ کر پلایا اور پوچھا۔

"میاں صاحب ...... اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"جی ...... جی سرکار آپ کی دعاؤں سے ٹھیک ہوں۔" بہت ہی مدھم سی آواز میں جواب دیا۔

سرکار نے فرمایا۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ کھانا اندر دے کر فوراً کھڑکی بند کر دینا لیکن تم نے میرے کہنے پر عمل نہ کر کے اپنی من مانی کرتے ہوئے نتیجہ دیکھ لیا۔" یہ بخار مسلسل چار دن تک برقرار رہا پانچویں دن طبیعت سنبھلنے پر سرکار کی خدمت میں حاضری دی۔

"میاں جی کیسے ہو......"

"ٹھیک ہوں سرکار......" شاہ صاحب نے ازراہ مذاق میں کہا۔

''میاں صاحب......''
''جی سرکار......''
''آپ نے آج پھر چڑیلوں کو کھانا دینے جانا ہے۔''
''نہ سرکار میں نے آج یہ کام نہیں کرنا۔''
''کیوں نہیں کرنا آپ نے ان چڑیلوں کو نہیں دیکھنا کیا؟''
''جی نہیں یہ میرے بس کا کام نہیں میری چھوڑیے میرے ماں باپ کی بھی توبہ جو میں اب ان کو دیکھنے کا نام بھی لوں۔''
وقت تو ایسے گزر رہا تھا جیسے پر لگا کر اڑ رہا ہو' گھنٹے دن میں' دن ہفتوں میں' ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔
سرکار کا آخری وقت آ گیا یوں گمان ہوتا تھا۔ جیسے ہواؤں نے اپنا رخ تبدیل کرلیا ہو۔ بہاریں طوفان کی زد میں آ گئی ہوں۔ انجم کی ضوفشانی کم ہوگئی ہو۔ پھول بھی خزاں کی لپیٹ میں آ گئے ہوں۔ کلیوں نے بھی مسکرانا چھوڑ دیا ہو۔ کیونکہ سرکار اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان کا مزار مبارک شیخو شریف میں موجود ہے۔
اِدھر دوسری طرف 14 اگست 1947ء کا دن کتنا مبارک دن اور روشن دن اور اس کی صبح کتنی نورانی تھی اس دن حضرت قائد اعظم کی ولولہ انگیز قیادت کا پھل اللہ تعالیٰ رب العزت نے پاکستان جیسی عظیم مملکت سے نوازا۔
سکھ خاندان لاہور کو چھوڑ کر ہندوستان جا بسا اِدھر سرکار کے ایک ہی صاحبزادے سید منظور حسین شاہ تھے یہ بھی بہت پہنچی ہوئی ہستی تھی باپ کی طرف سے یہ وراثت میں جو ملی تھی اپنی زندگی بہت اچھے طریقے سے بسر کر کے اس جہان فانی سے وصال فرما گئے سید منظور حسین شاہ صاحب کے دو صاحبزادے سید مشکور حسین شاہ صاحب موصوف جن کے مرید ہیں یعنی بعیت ہیں اور چھوٹے سید مظفر حسین شاہ صاحب تھے۔
ایک روز گرمی کے موسم میں دن کے دس بجے کا وقت تھا سید مظفر حسین شاہ صاحب نے اپنے ایک مرید کو فرمایا۔
''مے شاہ کو چوان اشرف کو کہو کہ تانگہ نکالے ذرا گوگیرہ شہر ہو آئیں تھوڑا سا کام ہے۔''
اشرف نے مے شاہ کے کہنے پر تانگہ تیار کیا گرمی بہت تھی چلچلاتی دھوپ پڑ رہی تھی حضرت صاحب تانگے میں بیٹھ گئے تو اشرف نے تانگہ چلانا شروع کر دیا گرمی کی بنا پر سڑک ویران پڑی تھی تانگہ گاؤں سے ابھی کوئی دو میل کے فاصلے پر ہی گیا تھا کہ سڑک کے بائیں جانب سے بہت ہی سریلی سی آواز آئی۔
سید مظفر حسین شاہ صاحب سرکار ذرا کچھ دیر کے لیے رکنا میری ایک عرض سننا......شاہ صاحب نے اشرف کو تانگہ روکنے کا اشارہ کیا تو تانگہ رک گیا۔ شاہ صاحب اور کوچوان دونوں ہی آواز والی سمت دیکھنے لگے۔ چند لمحوں میں ایک سیاہ برقع میں ایک لمبے قد والی دبلی پتلی سی خوبصورت دوشیزہ خراماں خراماں چلتے ہوئے تانگے کے پاس آ کر رکی برقعے کا پردہ ہٹایا تو اندر سے جو چہرہ برآمد ہوا وہ ایسا حسین و جمیل کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جائیں۔ خوبصورتی میں اپنی مثال آپ گول مٹول چمکتی آنکھیں سرو جیسا قد چمکتی پیشانی اس نے شاہ صاحب کو سلام کیا تو اس کے ہاتھ کی چار انگلیاں تھیں انگوٹھا نہیں تھا۔
سرکار نے کہا۔
''آپ نے سلام کرلیا ہے تو کیا اب ہم چلے جائیں۔''

''جی نہیں سرکار چند منٹ دے دیں میں نے
ابھی تو آپ کو اپنی بات سنانی ہے۔''
''جی کہیے کیا کہنا ہے؟'' وہ بولی۔
''جناب میں بھی آپ کی طرح سید زاری
ہوں۔ میرا گھر حجرہ شاہ مقیم کے پاس چک نمبر 62
تھا۔''
''تھا کا کیا مطلب ہے کہو......''
''نہیں سرکار تھا جواب......نہیں رہا۔''
''کیوں نہیں رہا۔''
''سرکار 1971ء کی جنگ میں انڈیا کے
جہاز نے ہمارے گاؤں پر حملہ کرتے ہوئے بم
باری کی جس سے ہمارا پورا گاؤں تباہ و برباد ہو گیا
جس میں......میں کر ماں ماری کے ماں باپ بہن
بھائی بھی شہید ہو گئے۔ میں اس وقت اپنی خالہ
کے ہاں راولپنڈی میں تھی جب واپس آئی تو اپنے
گاؤں کو ویران اور اجڑا ہوا پایا۔ گھر والوں کے ختم
ہونے کی روح فرسا خبر ملی جس نے میرے دن کا
چین اور رات کی نیندیں اڑا دیں رونا میرے
مقدر میں لکھ دیا گیا۔ میں ہر وقت اپنے پیاروں کو
یاد کر کے روتی رہتی ہوں۔''

آج رات بھی روتے روتے میری آنکھ لگ
گئی تو خواب میں آپ کے دادا سید سردار عالم شاہ
صاحب ملے۔ انہوں نے مجھے پیار کیا اور کہا۔ بیٹا
جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا انہیں واپس تو نہیں
لایا جا سکتا۔ اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا
ہے لہٰذا صبر کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ
ہے لہٰذا تم ایسے کرو یہاں سے چل کر بنگلہ گوگیرہ
کے مشرق میں اس جگہ پر اب جہاں میں اور آپ
موجود کھڑے ہیں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا
کہ اتوار کے دن دس بج کر پچیس منٹ پر ایک
تانگہ گزرے گا جس میں سفید رنگ کا گھوڑا ہو گا
اس تانگے میں میرا پوتا سید مظفر حسین شاہ سرخ
بالوں والے سرکار سوار ہوں گے ان کو اپنے گاؤں
کے تباہ ہونے کی اور اپنے گھر والوں کی شہادت
کی خبر بتا کر یہ کہنا کہ آپ کے بڑے بھائی سید
مشکور حسین شاہ صاحب کے ہاں بیٹیاں ہیں بیٹا
کوئی نہیں......سرکار تمہاری بات سن کر تمہیں گھر
لے جا کر تمہارا نکاح اپنے بڑے بھائی سے
کرا دیں گے تو تمہارے بطن سے اللہ تعالیٰ انشاء
اللہ بیٹا عطا کرے گا یہ ہے عالیجاہ میری دکھوں
بھری داستان غم جو میں نے آپ کے گوش گزار
کر دی۔''

شاہ صاحب نے اسے تانگے پر پیچھے بیٹھنے کا
اشارہ کیا یہ دوشیزہ جب بیٹھ گئی تو حضرت صاحب
نے اشرف کوچوان کو کہا۔
''اشرف ذرا تانگے کو واپس گاؤں کی طرف
موڑ لو ذرا اس کو گھر پر چھوڑ آئیں۔'' تانگہ واپس
چل پڑا ابھی کوئی آدھا کلو میٹر ہی سفر طے ہوا
تھا کہ پیچھے بیٹھی نقلی شہزادی نے جو سید زادی کا
روپ دھارے ہوئے تھی اس نے اپنی اصلی
صورت میں آ کر اپنی طاقت کو یکجا کیا اور پوری
قوت سے شاہ صاحب کی گردن پر ہاتھ مارا یعنی
شاہ صاحب کی گردن توڑنے کی کوشش کی جو
ناکام ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ میرا وار کارگر
ثابت نہیں ہوا شاہ صاحب تو بالکل پہلے سے بھی
بہتر ہشاش بشاش ہیں تو اس نے ایک سیکنڈ کی بھی
تاخیر نہیں کی اڑنے کے لیے بالکل تیار تھی کہ سرکار
نے فوراً پیچھے پلٹ کر اس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں
جکڑ لیا۔

جہاں پہلے بہت خوبصورت چہرہ تھا وہاں
خوفناک ہیبت ناک شکل، شعلہ اگلتی آنکھیں تیر
اور نوکیلے دانت اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے

ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی اس نے بہت ہاتھ پاؤں چلائے زور زور سے چیخ چلا رہی تھی۔

شاہ صاحب نے کہا۔

''بچو میں نے تو اسی وقت ہی دیکھ لیا تھا جب تم نے مجھے سلام کیا تھا تمہارے ہاتھ کی چار انگلیاں دیکھیں انگوٹھا نہیں تھا تو میں نے تمہارے پاؤں کی طرف نظر دوڑائی لیکن وہاں تم نے جرابیں تو پہنی ہوئی تھیں۔ مگر پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے میں اسی وقت سمجھ گیا کہ تم وہ نہیں ہو جو مجھے اپنے بارے میں بتا رہی ہو بلکہ تم ایک چڑیل ہو پھر بھی میں نے تمہیں آزمانے کے لیے کہ یہ میرے ساتھ کیا کھیل کھیلنا چاہتی ہے میں تو انجان بنا رہا تمہیں معلوم نہیں ہونے دیا۔ اب دیکھ میں تیرے ساتھ کیا کھیل کھیلتا ہوں تیری کیا درگت بناتا ہوں۔''

وہ یہ سن کر بہت پھڑ پھڑائی اپنے آپ کو چھڑانے کی بڑی کوشش کی لیکن کہاں اور کیسے چھوٹ سکتی تھی۔ شاہ صاحب نے اشرف کو چوان کی پگڑی لے کر اس چڑیل کے ہاتھ پاؤں باندھ کر تانگے میں اپنے پاؤں میں ڈال دیا اور شیخو شریف اپنے گراں (یعنی گاؤں) میں لے آئے اپنے بڑے بھائی سید مشکور حسین شاہ صاحب کو تمام ماجرا بتایا۔ ان کے مشورے سے اپنے گھر کے باہر صحن جو تقریباً پندرہ سولہ کنال پر مشتمل ہے صحن کے درمیان میں پیپل کا بہت بڑا درخت ہے اس مافوق الفطرت کو اس پیپل کے درخت سے باندھ دیا گیا۔

پورے چار دن تک یہ چڑیل اس درخت سے بندھی رہی ان چار دنوں میں اسے دیکھنے والے لوگوں کا تانتا ہی بندھا رہا جہاں جہاں تک یہ خبر پہنچی وہاں وہاں تک کے لوگ بلکہ دور دور سے لوگ اس چڑیل کو دیکھنے آتے رہے۔

پانچویں دن سرکار نے اسے درخت سے کھول کر کار کی ڈگی میں ڈالا اور لاہور میں لوہاری منڈی کوچہ پیر بھولا صاحب اسی کوٹھی کے کمرے میں جہاں پہلے تین عدد چڑیلیں قید تھیں اس کمرے کا تالا کھولا اور اس چڑیل پر روحانی عمل کر کے اس کے ہاتھ پاؤں کو کھول کر ان تینوں کے ساتھ قید کر دیا اب پہلے والے کھانے میں بھی مزید اضافہ کر دیا گیا جو انہیں ہر شام کو روزانہ دیا جاتا تھا۔

جیسے ہی انہیں کھانا ملتا یہ ایک دوسرے سے اُلجھ کر چھین کر کھانے کی کوشش کرتیں ان میں سے ہر ایک کا یہی ارادہ ہوتا کہ میں زیادہ کھالوں تا کہ میری بھوک مٹ جائے میرا پیٹ بھر جائے ایک دن اس چھینا جھپٹی کو دیکھتے ہوئے سید مظفر حسین شاہ صاحب جو اب اس فانی دنیا میں نہیں رہے عالم برزخ میں چلے گئے ان سرکار کے صاحبزادے سید نصیر الدین شاہ صاحب عرف (ٹیپو سلطان) صاحب نے ان کے کمرے کا تالا کھولا تو چڑیلیں خوف سے تھر تھر کانپنے لگیں۔ اور ٹکر ٹکر صاحبزادہ صاحب کو دیکھنے لگیں۔

صاحبزادہ صاحب نے انہیں کہا۔

''ڈرو مت آؤ باہر نکل آؤ۔'' کہنے لگیں۔

''ہم کمرے سے کیسے باہر آ سکتی ہیں ایک قدم بھی اگر باہر نکالا تو جل کر خاک ہو جائیں گی کیونکہ اس کمرے کو اسم اعظم سے کیل دیا گیا ہے اسی لیے تو ہم خوف زدہ ہیں کہ کہیں آپ ہم سے تنگ آ گئے ہوں اور ہمیں نیست و نابود کرنا چاہتے ہوں ہم سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہوں۔''

''نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ تم کو ختم

کروں بلکہ میرا کچھ اور ہی ارادہ ہے وہ بھی اگر تم سب مجھ سے تعاون کرو گی تو......''
''ہم سے آپ کو کس قسم کا تعاون درکار ہے ہم تو ہر طرح سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔''
''اگر میں تم سب کو اس قید سے آزاد کردوں تو پھر تم کیا کرو گی۔''
چاروں ہی ایک زبان ہو کر بولیں۔
''صاحبزادہ صاحب جی پہلے ہمیں آپ کے گھرانے کے متعلق معلوم نہ تھا اب ہم پر سب کچھ عیاں ہو گیا ہے اگر آپ ہم کو معاف کر کے آزاد کردیں گے تو ہم بھی آپ سے پختہ وعدہ کرتی ہیں کہ آئندہ اپنی پرانی روش پر بھول کر بھی نہیں چلیں گی کبھی کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔''
''ہاں سرکار جہاں ہم پر اتنی بڑی مہربانی کرنا چاہتے ہیں وہاں ہماری ایک عرض ہے اس پر بھی نظر ثانی کرتے ہوئے ہماری درخواست کو قبول کرتے ہوئے ایک اور مہربانی فرمائیں گے وہ یہ کہ...... یہ گھر ہمارا مسکن ہے اگر آپ جناب کی اجازت مل جائے تو کبھی کبھار اس گھر میں چکر لگالیا کریں مسکن تو ہر ایک کو پیارا ہوتا ہے لیکن اب تو یہ آپ کا آستانہ مبارک ہے۔ اجازت ہو تو اپنے گھر کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ آپ سرکار کی زیارت بھی نصیب ہو جایا کرے گی یہ چوتھی بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گی کیونکہ کافی عرصہ سے ہمارے ساتھ قید میں رہی ہے۔''
''میں تم پر کیسے یقین کرلوں کہ تم آزاد ہو کر کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔''
''صاحبزادہ جی ہم آپ سے پکا قول قرار کرتی ہیں۔ ہم آپ سے کیے گئے وعدے کو ضرور نبھائیں گی اگر آپ دیکھیں کہ ہم اپنے وعدے پر پورا نہیں اتر رہی یا ہم سے کبھی غلطی سے بھی کوئی کوتاہی ہو جائے تو ہمیں دوبارہ اسی قید خانے میں ڈال دینا یا ہمیں جلا کر بھسم کر دینا۔''
''اگر آپ جناب ہمیں چھوڑنے کی ہمت رکھتے ہیں تو ہمیں دوبارہ قابو کرنے کی بھی طاقت رکھتے ہیں۔ سرکار اتنے سال قید میں رہنے کی وجہ سے ہماری آنکھیں کھل چکی ہیں۔'' بس پھر کیا تھا قول و قرار لینے کے بعد سید نصیر الدین عرف ٹیپو سلطان شہزادے نے اسم اعظم پڑھ کر اس کیل کو ختم کرتے ہوئے انہیں آزاد بھی کر دیا اور انہیں اپنے مسکن میں آنے جانے کی اجازت بھی دے دی۔ صاحبزادے صاحب نے نئی کوٹھی ماڈل ٹاؤن میں بنالی۔
تو پھر کوٹھی کا کچھ حصہ اپنے مرید رحمت علی کے سپرد کر دیا اور کچھ حصہ موصوف محمد حنیف شاکر کی چھوٹی ہمشیرہ و بہنوئی حافظ حاجی محمد حسین کو دے دیا حافظ صاحب سات آٹھ سال تک اس میں رہائش پذیر رہے اور اس میں اسلامی مدرسہ بھی کھولے رکھا بچوں بچیوں کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن پاک حفظ و ناظرہ بھی پڑھاتے رہے۔
اس عرصے میں کئی بار یہ چڑیلیں اس گھر میں آتی رہیں لیکن کبھی کسی کو کوئی دکھ تکلیف نہیں پہنچایا۔ ہاں ان کے ساتھ شغل (مذاق) ضرور کرتی تھیں کہ کبھی کوئی برتن اٹھالیا کبھی بستر اٹھالیا کبھی کوئی چیز اور کبھی اور کوئی چیز اٹھالیتیں ڈھونڈنے پر نہ ملتی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد وہی چیز گھر کے کسی دوسرے حصہ میں پڑی مل جاتی یہ چڑیلیں آج بھی اسی طرح اپنے مسکن میں آتی جاتی ہیں۔

☆☆......☆☆

Digitized by Google

صوابی سے ارسال کردہ انتہائی ڈراؤنی کہانی

کیوریسٹورنٹ

ہوس پرست لڑکوں کا انجام

جس نے سنا وہ دہل گیا......

کوثر اسلام صوابی

"یار مہرو! پروگرام کے بارے میں کیا سوچا ہے پرسوں آخری پیپر ہے۔" شایان نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔

"شانی ٹھیک کہہ رہا ہے مہرو، ہمیں آج پروگرام فائنل کرنا چاہیے۔" مہران کو خاموش دیکھ کر راحیل نے لقمہ دیا۔

مہران کرسی میں تھوڑا سا سیدھا ہوا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر دھماکے دار انداز میں کہا۔

"میری طرف سے پروگرام فائنل ہے اس یار ہم جا رہے ہیں گڑھی ٹھاکر جیت۔"

"گڑھی ٹھاکر جیت......" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"یہ نام پہلی بار سن رہے ہیں۔" علی صفدر نے کہا۔

"جی ہاں گڑھی ٹھاکر جیت اور اس کے بارے میں واقعی کسی نے نہیں سنا۔" مہران نے اسی انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"گڑھی ٹھاکر جیت پہاڑی کے دامن میں ایک سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ پہاڑی، دریا، سرسبز کھیت، باغات، صاف ستھری ہوا یقین کریں بڑا مزا آئے گا۔"

"ٹھہرنے کے لیے کوئی بندوبست کیا ہے میرا مطلب ہے کوئی ہوٹل وغیرہ۔" راحیل نے پوچھا۔

"اصل میں میرا ایک ماموں ہے جسے دیہاتی زندگی بہت پسند ہے۔ وہاں اس نے ایک حویلی بنائی ہے ہم ان کے پاس حویلی میں ٹھہریں گے۔" مہران نے جواب دیا۔

"واؤ زبردست۔" شایان پُرجوش ہو کے بولا۔

"اور ہاں ایک بات اور......" مہران نے مزید کہا۔

"دیہاتی علاقے حسن سے مالا مال ہوتے ہیں وہاں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکیاں ہیں دل کی حسرتیں خوب نکالنا۔"

"ای ی ی یا......" سب کے لہرا کر چیخنے

لگے۔

''تو پھر گائیز...... تیاری کرو پرسوں پیپر ختم ہونے کے بعد یہاں کھانا کھائیں گے اور دو بجے یہاں سے نکلیں گے۔ مہران نے کہا۔

☆......☆......☆

مہران، راحیل، شایان اور علی صفدر مون انجینئرنگ کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ چاروں کے چاروں بگڑے ہوئے رئیس زادے تھے۔ پڑھائی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کالج صرف لڑکیوں کے لیے جاتے، کئی معصوم لڑکیوں کی زندگیاں انہوں نے تباہ کر دی تھیں۔ کالج کی ایک لڑکی صائمہ نے ان کی وجہ سے خودکشی کی تھی۔ ان کی زندگی کا مقصد ہی عیش و عشرت اور شراب و کباب تھا۔ سیر و تفریح کے دلدادہ تھے۔ جب بھی موقع ملتا ٹور پر نکل جاتے۔

اس بار انہوں نے گڑھی ٹھاکر جیت کے لیے پروگرام بنایا۔ گڑھی ٹھاکر جیت میں مہران کے ماموں چوہدری نعیم بیگ رہتے تھے۔ چوہدری نعیم بیگ کے بیٹے قائم بیگ کی مہران کے ساتھ خوب بنتی تھی۔ دراصل قائم بیگ نے ہی مہران کو بلایا تھا۔ کھانا کھانے اور تیار ہوتے ہوتے تین بج گئے۔ تین بجے وہ گڑھی ٹھاکر جیت کے لیے روانہ ہو گئے۔ سفر کرتے ہوئے انہیں دو گھنٹے ہو چکے تھے ان کی منزل ابھی بہت دور تھی وہ ایک سنسان راستے پر محوِ سفر تھے۔ سردیوں کا موسم تھا آسمان پر کالے بادل تیزی سے پھیل رہے تھے۔ شام کے



ائے وقت سے پہلے ہی گہرے ہو گئے۔
''یار موسم کے تیور بڑے خطرناک لگ رہے ہیں آس پاس دیکھو اگر کوئی ہوٹل' سرائے یا ٹھہرنے کی جگہ مل جائے تو وہاں رُک سکتے ہیں۔ خراب موسم میں تاریک اور سنسان راستے پر ڈرائیونگ ٹھیک نہیں۔'' راحیل نے مشورہ دیا۔
''بات تو ٹھیک ہے لیکن ایسی جگہوں پر ہوٹل ممکن ہے۔'' شایان نے کہا۔
کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی پھر علی صفدر جو مہران کے ساتھ آگے بیٹھا تھا تقریباً چلا کر کہا۔
''وہ دیکھو وہ دیکھو وہاں کوئی جا رہا ہے۔''
انہوں نے غور سے دیکھا تو انہیں ایک ہیولہ سا دکھائی دیا جو سڑک کے کنارے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جا رہا تھا۔ مہران نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اس کے قریب پہنچ کر اس نے بریک لگائی۔ شایان نے شیشہ نیچے کر کے دیکھا تو ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ لڑکی کو دیکھ کر سب کی رال ٹپکنے لگی۔ شایان نے نہایت مہذب انداز میں کہا۔
''ہم گڑھی ٹھا کر جیت جا رہے ہیں۔ راستے میں ہمیں دیر ہو گئی۔ آس پاس اگر ایسی جگہ ہو جہاں ہمارے لیے قیام و طعام کا بندوبست ہو سکے تو بتا دیں ہم آپ کے شکر گزار رہیں گے۔''
''سر یہاں سے تھوڑا سا آگے ایک ریسٹورنٹ ہے کیو ریسٹورنٹ ان کی طرح لذیذ کھانا کوئی نہیں بنا سکتا ان کے پاس قیام کے لیے بہترین انتظام ہے میں وہاں کام کرتی ہوں۔'' لڑکی نے نرم لہجے میں بتایا۔
''اوہ یہ تو بہت اچھا ہوا آپ ہمارے ساتھ بیٹھ جائیں ہم تمہیں پہنچا دیں گے۔'' شایان نے دروازہ کھول کر کہا۔
لڑکی ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دروازہ بند کر کے مہران کو چلنے کا کہا مہران نے گاڑی اسٹارٹ کی تو لڑکی سے پوچھا۔
''آپ اس ویرانے میں کیا کر رہی تھیں؟''
''یہاں ایک میم صاحب رہتی ہیں۔ اس نے کھانے کا آرڈر دیا تھا تو میں وہ پہنچانے آئی تھی۔ اس نے چائے کے لیے بہت اصرار کیا تو میں چائے پینے اس کے پاس رُک گئی اس لیے دیر ہو گئی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔
''مگر یہاں تو کوئی گھر نظر نہیں آتا۔'' علی صفدر نے پوچھا۔
''گاؤں والے سڑک کے قریب گھر نہیں بناتے ان کا خیال ہے کہ ان کے بچوں کو کوئی تیز رفتار گاڑی سے کچل دے گا۔ اس لیے سارے گھر سڑک کے کنارے لگے درختوں کے پار ذرا فاصلے پر ہیں۔'' لڑکی نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔
جب لڑکی باتیں کر رہی تھی تو شایان کا ہاتھ بار بار لڑکی کی ران پر پڑتا۔ وہ یوں ظاہر کرتا جیسے یہ انجانے میں ہو رہا ہے لیکن لڑکی اس کی ذہنیت اور سوچ کو سمجھ گئی۔
کچھ دیر بعد ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ ریسٹورنٹ پر ایک بڑا سا بورڈ لگا تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا' کیو ریسٹورنٹ اینڈ ہوٹل' رات کو اسے اجاگر کرنے کے لیے اس پر چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے بلب لگا دیے تھے۔ جو وقفے وقفے سے جلتے بجھتے' ریسٹورنٹ میں کافی لوگ کھانا کھانے میں مگن تھے۔ مہران نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو اسے ایک بات عجیب سی لگی۔ ریسٹورنٹ میں قبرستان کی سی خاموشی تھی ہر کوئی سر جھکائے کھانے میں مصروف تھا کسی قسم کی کوئی آواز نہیں

تھی۔

دوسری بات جو اسے پسند آئی وہ یہ تھی کہ یہاں کوئی لڑکا نہیں تھا خوبصورت لڑکیاں خدمت پر مامور تھیں۔ وہ سب للچائی نظروں سے لڑکیوں کو دیکھنے لگے۔

استقبالیے پر ایک تنومند شخص موجود تھا۔ جس نے موٹی سی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کی چھوٹی سی مونچھیں تھیں جبکہ داڑھی منڈھی ہوئی تھی سر پر بڑی سی ٹوپی تھی جس سے سیاہ و سفید بال جھانک رہے تھے۔

مہران نے اس سے ہاتھ ملایا تو اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر اترتی ہوئی محسوس ہوئی اس نے گلا صاف کر کے کہا۔

''سر ہمیں رات گزارنے کے لیے کمرے چاہیے۔''

''کتنے کمرے؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

مہران نے کچھ سوچ کر کہا۔

''سر چار کمرے چاہیے۔''

''او کے ہو جائے گا۔'' اس نے چابیاں نکال کر ایک لڑکی کو آواز دی۔

''نتاشا...... اونتاشا......''

''جی سر......'' لڑکی آواز سنتے ہی لپک کر آ گئی۔

''مہمانوں کو ان کے کمرے دکھاؤ اور ان کے آرام کا ہر طرح خیال رکھو۔'' اس نے لڑکی کو چابیاں دے کر کہا۔

لڑکی نے ان کو کمرے دکھائے جو انہیں بے حد پسند آئے پھر مہران کے کمرے میں جمع ہو کر انہوں نے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ کھانا بے حد لذیذ تھا جو انہوں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔

کھانے کے بعد مہران نے انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا۔

''الگ الگ کمرے میں نے اس لیے بک کیے ہیں کہ سب اچھی طرح عیاشی کریں جاؤ آج کی رات تمہاری ہے۔'' ان کو رخصت کرنے کے تھوڑی دیر بعد ایک خوبصورت لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اس نے ہاتھوں میں ایک ٹرے پکڑی تھی۔ جس میں ایک بوتل اور دو گلاس رکھے تھے۔ بوتل اور گلاس میز پر رکھ کر لڑکی بولی۔

''سر یہ بہت عمدہ شراب ہے آج رات میں آپ کے پاس رہوں گی میں کچھ کام نمٹا کر آتی ہوں تب تک آپ اس سے شغل فرمالیجیے۔''

''نہیں جب تم آ جاؤ گی تو مل کر پیئیں گے۔'' مہران نے کہا۔

''ٹھیک ہے سر میں پندرہ منٹ میں آتی ہوں۔'' لڑکی یہ کہہ کر چلی گئی۔

مہران کچھ دیر تک یونہی بیٹھا رہا پھر اسے پیاس محسوس ہوئی تو وہ اٹھا اور فریج کا دروازہ کھول کر پانی کی بوتل نکالنے لگا مگر دروازہ کھولتے ہی اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

فریج میں ایک انسانی سر تھا دروازہ کھولتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر کہا۔

''قبرستان ریسٹورنٹ میں آپ کا سواگت ہے۔''

مہران پیچھے ہٹا اور گھوم کر دروازے کی طرف بھاگا مگر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا دروازہ غائب تھا چاروں طرف سپاٹ دیواریں تھیں۔ انسانی سر فریج سے چھلانگ لگا کر بستر پر آ گیا۔ وہ شعلہ بار آنکھوں سے مہران کو گھور رہا تھا۔ مہران کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں وہ دیوار کے

ساتھ لگ کر کھڑا تھا اسے یقین ہوگیا کہ وہ کسی شیطانی چکر میں پھنس گیا ہے اور اب اس کی موت یقینی ہے اسے اپنے کرتوت ایک ایک کر کے یاد آرہے تھے۔

انسانی سر اچھلا اور مہران کے کندھے پر جا کر اس کے بازو میں دانت گاڑ دیے۔ وہ درد سے دہرا ہوگیا۔

دوسرے ہاتھ سے اس نے اسے ہٹانا چاہا مگر جونہی اس کا ہاتھ اس سے لگ گیا اسے اپنے بدن میں کرنٹ دوڑتا ہوا محسوس ہوا اسے یوں لگا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھوا ہو۔ وہ لہراتا لڑکھڑاتا ہوا بستر پر آیا اور اوندھے منہ گر گیا۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ انسانی سر نے نوچ نوچ کر اس کا ہاتھ کندھے سے الگ کر دیا۔ جانے کہاں سے ایک خوفناک بلی آئی وہ جسامت میں کافی بڑی تھی۔ اس کے منہ سے بھیانک غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ سر نے منہ کے ذریعے ہاتھ کھسکا کر نیچے پھینک دیا۔

بلی کے اگلے دو پیر انسانی ہاتھوں جیسے تھے۔ مہران کے ہاتھ کو اس نے اٹھایا اور بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر کھانے لگی۔

''آج عیش کی رات ہے خوب مزے کرو۔'' سر نے بلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

بلی چند لمحوں میں ہاتھ چٹ کر گئی۔ پھر چھلانگ لگا کر بستر پر چڑھ گئی اور مہران کی ران میں دانت گاڑھ کر گوشت نوچنے لگی۔ سر اس کے دوسرے ہاتھ کو علیحدہ کرنے لگا۔ وہ درد کی شدت سے بلبلا رہا تھا مگر اپنے جسم کو جنبش تک نہیں دے سکتا تھا۔ کافی دیر تک وہ اذیت سہتا رہا پھر اس کی آنکھوں کے آگے تاریکی چھا گئی۔

☆......☆......☆

راحیل کے کمرے میں بھی لڑکی شراب لے کر گئی۔ جب وہ جانے لگی تو راحیل نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر بستر پر گرا دیا۔ بستر پر گرتے ہی لڑکی کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ اس کے نوکیلے لمبے دانت نکل آئے ہاتھوں کے ناخن لمبے ہو گئے۔ سر کے بال بکھر گئے۔ اس کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسیت تھی کہ راحیل خود کو اس سے علیحدہ نہ کر سکا۔ لڑکی پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے دیوانہ وار اپنے نوکیلے دانت راحیل کی گردن میں پیوست کر دیے۔ راحیل کے بدن سے سارا خون پینے کے بعد اس نے ایک لمبی ڈکار لی اور اس کی لاش کو نفرت سے دھکا دے کر گرا دیا۔

☆......☆......☆

شایان اپنے تمام دوستوں میں سب سے زیادہ ہوس پرست تھا۔ اس کا نامہ اعمال اس کی سیاہ کاریوں سے بھرا پڑا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں آنکھیں بند کیے لڑکیوں کے تصور سے محظوظ ہو رہا تھا زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک لڑکی شراب لے کر آ گئی اور اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ بڑی نفاست سے اس نے گلاس بھر کر اسے دیا اور مسکرا کر کہا۔

''آج کی رات کو رنگین بنایئے۔''

شایان جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اس نے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں پی لی۔ اسے عجیب سا سرور محسوس ہوا۔ اس نے گلاس بڑھا کر کہا۔

''ایک اور......'' لڑکی نے دوسرا گلاس بھر کر اسے دیا۔ اس پر نشہ سا طاری ہونے لگا۔ اس کا سر بھاری ہونے لگا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا اور چند منٹوں بعد دنیا و مافیا سے بے خبر ہوگیا۔

کافی دیر کے بعد شایان کی آنکھ کھلی تو وہ تھوڑا سا کسمسایا مگر اسے حیرت ہوئی وہ اپنے جسم کو حرکت نہیں دے سکتا تھا اسے دونوں ہاتھوں اور پاؤں سے کس کر باندھا گیا تھا۔ اس کے قریب ایک کالا کلوٹا لمبا تڑنگا مکروہ صورت آدمی کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار چھری تھی وہ بڑے جارحانہ انداز میں شایان کو گھور رہا تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر شایان کو اپنے جسم میں اترتی محسوس ہوئی۔

وحشی آدمی آگے بڑھا اور شایان کے بازو پر چھری سے کٹ لگایا خون اس کے بازو سے ابل کر نکلنے لگا اس نے ایک پیالہ اس کے نیچے رکھا جب پیالہ بھر گیا تو مزے لے لے کر اسے پینے لگا۔ شایان درد سے تڑپ رہا تھا۔

خون پینے کے بعد وہ آدمی تازہ دم نظر آنے لگا۔ اس نے شایان کی ٹانگ کاٹ دی اور اس کی ران سے گوشت الگ کرکے اس کا قیمہ بنایا۔ اور پھر وہ قیمہ سموسوں میں ڈالنے لگا۔

سموسے بنانے کے بعد اس نے ایک لڑکی کو بلایا اور اسے وہ سموسے دے کر کہا۔

''اسے اس کے چوتھے ساتھی کو کھلا دو۔'' لڑکی سموسے لے کر چلی گئی۔ تو وہ دوبارہ شایان کی طرف متوجہ ہوا۔ شایان درد کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس نے اس کے تمام اعضاء کاٹ کر الگ کر دیے۔ آنکھوں کو اور دل کو نکال کر اس نے کڑاہی میں ڈالا اور اچھی طرح تلنے کے بعد نکال کر مزے سے کھانے لگا۔ سیر ہونے کے بعد اس نے دیگر لڑکیوں کو بلا کر کہا۔

''لو تم بھی مزے کرو۔'' لڑکیاں شایان کے کٹے ہوئے اعضاء پر بھوکی بلیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔

پاکستان کی پہلی خاتون کارٹونسٹ نگار نذر

پاکستان کی پہلی خاتون کارٹونسٹ، نگار نذر کی تخلیقات میں ''گوگی'' کو بنیادی حیثیت حال ہے۔

اپنے اس کارٹونک کردار کی مدد سے، انہوں نے فکر کو مختلف معنی اور نظر کو سیکڑوں زاویے دیے۔

''گوگی''، پہلی مرتبہ 1970ء میں انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ کرافٹ' کراچی کے سالانہ میگزین کے ذریعے منظرِ عام پر آئی اور بعض ملکی روزناموں میں کامک اسٹرپ کی صورت میں شائع ہوئی۔

دنیا بھر میں اس کارٹون کردار نے اپنی شناخت قائم کی۔ نگار نذر کے مطابق، گوگی، اُن عورتوں کی ترجمان ہے، جو معاشرے کے لیے کارآمد بننا چاہتی ہیں۔

اجتماعی و انفرادی اعتبار سے ترقی کی خواہش مند ہیں۔

اپنے حقوق چاہتی ہیں اور ایک ایسی سوسائٹی کی خواہش رکھتی ہیں جہاں انصاف ہو اور شہریوں کو بنیادی حقوق حاصل ہوں۔ گوگی کا کردار کامک اسٹرپس کی صورت میں ملکی اور غیر ملکی روزناموں کے علاوہ کئی میگزین کی زینت بنا اور پاکستان میں اسے ٹیلی ویژن پر بھی پیش کیا گیا۔

نگار نذر کے کارٹونک آرٹ کو بیرونِ ملک بے حد سراہا گیا اور اسے بہت اہمیت دی گئی۔

(ایم وجاہت۔ بھورے والا)

☆......☆......☆

علی بستر پر ٹیک لگائے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لڑکی اندر داخل ہوئی اور سموسوں کی پلیٹ اور چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کہا۔

''سر چائے سے شغل فرمالیجیے میں کچھ کام نمٹا کر آپ کا دل بہلانے آجاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔'' علی صفدر نے کہا۔ لڑکی کے جانے کے بعد علی صفدر نے سموسہ اُٹھا کر چکھا تو اسے بہت لذیذ لگا ایک ایک کر کے اس نے سارے سموسے کھا لیے۔

چائے پینے کے بعد اسے بے چینی محسوس ہونے لگی وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک اسے اپنے دائیں ہاتھ میں درد محسوس ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا اس کی ہتھیلی کی پشت پر لمبے لمبے بال اُگ آئے۔ وہ حیران و پریشان ہاتھ کو خود سے دور کیے دیکھتا رہا۔ ہتھیلی میں درد کا احساس ہوا تو اس کی نظر ہتھیلی پر پڑی۔ ہتھیلی درمیان میں پھٹ کر انسانی منہ کی شکل اختیار کرگئی۔ خدا کی پناہ اپنی ہتھیلی پر اسے ہونٹ نظر آرہے تھے۔ انگلیوں کے قریب بالکل نیچے دو آنکھیں بن گئیں۔ وہ آنکھیں علی کو گھورنے لگیں۔ ہونٹ کھلے تو اس میں سے زبان باہر نکلی۔ وہ ہونٹوں پر پھیر کر اندر گئی۔ علی نے منہ میں نوکیلے دانت دیکھے۔ وہ حیران و پریشان اس عجیب و غریب ماجرے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس منہ سے آواز آئی۔

''میں پیاسا ہوں مجھے خون پلا کر میری پیاس بجھاؤ۔'' علی حواس باختہ ہوگیا۔

''مجھے خون چاہیے مجھے خون چاہیے۔'' اس کی آواز تیز ہوگئی۔ دفعتاً اس کا ہاتھ اس کی گردن کی طرف زور لگانے لگا۔ علی اسے خود سے دور کرنے لگا۔ مگر جانے اس ہاتھ میں اتنی قوت کہاں سے آئی۔

علی کی مزاحمت اس کے سامنے ماند پڑگئی اور اس کا ہاتھ اس کی گردن سے چپک گیا۔ نوکیلے دانت اس کی گردن میں پیوست ہوگئے۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخنے لگا مگر اس کی آواز وہاں سنتا کون، خون پینے کے بعد ہاتھ نے گوشت کھانا شروع کیا اور چند منٹوں میں علی کے جسم کا تمام گوشت کھا گیا۔

☆......☆......☆

سنتوک سنگھ گڑھی ٹھاکر جیت کے مضافات میں اپنی بیٹی نتاشا کے ساتھ اپنی زمینوں میں رہ رہا تھا۔ دو کمروں کے چھوٹے سے گھر میں باپ بیٹی ہنسی خوشی رہ رہے تھے گاؤں کے سردار جوگندر سنگھ کا بیٹا مہندر سنگھ باہر سے پڑھ کر آیا تو اس نے گاؤں سے باہر ریسٹورنٹ بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اسے سنتوک سنگھ کی زمین پسند آگئی مگر سنتوک سنگھ نے اسے بیچنے سے انکار کردیا۔

ایک رات مہندر سنگھ اپنے آدمیوں کے ہمراہ سنتوک سنگھ کے گھر آیا سنتوک سنگھ کو باندھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی بیٹی کی عصمت دری کی گئی۔ بعد میں دونوں کو قتل کردیا گیا۔

مرنے سے پہلے سنتوک سنگھ نے کہا۔

''یہاں ریسٹورنٹ بنے گا ضرور بنے گا لیکن وہ قبرستان ریسٹورنٹ ہوگا اور وہ تیرے جیسے ہر ہوس پرست کا قبرستان ہوگا۔''

اس واقعے کے چند دن بعد مہندر سنگھ پُراسرار طور پر مر گیا۔ 15 نومبر 1987ء سے لے کر آج تک وہ زمین ویسی ہی ویران پڑی ہے۔

☆☆......☆☆

پشاور سے ارسال کردہ ناقابلِ یقین واقعہ

آسیبی نیم کا درخت

نیم کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھتے ہوئے
خیال رکھا کریں کہ کہیں یہ نیم آسیبی تو نہیں......

عثمان غنی

''لڑکے نے جیسے ہی نیم کے درخت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر دیں، وہ نیم کے اندر ایک دوسری دنیا میں پہنچ گیا، اور اس کا پیچھا لوہے سے بنا ہوا ایک انسان کرنے لگا، وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا رہا مگر اسے کوئی جائے پناہ نہیں مل رہی تھی''

تنہا چھوڑ کر ہم کو حوصلہ بھی دیتے ہو
سانس چھین کر پھر جینے کی دعا دیتے ہو
اک طرف جدائی کا تذکرہ بھی ہے جاری
اور پھر مسکرانے کا مشورہ بھی دیتے ہو

وہ گرمیوں کی ایک جھلساتی ہوئی دوپہر تھی، تن کو جھلسانے والی، بدن سے پسینہ بہانے والی، وہ گرمیوں کی سخت ترین دوپہروں میں سے ایک تھی، میں اس دوپہر میں چلتے، چلتے شدید تھک چکا تھا۔

اُف توبہ! اتنی گرمی......اب میرا چلنا دشوار تھا، سائد مجھے پہلے اتنی گرمی لگی ہوں، گرم ہوا جب جسم سے ٹکراتیں تو ایسے لگتا کہ جسم کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہوں۔

چند لمحے ستانے کے واسطے میں نے اپنی نگاہیں اس بڑے سے، نیم کے پیڑ پر ٹھکا دیں۔

سامنے کھڑے نیم کا گھنا سایہ دار درخت، تھا، اس کے قریب میں رک گیا، میرے سامنے سیدھی اور لمبی، ویران سڑک تھی، جس پر کوئی گاڑی بھی نہیں جا رہی تھی، یہاں تو کسی بھی ذی روح کا نام ونشان تک نہ تھا۔

جلد ہی میں نیم کے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، میں نے کالج کا بیگ اٹھا رکھا تھا اور اسے اپنے قریب ہی رکھ دیا۔ درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہی گرمی کا احساس قدرے کم ہو گیا، اور ہوا کے گرم جھونکے ٹھنڈے جھونکوں میں تبدیل ہو گئے، ٹھنڈے ہوا کے جھونکے جب میرے چہرے سے ٹکراتے، تو مجھ پر خمار سا چھا جاتا اور آنکھیں خود بخود بند ہونے لگتیں۔ میں نے اپنا کالج بیگ اٹھا کر سر کے ساتھ رکھ دیا، اس کا تکیہ بنا کر رکھ دیا، اور خود میٹھی نیند کے جھونکوں

میں گم ہو گیا، نیند کے آغوش میں جاتے ہی میں جہاں سے بے خبر ہو گیا۔

☆......☆......☆

میں ایک تنگ سے راستے پر جا رہا تھا، جو ایک پہاڑی چٹان سے گزرتا ہوا قریب ہوتا تھا۔ میں تنہا تھا، میرے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ حدِ نظر، تک چٹانی زمین اور پتھریلا علاقہ دکھائی دیتا تھا، سورج اپنے جوبن پر تھا، اور شدت سے آگ اگل رہا تھا۔

چلتے، چلتے پیچھے مڑ کر دیکھا، تو بہت دور میرے پیچھے ہیولیہ چل رہا تھا، وہ پہاڑی علاقے میں سفر کر رہا تھا۔

یقیناً وہ میری طرح کا ہی ایک انسان ہو گا۔

وہ ہیولیہ نما انسان جو میرے پیچھے آ رہا تھا، میرے لیے تعجب کا باعث بن گیا۔ میں نے اپنی رفتار ایک انجانے خدشے کی باعث تیز کر لی، اور، جوں، جوں، خوف کے باعث مڑ کر دیکھتا، توں، توں میری خوف کی شدت اور بڑھ جاتی۔

میں جتنا تیز قدم لے سکتا تھا، مگر فاصلہ بڑھنے کے بجائے گھٹ رہا تھا، اور وہ تیزی سے میرے قریب آ رہا تھا، اب تو فاصلہ بھی تیس، اکتیس فٹ کا رہ گیا ہو گا۔

جب فاصلہ بیس فٹ سے بھی کم رہ گیا، تو میں نے مڑ کر اس انسان کو غور سے دیکھا، اس کو دیکھنے کے بعد خوف سے میری گگی بند ہو گئی۔ اور وہ تو



کوئی انسان نہ تھا، وہ کچھ اور شے تھا، اس کا چہرہ لوہے کا بنا ہوا تھا، خوف زدہ چیخ میری منہ سے بلند ہوئی، اور میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔

وہ انسان نہ تھا، لوہے کا پورا کا پورا بنا ہوا تھا، وہ طویل قامت تھا اور ایسے لگتا تھا، کہ کسی نے اس کو آگ میں غسل دیا ہوں، اس کا لوہا نما وجود سرخ انگارہ تھا، وہ لوہے کا گرم انسان میرے پیچھے آ رہا تھا۔

اس انسان میں سب سے زیادہ خطرناک چیز اس کی سرخ، آنکھیں تھیں۔ جو خون کی طرح لال تھی، اور اس پر بلب کا گمان ہوتا تھا، دوڑتے، دوڑتے میرے پاؤں شل ہو چکے تھے، اور میری سانس بری طرح سے پھول چکی تھی۔ وہ ہیبت ناک انسان کم فاصلے سے میرے تعاقب میں تھا، اور مسلسل میرے اور اس کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا، اب میں بھاگنے لگا، بھاگنے کے دوران میں نے جوتے بھی اتار کر کہیں پھینک دیے، اور یہ میری سب سے بڑی بھول تھی۔

نوکیلی زمین تھی، پتھر پاؤں تلے آتے، تو کھال ادھیڑ جاتی، میرے پاؤں لہولہان ہو گئے، اب جب زخمی پاؤں کے نیچے، نوکیلے پتھر چبھتے تو میری چیخیں نکل جاتیں۔

آگے ایک چٹان تھی، جو کافی اونچی تھی، اب مجھ سے مزید بھاگا نہیں جا رہا تھا، میرے پاؤں زخم، زخم تھے، خون آلود پاؤں سے میں چٹان پر ایک قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا، ایک تو سورج کی حدت سے چٹان کی زمین گرم تندور بن گئی تھی۔

میں نے چٹان پر جوں ہی پہلا قدم رکھا، میں لڑکھڑا کر منہ کے بل گر گیا۔ بس مجھے اتنا یاد تھا، کہ وہ فولادی میرے سر پر کھڑا مجھے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

اُف خدایا، وہ انسان میرے ساتھ بیٹھ گیا، اس نے اپنا استخوانی ہاتھ میرے چہرے کی طرف بڑھایا، اس سے پہلے کہ وہ مجھے پکڑتا میں ہوش وخرد سے بیگانہ ہو کر اندھیروں کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہوتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

جب مجھے ہوش آیا تو دھیرے، دھیرے آنکھیں کھول دیں۔

نجانے کتنی دیر میں بے ہوش پڑا تھا، پورے جسم میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

اپنے ساتھ پیش آنے والا ذہن کے پردے کی اسکرین پر گھوم گیا، تو پورے جسم میں خوف کی شدید برقی لہریں دوڑ گئیں۔ دل خوف کے باعث ڈوبنے لگا، ہمت کر کے اٹھا، اور دھیرے، دھیرے چلنا شروع کیا، آنکھیں خوف سے کھلی اس ویران راستے کا جائزہ لے رہی تھی، جہاں سے وہ فولادی انسان میرے پیچھے تک آیا تھا، اب نہیں تھا، صرف میں تھا، میں زخموں سے چُور تھا، مگر اس واقعہ پر غور کرنے لگا۔

ایک خیال ذہن میں آتے ہی بھرپور خوف کی جھرجھری لی اور طویل ٹھنڈی آہ! منہ سے خارج کی۔

وہ بھیانک انسان جس طرح میرے پیچھے لگا تھا۔ اسے مجھے نقصان پہنچانا چاہیے تھا، مگر اس نے مجھے چھوڑ دیا آخر کیوں؟

وہ کہاں گیا؟، کون تھا؟ کیا چاہتا تھا؟ دل مختلف سوالوں میں الجھانے لگا، دل ساتھ ڈرانے بھی لگا، اور دماغ فوری طور پر اس ویرانے سے نکل جانے کو کہہ رہا تھا، ورنہ وہ وادھورا کام پورا کرنے واپس بھی آ سکتا تھا۔

اچانک آسمان بادلوں سے بھر گیا، چھبتا ہوا سورج کہیں گم ہو گیا، ہوائیں چلنے لگیں، اور بارش کی بوندیں کسی نعمت کے طرح آسمان سے گرنے لگیں۔

میں زخم، زخم پاؤں کو بھلا کر خوشگوار موسم میں آگے چلنے لگا، اس خوبصورت موسم نے میرا سارا ڈر دور کر دیا، میں اس ویران پہاڑی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سینکڑوں کانٹے دار جھاڑیوں کو عبور کرتا چلا گیا۔

نگاہیں اگر پیچھے دیکھ بھی لیتیں، تو وہ فولادی انسان نہیں تھا۔ وہ پہاڑی اور چٹانی سلسلہ تھا ،جنہیں میں تواتر سے پیچھے چھوڑتا چلا آرہا تھا۔

خون سے سرخ پاؤں میں خاصی تکلیف ہو رہی تھی۔ مگر میں خوش تھا کیونکہ میں زندہ تھا۔

چلتے، چلتے، پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے چبھنے لگے، مگر میں نے اپنی ہمت، اور حوصلے سے یہ پہاری سلسلہ پار کر لیا۔

اب دور سے کھیت کھلیان اور سرسبز میدان نظر آنے لگے، میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، جہاں سبزہ ہوتا ہے، وہاں آبادی بھی ضرور ہوتی ہیں، زیادہ چلنے کی وجہ سے، میری سانس پھول گئی تھی، اور پاؤں من، بھر کے ہو گئے تھے۔

آگے سرسبز وشاداب ،لہلہاتے کھیت تھے۔ میں چلتا ہوا قدم، قدم کھیتوں کی پگڈنڈی پر پہنچ گیا، اب بارش رک چکی تھی۔

اور ہوا اور موسم اچھا اور خوشگوار لگ رہا تھا، دور سے میں نے ایک کھیت میں کسی کو کام کرتے ہوئے دیکھا، تو قدم قدم چلتا ہوا اس کے پاس چلا گیا۔

وہ ایک بوڑھی عورت تھی، اور چارہ بنا رہی تھی۔

میں اسی بڑھیا کے پاس پہنچا، پھولے ہوئے سانسوں سے سلام کیا، جس کا اس نے کوئی بھی جواب نہیں دیا، ہاں صرف سر ہلایا۔

پانی! میں نے صرف اتنا کہا، حلق میں کانٹوں کی شدت سے آواز تک نہ نکلی۔ اور لب اتنے کپکپائے کے بمشکل آواز تیز ہو گی۔

تب بڑھیا نے غور سے مجھے دیکھا، وہ بڑھیا عمر رسیدہ تھی، اس کی رنگت کالی تھی۔ اور اس کی شکل بہت خوفناک تھی، مگر اس نے سفید اجلا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

سفید لباس میں وہ بڑی ہی عجیب لگ رہی تھی، میں نے اسے وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

''ارے ،تو کتنا زخمی ہے، اور تیرا چہرہ کتنا معصوم ہے۔'' بڑھیا پھوپلے منہ سے حیرت سے بولی۔

''ہاں، پانی...... پانی چاہیے۔''

آؤ میرے گھر چلو، وہاں تمہیں پانی بھی مل جائیگا، اور تم کچھ دیر آرام بھی کر لوں گے، اور میں تمہیں کھانا بھی دے دوں گی۔ اور میرے بیٹے کے کپڑے بھی مل جائیں گے۔''

بڑھیا نے میرے جواب دینے سے پہلے ہی میرا ہاتھ پکڑا، اور مجھے کھیت کے درمیان ایک پگڈنڈی پر لے جانے لگی۔ چند کھیتوں کو عبور کرنے کے بعد وہ مجھے ایک کٹیا میں لے گئی۔ اس میں ایک ہی چارپائی پڑی تھی، میں بے دم ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا، بڑھیا نے جلدی پاس پڑے مٹکے سے کٹورہ بھرا، اور میرے منہ سے لگا دیا، کچھ پانی میں نے پیا، کچھ منہ، بہتا ہوا، گریبان کو بھگونے لگا۔ پانی پیتے ہوئے میں تھر، تھر کانپ رہا تھا۔

''تم کچھ دیر لیٹ جاؤ، میں تمہارے لیے کھانا

بنا کر لاتی ہوں۔"
بڑھیا باہر چلی گئی، اور میں اس کے چارپائی پر لیٹ گیا۔
وہ جب باہر سے آئی، تو اس کے ہاتھ میں مٹی کے برتن تھے، اس میں سالن تھا، جو بنرے سے بنا تھا، اور گندم کے بجائے جو کی روٹی تھی، میں بھوکا تھا، کھانا ایسا کھایا، کہ کوئی نخرہ تک نہ کیا، اور خدا کا شکر بجالانے لگا، کہ اس حالت میں بھی مجھے بھوکا نہیں رکھا۔
"تم فکر مت کروں، ابھی میرا بیٹا آتا ہی ہوگا، اور میں تمہارے لیے کپڑے نکال کر لاتی ہوں۔"
میں نے بڑھیا کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا۔ مگر بڑھیا اٹھی نہیں، گھاس پھوس کا بنا ہوا وہ کھٹیا، کے دو دروازے تھے، جو دونوں طرف کھلتے تھے۔
اچانک گھاس بھوسے سے بنا ہوا دروازہ جھٹکے، سے کھل گیا، اور وہی فولادی وجود اندر داخل ہوا، خوف سے میں جھٹکے سے اٹھ گیا۔
اوہ! میرے خدا، جس کے وجہ سے میں نے میلوں کا سفر طے کیا تھا، وہ یہی آدھمکا، میں جس ڈر سے پیچھا چھڑا رہا تھا، وہ یہی پر ہی تھا۔ جس خوف سے میں نے وہ پہاڑی سلسلہ عبور کیا تھا، وہ میرے روبرو آگیا تھا۔
"یہی ہے، وہ جس کی مجھے بڑی طلب ہے۔" وہ غرایا اور میرا وجود کانپنے لگا، ایسے لگا کہ وہ منہ سے آگ اگل رہا ہو۔
کٹیا کا دوسرا دروازہ میرے قریب ہی تھا، میں نے اس سے نکل کر بھاگنا چاہا، مگر بڑھیا نے اپنا پیر میرے راستے میں رکھ کر مجھے منہ کے بل گرا دیا۔
"کہاں تک بھاگو گے، جو ایک بار فولادی کے شکنجے میں پھنس جائے، وہ چاہ کر بھی نہیں نکل سکتا۔"
"تم ہماری دنیا کے اندر آچکے ہو، اب تم ہماری دنیا میں ہو، اور تم ہمارے شکار ہو۔"
روز تم ہماری دنیا (نیم کے پیڑ) سے گزرتے تھے، اور روز میں تمہیں حسرت سے دیکھتا تھا۔ آج تم اس پیڑ کے اندر آچکے ہو، باہر سے ایک چھوٹا سا پیڑ لگنے والا اندر پوری دنیا بسائے ہوئے ہیں۔ ہم اس دنیا کے باسی ہیں، فولادی کی آواز میرے کانوں کے پردے پھاڑنے لگیں۔
بڑھیا فولادی کی بات پر قہقہے لگانے لگی۔
آج میں برسوں کی پیاس تمہارے خون سے بجھاؤں گی۔ میں نے خوف سے بڑھیا کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ بھیانک ہونے لگا، ہونٹ پھٹنے لگے، منہ سے ٹیڑھے، میڑھے دانت باہر نکلنے لگے۔
ہاتھوں کے ناخن پھیل کر لمبے ہونے لگے، اس کے بال سانپوں کی مانند اس کے وجود سے لپٹنے لگے، اور آنکھوں کی جگہ دو بھیانک گڑھے بن گئیں۔ خوف سے میں نے جھرجھری لی، اور بڑھیا میری طرف بڑھنے لگی۔
کب سے پیاسی تھی، تیرے لہو سے میں اپنے من کی پیاس بجھاؤں گی، جہنمی بڑھیا چیخی، اس کی آواز ڈھول کی مانند پھٹی ہوئی تھی۔
وہ ماں بیٹا میرے قریب آنے لگیں، پہلے بڑھیا نے اپنا خونی ہاتھ بڑھا کر میری شرٹ پھاڑ دیا، میرا سینہ نظر آنے لگا۔ پھر اس نے مجھے گردن سے پکڑ لیا، میں خود کو چھڑانے کی ناکام کوششیں کرنے لگا۔
فولادی، نے اپنا پنجہ نما ہاتھ بڑھا کر میرے سینے پر رکھ دیا، اس کا ہاتھ لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اس کے ناخن نوکدار تھے، کسی خنجر کی طرح، اب وہ میری چھاتی پر اپنا ہاتھ رکھ چکا تھا۔
تو تو بڑا صحت مند ہے، تیرا مضبوط دل مجھے

پسند آئیگا۔اس کی آواز کسی چوہے کی طرح کھر کھرائی،موت میرے سر پر کھڑی تھی،میری زور دار چیخیں نکلیں،اور خوف سے میں نے آنکھیں بند کر لیں،جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر دیتا ہے۔

☆......☆......☆

اور پھر مجھے یوں لگا، کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہوں۔اور کوئی، زور، زور سے میرے شانے کو ہلا رہا ہوں۔

''اٹھو!تم کیوں چیخ رہے ہوں؟ کیا ہوا ہے؟ پلیز اٹھو، تمہیں ہو کیا ہو رہا؟'' کانوں میں رس گھولتی ہوئی شیریں آواز سنائی دی۔

اچانک جھٹکے سے میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میں نیم کے درخت سے ٹیک لگائے ہوئے تھا،اور وہ لڑکی میرے پاس بیٹھی ہوئی مجھے ہلا رہی تھی، ایک لمحے کو مجھے لگا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں،مگر یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔میرے سامنے ایک من موہنی سی صورت والی میری ہم عمر لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔وہ جدید دور کو نمونہ تھی،اس نے بڑا پیارا لباس پہنا ہوا تھا،وہ کوئی پری دکھائی دے رہی تھی،وہ لڑکی مجھے حیران، حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی، میں نے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا،میں اسی نیم کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا، مجھے اس بھیناک نیند سے جگانے والی لڑکی میرے لیے فرشتہ بن کر آئی ہوئی تھی،اچانک میں چونک گیا۔

نئ یہ خواب تو نہیں تھا،ہ تو حقیقت ہے،میرا حال ایسا کہہ رہا تھا۔سڑک کت ساتھ اس کی نئ ہنڈا اسوک کار کھڑی تھی۔

حیران مت ہو،میں اپنی کار میں یہاں سے گزر رہی تھی کہ تم اس درخت کے ساتھ تنے سے ٹیک لگا لگا کر بری طرح سے چیخ رہے تھے۔میں نے گاڑی روکی اور تمہارے پاس چلی آئی،تمہاری حالت بہت خراب ہے،اس کی سبب میں جان سکتی ہوں،تمہاری یہ بری حالت کس نے کی ہے؟

میں نے اپنے آپ کو دیکھا،تو منہ سے کوئی لفظ تک ادا نہیں ہوا، میں رونے لگا،میرا خون میں بھیگا بدن،لہو،لہون پاؤں، پھولی ہوئی سانسیں،اور سینے پر خون آلود نشان، جو اس خواب ہونے کے سچ ہونے کے تصدیق کر رہے تھے۔

میں بری طرح سے زخمی ہوں،اور تم میری مدد کرو، میں نہیں چل سکتا،میرے پاؤں من، من بھر کے ہو چکے ہیں،اور کیا تم مجھے کسی قریبی ہسپتال لے جا سکتی ہوں، میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہیں بھلا سکوں گا۔

''ضرور میں تمہیں لے جاتی ہوں۔'' وہ لڑکی بے حد مہربان تھی، وہ اٹھی،اور جھک کر مجھے اٹھانے لگی، اس نے اپنے کندھے سے میرا بازو گھما کر گزارا،اور مجھے اٹھانے میں کامیاب ہو گئی، میں کمزوری محسوس کر رہا تھا،اور لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ چلتا اس کی نئ گاڑی میں بیٹھ گیا،وہ فوری طور پر مجھے قریبی ہسپتال لے گئ، مجھے وہاں پر ایڈمٹ کرایا،اور میرے لیے رکی رہی، جب میں کچھ بہتر ہوا،اور میری حالت سنبھل گئ،تب وارڈ میں مجھ سے ملنے آئی۔

تم کیسے اس حال کو پہنچے؟

اس نے اپنی نرم و شیریں آواز میں پوچھا۔

پتہ نہیں تم یقین نہیں کروں گی۔میرے ساتھ انہونی ہو چکی ہے۔میں گھبرایا ہوا تھا۔

کیسی انہونی، کیا کسی نے تمہاری یہ حالت جان بوجھ کر کی ہے۔

نہیں اس نیم کے درخت کے اندر ایک پوری

دنیا آباد ہے، اور میں اسے شروع سے بتانے لگا، سب کچھ بتانے کے بعد اس نے کہا، کہ وہ زیبا ہے، اور کالج میں پڑھتی ہے۔

میرا نام احمر ہے، اور میں فورتھ ائیر میں ہوں، وہ بھی فورتھ ائیر کی سٹوڈنٹ تھی، وہ بہت رحم دل اور نیک لڑکی تھی۔ اب میرے سامنے بیٹھے ہوئے کافی باتیں ڈسکس کر رہی تھی۔

اس نے مجھ سے اپنے خاندان کے بارے میں بھی بتایا، اور مجھ سے بھی میرے خاندان کے بارے میں پوچھا، وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی، جبکہ میں تو خالہ اور خالو کے ساتھ بچپن سے رہ رہا تھا، عرصہ پہلے میرے ماں باپ، ریل کے حادثے میں اس جہان فانی سے گزر کر جا چکے تھے، خالہ بانجھ تھی، اس لیے ان ہی کا میں بھی اکلوتا بیٹا ہوں، اور ان دونوں نے اصل والدین کی طرح مجھے پیار اور توجہ دی ہے۔

میرے کہنے پر زیبا نے ہمارے گھر کے لینڈ لائن نمبر پر فون کر کے خالہ، خالو کو اطلاع دی، اپنوں کو پاس دیکھ کر مجھے دلی ڈھارس ملی۔

البتہ زیبا کو میری نیم والی کہانی کسی الف، لیلیٰ کی داستان سے بڑھ کر کچھ نہ لگی، اور اس نے مجھے اس پر غور کرنے کی تاکید کی، مگر اس کے باوجود بھی زیبا نے اس پر یقین کر لیا، اور میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

خالہ اور خالو کو اس نے کافی ڈھارس دی، اور ان کو اچھی طرح سے ملی، مگر زیبا ہمارے اس چھوٹے سے خاندان سے ضرور متاثر ہو گئی تھی۔ اور اس نے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ مگر جانے سے پہلے اس نے اپنا لینڈ لائن نمبر مجھے دے دیا۔

☆......☆......☆

میں نے خالہ، خالو کو بھی وہی ناقابل یقین واقعہ کہہ سنایا، وہ دونوں سادہ دل تھے، سخت پریشان ہو گئے،

خالو مجھے ٹھیک ہوتے ہی ایک بابا کے پاس لے کر چلے گئے۔

وہ سفید نوری علم کے بابا بہت باادب اور محترم شخصیت کے مالک تھے، ساری رام کہانی سننے کے بعد کہہ دیا۔

تو قسمت والا ہے، جو اس جن کے چنگل سے بچ کر آ گیا۔ ورنہ جو بھی جنات کے شکنجے میں پھنس جائے، وہ بڑی مشکل سے اس کی دنیا سے نکلتے ہیں، وہ فولادی اگر تمہیں ایک بار اپنی دنیا میں لے جا سکتا ہے، تو وہ دوبارہ بھی ایسا گھٹیا کام کر سکتا ہے، کیونکہ یہ تو اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق ضرور ہیں، مگر اس مخلوق میں کچھ سرکش اور نافرمان بھی ہے، وہ انسانوں کا خون پینا اور انھیں تنگ کرنا اپنا قانونی حق سمجھتے ہیں، اب تمہیں اسی جن کا خاتمہ کرنا ہے، اور ساتھ میں اس کی ماں کو بھی، ورنہ یہ جس کے پیچھے پڑ جائے، نسلوں تک پیچھا نہیں چھوڑتے۔

میں باباجی کی باتیں سن کر سخت پریشان ہو گیا۔

اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

باباجی میں کیسے اس جن کا خاتمہ کر سکتا ہوں؟

طریقہ میں تمہیں سمجھا دیتا ہوں، اور تم نے اس پر عمل کرنا ہے، یہ دم کی ہوئی چار کیلیں ہیں، یہ تم نے اسی نیم کے درخت کے تنے میں برابر فاصلے سے ٹھونک دینی ہیں، مگر چاروں کیلوں کا سر ایک انچ تنے سے باہر ہونا چاہیے، جب تم چار کیلیں درخت کے تنے میں برابر فاصلے سے ٹھونک دو، تب تم نے یہ سفید ڈوری چار کیلوں کے گرد چار مرتبہ لپیٹ دینی ہیں اور تم نے اس کے ساتھ چاروں قل کا ورد چار مرتبہ پڑھنا ہے، جب تم یہ کام کر چکو، تو تم نے سب سے آخر میں اس ڈوری کے سرے پر آگ لگا دینی

ہے، بس تمہارا کام ختم، اور یاد رکھو یہ کام تم نے دوپہر کے وقت کرنا ہے، کیونکہ شام اور رات کے وقت جنات آدم زاد پر زور آور ہوتے ہیں۔

میں نے باباجی کی ساری باتیں ذہن نشین کر لی، اور ان سے وہ ساری چیزیں لے لیں، ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور گھر آ کر زیبا کو کال کر کے ساری باتیں بتا دی۔

اس نے کہا کہ تم اکیلے، نہ جانا، وہ بھی میرے ساتھ جانا چاہتی تھی، میں نے بھی ہامی بھر لی، اور خالو جان بھی ساتھ جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

کل دوپہر کے وقت زیبا ہمارے گھر پہنچ چکی تھی، اور خالہ جان قرآن کی تلاوت کر رہی تھی، اور بار، بار مجھ پر پھونکیں مار رہی تھی، ہم تھوڑی دیر بعد گھر سے نکلے، زیبا کار چلا رہی تھی، اور میں قرانی آیات پڑھ رہا تھا۔ گاڑی کا رخ آسیبی نیم کے درخت کے جانب تھا۔

جب ہم درخت کے پاس پہنچے، تو چلچلاتی دوپہر تھی اور سخت گرم ہوا چل رہی تھی، میں نے ہتھوڑا اور کیلیں ہاتھ میں پکڑی اور درخت کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

میں نے چاروں قل کا ورد شروع کر دیا اور پہلی کیل، نیم کے تنے میں ٹھونک دی اچانک بھیانک آواز سی آئی۔

میں کانپ اٹھا، مگر گھبراہٹ پر قابو پا کر برابر فاصلے سے دوسری کیل بھی ٹھونک دی، چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دینے لگے، اور تیز ہواؤں کے جھکڑ بھی چلنے شروع ہوئے، میں نے چاروں قل کا ورد جاری رکھا، اور مناسب فاصلے سے تیسرا کیل ٹھونک دی، تیسری کیل ٹھونکتے ہی کسی کی درد بھری ایک بھیانک چیخ سنائی دی، ایسے لگا کے کہ میں نے یہ کیل فولادی کی کھوپڑی میں ٹھونک دی ہو، معمولی سا خوف بھی انسان کے عزائم ڈگمگا دیتا ہے، مگر شکر ہے خدا کا کہ میں چابت قدم رہا اور میرے قدم مضبوط رہیں، میں نے ورد جاری رکھا، اور چوتھی کیل جیسے ہی درخت میں ٹھونک دی، میں نے پینٹ کی جیب سے ڈوری نکالی اور برابر کیلوں کے گرد چار مرتبہ گھما دی، ڈوری کو جیسے ہی میں نے چار مرتبہ کیلوں کے گرد مکمل گھمایا، ایک دم سناٹا چھا گیا۔ میں نے ماچس کی تیلی جلائی، اور ڈوری کو لگا دی، چاروں طرف سے رونے دھونے کی منحوس آوازیں سنائی دینے لگیں اور جب تک وہ ڈوری جلتی رہی، تب تک میں وہ خبیث آوازیں بھی سنتا رہا، میں آگے بڑھا میرا کام ہو چکا تھا، نیم کا درخت اپنی جگہ سہی سلامت تھا اور اس کے اندر جنات کی دنیا کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

وہ دنیا جل کر خاکستر ہو گئی۔ میں نے خالو کو گلے لگایا اور رونے لگا، خالو مجھے مبارک اور سلامتی کے پیغام دے رہے تھے۔

زیبا نے بھی مجھے مبارک کی پیش کی، اور کہا "احمر تم بہت بہادر ہوں، تم نے اس ناپاک جنات کا خاتمہ کر دیا، جو تمہارے خون کے پیاسے تھے۔" میں ہنس دیا اور کہنے لگا۔

"زیبا جی میری نئی زندگی میں کچھ نہ کچھ حق آپ نے بھی ادا کر دیا ہے۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ تو بس آپ کی زندگی ابھی رہنی تھی۔" زیبا نے دھیمے انداز میں وضاحت دی۔

ہاں جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔ جب اللہ مدد کرتا ہے، تو کسی نہ کسی انسان کو وسیلہ بنا کر بھیج دیتا ہے، جیسے میں جب مر رہا تھا، تو تم میری مدد کو

آ گئیں بے شک یہ میری ہماری تقدیر میں لکھا تھا۔

☆......☆......☆

وقت کا کام ہے آگے بڑھ جانا وقت پر لگا کر گزرتا رہا، آج میں ایک بہت بڑی پوسٹ پر ہوں، میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہیں، زیبا میری جان میری بیوی کے روپ مین میرے سامنے ہے۔ خالہ جان اور خالو جان بہت کمزور ہو چکے ہیں، اور اب بھی ہیں، ہم ان کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ زین اور امشا ہمارے بچے ہیں، زین سیکنڈ ائیر میں ہے، اور پری میڈیکل کا ہونہار اور لائق سٹوڈنٹ ہے، جبکہ امشا میٹرک کر رہی ہے، اور سائنس کی طالبہ ہے، ہماری زندگی جیسے خوشیوں سے بھر گئی ہے، بائیس سال کا عرصہ کیسے گزرا پتہ ہی نہیں چلا۔ زین مجھ پر گیا ہے، زندگی سے بھر پور نوجوان ہے، اسے دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کے وہ حسین دن یاد آتے ہیں جب میں بھی اس کی طرح کالج جایا کرتا تھا، میری بیٹی زیبا کی طرح حسین اور خوبصورت ہے، یہ ہی زندگی ہے جو چلتی ہے، رکتی نہیں ہے، چاہے دکھ سکھ اور دھوپ، چھاؤں کے رنگ آپ کے جیون میں کیسے بھی ہوں، وقت اآگے ہی بڑھتا ہے، یہ تو میری کہانی تھی، جو یہی تک تھی، مگر کاش یہی تک رہتی، میں اسے ایک فل سٹاپ لگوا کر اس وقت کو آگے بڑھنے سے روک دیتا، مگر یہ تو زندگی ہے یہ دھوپ، چھاؤں کی پرواہ کب کرتی ہے، یہ تو بس گزرتی جاتی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کیا؟ میرے کیال میں ایسا ہی تو ہے۔

☆......☆......☆

آج ماں کے منع کرنے کے باوجود زین کالج جا چکا تھا، اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ حالانکہ وہ بارہ بجے تک لوٹ آتا تھا۔ مگر ابھی دو بجے کا وقت ہو چکا تھا۔ اور اس کا کچھ بھی اتہ پتہ نہیں تھا۔ میں بھی کچھ پریشان ہوا، مگر زیبا زیادہ فکر مند ہو گئی تھی۔

زیبا کی تو جیسے زین میں جان اٹکی ہوتی تھی، وہ تھوڑی دیر کیا کرتا زیبا کی جان پر بن آتی تھی۔ میں بھی تھورا سا پریشان ہو گیا، آخر میرا جوان بیٹا تھا، زین بہت ذہین نوجوان تھا، کالج میں اور سکول کو ریکارڈ اس کا ہمیشہ شاندار تھا، کبھی بغیر بتائے کہیں بھی نہیں جاتا تھا۔

میں نے زین کے نمبر پر کئی کالز کیں۔ مگر وہ بند جا رہا تھا، اور پھر اس کے جتنے دوستوں کے نمبرز گھر میں تھے، اس پر بھی کالز کرنے شروع کر دیئے مگر وہ کہیں بھی نہیں تھا، تب اس کے کالج فون کر کے پتہ کرنا چاہا، پرنسپل نے کہا سارے بچے تو بارہ بجے ہی چلے گئے ہیں۔

سہہ پہر تک دل کو تسلی دیتا رہا، آ جائے گا، کسی کام میں پھنسا ہوگا۔

مگر زیبا تو بالکل رونے والی ہو گئی تھی، اور امشا تو رو رہی تھی، زین نے کبھی اس طرح تو نہیں کیا تھا،

ہم نے اس پریشانی میں کھانا بھی تو نہیں کھایا تھا۔

سہہ پہر شام میں ڈھل گئی، مگر زین نہیں آیا۔

اور اب شام رات میں ڈھل رہی تھی، میں گھر سے باہر نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک ایمبولنس سائرن بجاتی ہوئی گلی میں داخل ہو گئی۔

ایمبولنس ہمارے گھر کے سامنے رک گئی، میرے تو پیروں سے زمین نکل گئی۔ میں باہر بھاگا، امشا اور زیبا بھی لرزتے دل کے ساتھ باہر چلے آئے۔ زیبا نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”یا اللہ خیر......“

ایمبولنس سے رضا کار اسٹریچر نکال رہے تھے، اس پر کسی کی نعش پڑی ہوئی تھی، اور وہ

سفید کپڑے سے ڈھانپ دی گئی تھی۔
زیبا نے دھڑکتے دل سے اسٹریچر سے کپڑا ہٹا دیا، اور اس کی دلدوز چیخیں گلی میں گونجنے لگیں۔
اسٹریچر پر زین کی خون میں دوبی ہوئی لاش پڑی تھی، امشا اور زیبا کی چیخ و پکار نے سارا محلہ سر پر اٹھا لیا۔ سارے لوگ گھروں سے نکلنے لگے۔ میں اس وقت بالکل گرنے والا ہو گیا، اور اس صدمے سے ٹوٹ کر بکھر گیا، آنسو مسلسل میرے آنکھوں سے رواں تھے، اور ہم پر بے وقت ااسمان ٹوٹ پڑا تھا، قیامت سے پہلے قیامت آچکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں پورا محلہ جمع ہو گیا تھا، اور زین کی بے وقت موت پر آنسو بہا رہا تھا۔
خالہ اور اخالو جان تو چیخ، چیخ کر کہہ رہے تھے، ارے زین بیٹا اٹھ بھی جاؤ۔
بلاوا تو ہمارا آنا تھا، تم کیسے بے وقت ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک قیامت خیز منظر تھا اور ہر آنکھ اس موت پر اشکبار تھی۔
☆......☆☆
پوسٹ مارٹ کے مطابق زین کی موت دوپہر ایک بجے ہوئی تھی، کالج سے کافی فاصلے پر ایک بڑا نیم کا درخت تھا، جو بائیں طرف کے سڑک کنارے کھڑا تھا۔
پتہ نہیں کس طرح زین درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، زین کے پیر زخمی تھے، اس کے سینے پر تیز دھار آلے سے وار کیے گئے تھے اور اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ زین کی موت بالکل ویسے ہی ہوئی تھی، جیسے مجھے فولادی نے دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر تو زیبا نے بچا لیا تھا۔ اس کے سینے پر آہنی ہاتھوں اور لمبے ناخنوں سے لکیروں کا جال بچھایا گیا تھا۔ اسے میرے کیے کی سزا مل چکی تھی۔ میں چیخ چیخ کر رونے لگا۔

اس کی پینٹ کی جیب سے ہمیں ایک خون سے لکھا ہوا خط ملا تھا، اور اس خط نے ہمارے ہوش گم کر دیے تھے۔
میں واشونی ہوں، انتقام کی آگ میں کب سے جل رہی ہوں، تم لوگوں کو یاد ہوگا، فولادی اور اس کی ماں، جسے تم لوگوں نے بے دردی سے صفحہ ہستی سے فنا کر دیا تھا، میں اپنی دنیا چھوڑ کر ان دنوں بھارت گئی ہوئی تھی۔
ہم جنات بھی دیس، دیس، گھومتے پھرتے ہیں۔ میں بھی کالا جادو کے ایک بڑے تانترک سے اپنی کالی شکتیوں میں اضافہ کرنے کے اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ کر چلی گئی تھی، لیکن جب واپس آئی، تو میری دنیا ہی فنا ہو چکی تھی کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا، میرا شوہر اور میری ساس کو تم لوگوں نے مار دیا تھا۔ ان دونوں کے خاتمے کے بعد میں نے بھی قسم کھالی تھی کہ جب تک میں بدلہ نہیں لیتی۔ تب تک میں چین سے نہیں بیٹھوں گی، مگر اس سے پہلے کہ میں انتقام لیتی، کسی نے اپنی طاقت سے مجھے وش میں کر لیا، ایک دن پہلے وہ شخص مر گیا اور اس کی قید سے میں آزاد ہو گئی۔ تمہارے بیٹے کو مار کر مجھے سکون مل چکا ہے۔
مگر میرا انتقام ابھی ادھورا ہے' میں اور زیبا بیٹے کی جدائی میں جیسے پاگل ہو چکے ہیں۔ کوئی خوشی ہمارے لیے معنی نہیں رکھتی دن ہو یا رات ہر لمحے امشا کو اپنی نظروں کے سامنے رکھتے ہیں' کہیں وشوانی میری بیٹی کو بھی اور اُس سے آگے سونے کی میری نہ تو ہمت ہے نہ طاقت۔"
آپ لوگ بھی دعا کیجیے کہ آسیبی نیم کے فتنے سے ہم لوگ اب محفوظ رہیں کیا آپ کے گھر میں یا گھر کے قریب کوئی نیم کا درخت ہے؟
☆☆......☆☆

ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ارسال کردہ سچی تحریر



کوئی تھا جنگل میں

وہ جن تھا مگر انسانوں کے ظلم کا شکار ہوا تھا اور انتقاماً انسانوں کو قتل کر رہا تھا......

محمد قاسم خان بلوچ

یہ سن 94ء کا ایک سچا واقعہ ہے میں ان دنوں ضلع فیصل آباد شہر میں ایک سرکاری عہدے پر کام کر رہا تھا تو ایک دن اچانک میرے گاؤں سے ٹیلی فون آیا کہ میرے گاؤں میں ایک بندے کا قتل ہو گیا ہے اور قتل ہونے والا شخص میرا چچازاد بھائی اشرف خان ہے یہ خبر میرے لیے اس وقت بڑی لرزہ خیز خبر تھی اس لیے کہ مقتول اشرف خان میرا چچازاد ہونے کے ساتھ میرا بہت اچھا دوست بھی تھا۔

اس خبر کو سنتے ہی میں نے اپنے گاؤں جانے کی مختصر سی تیاری کی اور اپنا ضروری بیگ ساتھ لیے فیصل آباد لاری اڈے میں پہنچ گیا اس وقت عصر کی اذان ہو چکی تھی میں نے لاری اڈے میں پہنچتے ہی لنڈو پل اسٹاپ کا ٹکٹ لیا اور اس بس میں سوار ہو گیا جو بس ٹھیک آدھے گھنٹے بعد فیصل آباد سے صادق آباد کی طرف روانہ ہونے والی تھی۔

بس کو فیصل آباد لاری اڈے سے روانہ ہوتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگ گیا کیونکہ اس زمانے میں ایک تو ٹرانسپورٹ بہت سست رفتار تھی اور دوسرا سڑکیں بھی زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھیں۔

یہاں میں آپ لوگوں کو یہ بھی بتا دوں کہ فیصل آباد سے لنڈو پل اسٹاپ کا سفر لگ بھگ ایک سو دس یا ایک سو بارہ کلومیٹر کا ہے اور لنڈو پل رجانہ چوک سے کمالیہ شہر کی طرف جاتے ہوئے درمیان میں آتا ہے مجھے اسی لنڈو پل اسٹاپ پر اترنا تھا پھر یہاں سے اپنے گاؤں تک ایک تانگے میں بیٹھ کر جانا تھا۔

بس اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی اور میری کوشش یہی تھی کہ میں جتنی جلدی ہو اپنے گاؤں پہنچوں پر ایسا نہ ہو سکا اور بس میرے اسٹاپ یعنی لنڈو پل سے پیچھے بیس کلومیٹر اڈا مرید والا پہنچ کر خراب ہو گئی۔

بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر نے بس کو ٹھیک کرنے کی بہت کوشش کی لیکن بس ٹھیک نہ ہو سکی

بس کے انجن میں ایک بڑا مسئلہ ہو گیا تھا جسے ٹھیک کرنا بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے بس میں نہیں تھا اور سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس اڈے پر کوئی ایسا مستری بھی نہیں تھا جو اس بس کو ٹھیک کر لیتا اور بس صحیح ہو کر دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی مجبوراً بس کے ڈرائیور نے تمام مسافروں کو حکم دیا کہ تمام مسافر اس بس سے نیچے اتر جائیں بس کے انجن میں ایک بڑا مسئلہ بن گیا ہے جو اس وقت ٹھیک نہیں ہو سکتا اور اس وجہ سے یہ بس آگے نہیں جا سکتی۔ لہٰذا تمام مسافر اڈا مرید والا پر اسی کمپنی دوسری بس کا انتظار کریں جو صبح سات بجے آئے گی تو تمام مسافروں کو اس بس میں بٹھا کر اُن کو اُن کی منزلوں کی طرف روانہ کر دیا جائے گا۔

ڈرائیور کا حکم نامہ سن کر تمام مسافر اس ڈرائیور کو گالیاں دیتے ہوئے بس سے اتر گئے میں بھی ان مسافروں کے ساتھ بس سے اتر کر چائے والے کیبن کی طرف چلا گیا اور چائے والے کو ایک کپ چائے کا آرڈر دے کر خود وہاں پڑے ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

پریشانی اس وقت مزید بڑھ گئی تھی۔

جتنا جلدی اپنے گاؤں جانے کی کوشش میں تھا اتنی ہی تاخیر ہو رہی تھی۔

میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔

میں نے چائے کا کپ اٹھایا اور چائے کی



چسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ اور میں کس طرح اپنے گاؤں پہنچوں جبکہ دوسری بس صبح سات بجے آئے گی اور تب تک بہت دیر ہو جائے گی۔ مجھے تو جتنا جلدی ہو گاؤں پہنچنا ہے آخر میرے چچا زار اشرف خان کے قتل کا اہم معاملہ تھا میں چائے پینے کے دوران کافی دیر تک اسی بارے میں سوچتا رہا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ میں صبح دوسری بس میں سوار ہو کر اس مین روڈ جانے کے بجائے یہاں اڈا مرید والا سے شارٹ کٹ رستے کے ذریعے گاؤں کی طرف چلا جاتا ہوں ایک تو یہاں سے میرے گاؤں کا سفر بہت کم ہے اور دوسرا میں تین ساڑھے تین گھنٹوں میں اپنے گاؤں پہنچ جاؤں گا۔

اور یہی سوچ کر میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ میں ابھی یہاں سے شارٹ کٹ راستے سے چل کر گاؤں جاتا ہوں اور اس شارٹ کٹ راستے کا مجھے صرف چار پانچ کلومیٹر کا سفر طے کرنا پڑے گا اور میں جلدی اپنے گھر پہنچ جاؤں گا جبکہ مین روڈ سے ایک تو مجھے بیس کلومیٹر سے زیادہ کا سفر بھی طے کرنا ہوگا اور دوسرا بس کے آنے تک بہت دیر بھی ہو جائے گی۔

یہی سوچ کر میں نے چائے کا بل ادا کیا اور اپنا ضروری بیگ ساتھ لے کر اڈا مرید والا کے اس طرف چلا گیا جہاں سے ایک پکی سڑک اور ایک بڑی نہر ساتھ ساتھ میرے گاؤں کی طرف جاتی تھی نہر تو مکمل طور پر میرے گاؤں کی طرف جا رہی تھی جو میرے گاؤں کی زمین اور ساتھ والے گاؤں کی زمینوں کو سیراب کرتی تھی جبکہ پکی سڑک نہر کے ساتھ چلتے ہوئے دو کلومیٹر کے بعد نہر سے الگ ہو کر شمال کی طرف مڑ جاتی تھی جو چک 193 شمالی سے ہوتی ہوئی آگے چک 193 جنوبی سے جا ملتی تھی جہاں تک تو پکی سڑک اس نہر کے ساتھ منسلک تھی وہاں تک تو میں با آسانی کسی تانگے میں بیٹھ کر جا سکتا تھا لیکن آگے پکی سڑک کے مڑ جانے کے بعد کا پورا راستہ کچا اور کچھ خطرناک بھی تھا خطرناک اس لیے تھا کہ اس کچے راستے اور ساتھ والی نہر دونوں پر ہزاروں کی تعداد میں کانٹے دار جھاڑیاں اور کئی قسم کے درخت تھے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ صحیح راستہ کس طرف ہے اور جانا کس طرف ہے۔

بس تھوڑا بہت اندازہ تھا مجھے کہ یہ راستہ میرے گاؤں کی طرف ہی جاتا ہے۔ اور ویسے بھی میرے باپ دادا اور گاؤں کے دوسرے لوگ اسی راستے سے ہو کر اڈا مرید والا میں آتے تھے اور میرا پہلا اتفاق اس راستے سے ہو رہا تھا میں نے اللہ کو یاد کیا اور اس جگہ پر کھڑے ہوئے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو مجھے ایک تانگہ وہاں کھڑا نظر آ گیا میں فوراً اس تانگے کے پاس چلا گیا تانے کا کوچوان جو تانگے سے تھوڑی دور بیٹھا تھا مجھے تانگے کے پاس دیکھتے ہی فوراً میرے پاس آیا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''جی بابو جی کہاں جانا ہے آپ کو؟'' میں نے اسے سلام کرتے ہوئے جب اپنے گاؤں کا نام بتایا تو اس نے مجھے جواب دے کر کہا۔

''بابو جی یہ تانگہ تو آپ کے گاؤں کی طرف نہیں جاتا کیونکہ یہ پکی سڑک تھوڑے سفر کے بعد میرے گاؤں 193 شمالی کی طرف مڑ جائے گی اور میں اب اپنے گاؤں کی طرف ہی جاؤں گا جبکہ آپ کے گاؤں کی طرف جانا ناممکن ہے پکی سڑک کے بعد والا راستہ کچا اور خار دار جھاڑیوں سے بھرا پڑا ہے اور ایسے راستے پر تانگہ نہیں چل

سکتا۔

میں نے تھوڑا افسردہ ہو کر کہا۔

''چاچا جی میں جانتا ہوں کہ پکی سڑک ختم ہونے کے بعد کا راستہ ٹھیک نہیں لیکن تم مجھے وہاں تک تو پہنچا سکتے ہو نا جہاں اس سڑک کا پہلا موڑ چک شمالی کی طرف مڑتا ہے اور جہاں سے آگے کچا راستہ شروع ہو جاتا ہے۔'' میں نے مزید اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''چاچا دراصل مجھے اس وقت بہت بڑی مجبوری ہے میں جلد از جلد اپنے گاؤں پہنچنا چاہتا ہوں اس لیے آپ کی مہربانی ہوگی کہ آپ مجھے وہاں تک تو پہنچا دیں آگے کا سفر میں خود پیدل ہی طے کرلوں گا۔''

میری بات سن کر اس کوچوان نے تھوڑی دیر تک کچھ سوچا اور پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

''ٹھیک ہے بابو جی تمہیں مجبوری ہے تو میں وہاں تک تمہیں پہنچا دیتا ہوں اور ویسے بھی میں بھی اب اپنے گاؤں اپنے گھر جانے ہی والا تھا کوئی اور سواری تو ملی نہیں چلو میں تمہیں وہاں تک ساتھ لے چلتا ہوں۔'' یہ سنتے ہی میں فوراً تانگے کی اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا۔کوچوان نے اپنے گھوڑے کو ہلکی سی تھپکی دے کر کہا۔

''چل میرے شیر......'' اور ساتھ اس نے تانگہ آگے بڑھا دیا جیسے ہی تانگہ آگے بڑھا تو میں نے کوچوان کو مخاطب کرتے ہوئے اس سے اس کا نام پوچھ لیا تو کوچوان نے اپنا نام نور محمد بتایا یعنی کوچوان نور محمد......

تانگہ آگے بڑھتا جا رہا تھا رات اس خوفناک سناٹے میں گھوڑے کی ٹاپوں سے فضا میں ایک عجیب سا ماحول پیدا ہو رہا تھا ویسے تو ہر طرف خاموشی کا عالم تھا میں نے آسمان کی طرف بغور دیکھا تو آسمان پر ستاروں کے دلکش جھرمٹ سے آسمان بہت ہی پیارا محسوس ہونے لگا کوچوان نور محمد نے اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک لمبا کش لے کر سگریٹ کے دھواں کو فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔

''بابو جی کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے آسمان سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

''چاچا نور محمد جی میرا نام اقبال خان ہے۔''

میرا نام جان کر کوچوان نور محمد نے کہا۔

''اچھا تو اقبال بیٹا یہ بھی بتاؤ کہ تم اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو؟''

میں نے نور محمد کی طرف دیکھا اور کہا۔

''چاچا نور محمد جی میں ضلع فیصل آباد سے آ رہا ہوں میں وہاں ایک سرکاری محکمے میں کام کرتا ہوں دراصل میں وہاں سے ایک بس میں بیٹھ کر اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ بس اڈا مرید والا میں پہنچ کر خراب ہوگئی اور مجبوراً مجھے اس راستے سے اپنے گاؤں کی طرف جانا پڑا' میں جتنی جلد ہو اپنے گاؤں پہنچنا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر نور محمد بولا۔

''اچھا اچھا تو یہ مسئلہ بن گیا تھا آپ کے ساتھ بیٹا جو تم اتنی رات گئے اس راستے سے اپنے گاؤں جا رہے ہو۔''

جواباً میں نے بھی کہا۔

''ہاں...... چاچا نور محمد جی بس یہی مجبوری تھی۔ جو اس راستے سے جا رہا ہوں۔'' تبھی ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی اور میں اندھیرے میں کوچوان نور محمد کی طرف دیکھنے لگا کوچوان نور محمد کی عمر تقریباً چالیس سال کے قریب معلوم ہو رہی تھی اور چہرے سے وہ اچھا

خاصا سمجھ دار انسان معلوم ہوتا تھا چاچا نور محمد کے مطابق وہ چک 193 گ ب شمالی کا رہائشی تھا جو اڈا مرید والا سے پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر واقعہ تھا۔

تانگہ اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا جا رہا تھا کوچوان نور محمد نے سگریٹ کا آخری کش ذرا لمبا کر کے لیا اور دھواں میری طرف چھوڑ کر مجھے دوبارہ مخاطب کر کے بولا۔

''اچھا تو اقبال بیٹا کیا پہلے بھی کبھی اس راستے سے اپنے گاؤں گئے ہو یا پہلی بار اس راستے سے جا رہے ہو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''چاچا نور محمد میں پہلی بار اس راستے سے اپنے گاؤں کی طرف جا رہا ہوں۔''

یہ سن کر نور محمد تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا اور پھر بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔

''پھر تو اقبال بیٹا تمہیں اس راستے سے نہیں جانا چاہیے تھا۔''

''کیوں نہیں جانا چاہیے تھا اس راستے چاچا نور محمد جی۔'' میں نے اس کی اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہا تو چاچا نور محمد نے کہا۔

''بیٹا اس لیے نہیں جانا چاہیے تھا کہ یہ راستہ انتہائی خطرناک ہے۔'' نور محمد کی یہ بات سن کر مجھے ایسا لگا کہ وہ اس راستے کو اس لیے خطرناک کہہ رہا ہے کہ ہوسکتا ہے اس راستے پر لوٹ مار ہوتی ہوگی اور اس کا خیال تھا ہوسکتا ہے اس راستے پر جانے سے میرے ساتھ بھی اس قسم کا حادثہ نہ ہو جائے۔

میں نے نور محمد کی طرف دیکھ کر کہا۔

''چاچا نور محمد جی یہ راستہ کیوں خطرناک ہے کیا اس راستے پر لوٹ مار ہوتی ہے۔'' میری بات سن کر نور محمد کوچوان جلدی سے بولا۔

''ارے اقبال بیٹا لوٹ مار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس راستے پر۔''

''تو پھر کیا ہوتا ہے اس راستے پر ایسا کچھ جس کی وجہ سے یہ راستہ خطرناک ہے اکثر راستوں پر صرف لوٹ مار ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہاں ان راستوں پر گزرتے ہوئے لوگ ڈرتے ہیں اور ان راستوں سے لوگ زیادہ تر گزرنے سے گریز کرتے ہیں اس لیے ان راستوں کو خطرناک کہا جاسکتا ہے۔ ورنہ تو اور ایسا کچھ نہیں ہوتا ان راستوں پر کہ جس کی وجہ سے ان راستوں کو خطرناک کہا جائے چاچا نور محمد جی۔'' نور محمد میری لمبی چوڑی یہ بات سن کر جواب میں بولا۔

''اقبال بیٹا یہ ضروری نہیں کہ ہر راستے پر لوٹ مار ہو اور وہ راستہ لوٹ مار کی وجہ سے خطرناک ہو جائے ارے اقبال بیٹا لوٹ مار کے علاوہ بھی اور بہت سے ایسے خطرناک کام ان خطرناک راستوں پر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ایسے راستے زیادہ خطرناک بن جاتے ہیں۔''

نور محمد کوچوان اپنی یہ بات بتا کر خاموش ہوا تو میں پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ آخر چاچا نور محمد اس راستے کو کیوں خطرناک کہہ رہا ہے اس راستے پر ایسا کون سا خطرناک کام یا پھر کوئی اور کسی قسم کا واقعہ ہوا جس کی وجہ سے وہ اس راستے کو خطرناک کہہ رہا ہے۔

میں نے بڑے غور سے کوچوان نور محمد کی طرف دیکھا اور ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''چاچا نور محمد جی ٹھیک ہے میں آپ کی بات مان لیتا ہوں یہ راستہ واقعی ہی خطرناک ہے اور

اس راستے پر لوٹ مار نہیں ہوتی تو پھر اس راستے پر ایسا کون سا کام ہوتا ہے جس کام کی وجہ سے یہ راستہ انتہائی خطرناک ہے اگر آپ کو اس راستے کی ساری حقیقت کا پتہ ہے تو پھر کم از کم آپ یہ تو بتا سکتے ہو نا کہ اس راستے پر کیا کچھ ہوتا ہے میں بھی تو جان لوں آخر میں اس راستے کا اب اکیلا مسافر ہوں اور تھوڑی دیر بعد میں آپ سے الگ ہو جاؤں گا اور باقی راستہ مجھے اکیلے طے کرنا ہے آپ مجھے اس راستے کے بارے میں بتا دیں گے تو میں تھوڑا سنبھل کر باقی سفر طے کروں گا۔"

میں اتنا کچھ کہہ کر خاموش ہوا تو کوچوان نور محمد نے رات کے اندھیرے میں چاروں طرف غور سے دیکھا جیسے اُسے ڈر ہو کہ کہیں کوئی اس کی طرف دیکھ تو نہیں رہا یا پھر کوئی اس کی بات نہ سن لے یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ڈاکو یا چور اس پر دھاوا نہ بول دے۔

چاروں طرف اندھیرے میں دیکھ کر کوچوان نور محمد نے جب اطمینان کر لیا کہ ایسا کوئی معاملہ نہیں تو بڑی ہی ڈری ہوئی آواز میں بولا۔

"اقبال بیٹا اگر تم اسرار کرتے ہو کہ میں تمہیں اس راستے کے سارے راز بتا دوں کہ راستے پر کیا کچھ ہوتا ہے مسافروں کے ساتھ تو سن لو بیٹا اس راستے پر لوٹ مار تو نہیں ہوتی البتہ اس راستے پر کچھ پُراسرار قسم کے بہت سارے واقعات ہوئے ہیں اس راستے پر کوئی ایسی وحشت ناک مخلوق ضرور موجود ہے جو خود تو پُراسرار ہے لیکن اس راستے پر سفر کرنے والے انسانوں کا پُراسرار طریقے سے قتل کر دیتی ہے قتل ہونے والے انسان کی لاش تو مل جاتی ہے لیکن وہ پُراسرار قاتل نہیں ملتا آخر وہ ایسی کونسی وحشت ناک مخلوق ہے جو انسانوں کا بے دردی سے قتل بھی کرتی ہے اور خود نظر بھی نہیں آتی۔" نور محمد کوچوان اپنی بات مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اقبال بیٹا آج سے ایک روز قبل اس راستے پر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس واقعے کی وجہ سے ہمارے گاؤں کے لوگ ڈرے سہمے ہوئے ہیں ہمارے گاؤں کے دو نوجوان بھائی اس نہر کے پاس اپنی زمینوں میں رات کے وقت پانی لگا رہے تھے ان کے پاس ایک لالٹین تھی جس کی مدد سے وہ راستہ اور پانی دیکھ رہے تھے تبھی ان کے ایک کھیت سے پانی ٹوٹ گیا انہوں نے لالٹین کو اپنے پاس زمین پر رکھا اور ٹوٹنے والا کھیت سے پانی بند کرنے لگے اچانک دونوں بھائیوں نے دیکھا کہ کوئی تیسرا آدمی اُن کی لالٹین اُٹھا کر نہر کی طرف جا رہا ہے دونوں بھائی پریشان ہو کر لالٹین اٹھانے والے شخص کی طرف آوازیں دیتے ہوئے بھاگے لالٹین اٹھانے والا شخص نہر کے کنارے جا کر رک گیا اور جیسے ہی انہوں نے اس شخص سے لاٹین واپس لینے کی کوشش کی تو اس شخص نے دونوں بھائیوں کو زور زور سے تھپڑ مارنے شروع کر دیے۔

جب دونوں بھائیوں نے غور سے لالٹین اٹھانے والے شخص کی طرف دیکھا کہ کون ہے جو ہماری لالٹین پکڑ کے ہمیں تھپڑ مار رہا ہے تو اس وقت وحشت اور خوف سے دونوں بھائیوں کی چیخیں نکل گئیں یہ دیکھ کر کہ لالٹین اٹھانے والے شخص کے صرف دو بازو ہیں اور باقی اس کا وجود نہیں ہے اور صرف وہی دونوں ہاتھوں سے اُن کو تھپڑ پڑ رہے ہیں وہ ہاتھ اتنے خوفناک تھے کہ ان ہاتھوں کے ناخن تین چار انچ تک بڑھے ہوئے تھے جب ایک تھپڑ بھی ان دونوں بھائیوں کے چہرے پر پڑتا تو وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر جاتے

ب صورت حال مزید بگڑ گئی تو دونوں بھائی اپنے ؤں کی طرف چیختے چلاتے دوڑ پڑے۔ دونوں ائیوں کی چیخوں کی آواز اُن کے گاؤں میں ور ہے لوگوں نے بھی سن لی تھیں تبھی سبھی گاؤں لے لاٹھیاں ڈنڈے اور بندوقیں لے کر ان کی رف دوڑ پڑے قریب پہنچ کر جب گاؤں والوں نے دونوں بھائیوں سے ان کے چیخنے چلانے کی یہ پوچھی۔ تو دونوں بھائیوں نے اپنے ساتھ ونے والے اس سارے واقعے کو بتا دیا۔''

گاؤں کے لوگ دونوں بھائیوں کو ساتھ لے کر اس جگہ بھی گئے جہاں وہ پانی لگا رہے تھے اور س دوران ان کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا لیکن کھ کوشش کے باوجود گاؤں کے لوگوں کو وہ شخص ہیں ملا جو اُن کی لالٹین اٹھا کر ان کو تھپڑ مار رہا تھا یتہ لالٹین نہر کے کنارے سے انہیں ضرور مل گئی ھی لیکن وہ پُراسرار شخص غائب تھا۔ اس جگہ سے گاؤں کے سبھی لوگ مایوس ہو کر واپس گاؤں لوٹ گئے۔ جب صبح ہوئی تو ان دونوں بھائیوں کی شیں اپنے بستروں پر ملیں دونوں بھائیوں کی شیں دیکھ کر پورے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ لیس کو اس واقعہ کی خبر دی گئی اور دونوں بھائیوں ی لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے پولیس نے کسی ڑے اسپتال میں بھجوا دیا اور بعد میں نامعلوم شخص کے خلاف مقدمہ بھی درج کر لیا گیا لیکن اب ایک اہ گزر چکا ہے پولیس نہ تو اس قاتل کو پکڑ سکی اور نہ یہ جان سکی کہ آخر وہ ایسا کون سا پُراسرار قاتل تھا جو نہایت درندگی سے ان دونوں بھائیوں کی زندگی کے چراغ ہمیشہ کے لیے بجھا گیا۔ جبکہ ان دونوں بھائیوں کی کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔'' کوچوان نور محمد پورا واقعہ بتا کر تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اقبال بیٹا بات صرف یہاں ہی ختم نہیں ہوئی اور اس خوفناک واقعہ کے بعد ایک اور نوجوان کی لاش اس نہر کے کنارے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں ملی جسے بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کیا گیا تھا اس نوجوان کے چہرے پر کئی خطرناک خراشوں کے نشان موجود تھے اور اس کی آنکھیں بھی خوف سے باہر کی جانب نکلی ہوئی تھیں وہ نوجوان کسی دوسرے علاقے کا تھا جو بدقسمتی سے اس راستے پر آ گیا اور ہمیں پورا یقین ہے کہ اس نوجوان کو بھی اسی ظالم پُراسرار قاتل نے ہی قتل کیا تھا اس نوجوان کا مقدمہ بھی ہمارے علاقے کے تھانے میں درج کیا گیا پولیس نے اس نوجوان کے قتل کے بارے میں بہت چھان بین کی لیکن اس نوجوان کا قاتل بھی نہ مل سکا۔ بلکہ پولیس بھی حیران ہے کہ ایسا سفاک قاتل کون ہے جو پُراسرار طریقے سے انسانوں کا قتل کرتا ہے اور وہ بھی ایک ہی طریقہ استعمال کرتا ہے قتل کرنے میں لیکن ابھی تک اس قاتل کا کوئی سراغ نہیں مل سکا ان دو واقعات سے اب اس علاقے کے لوگوں کو یقین ہو گیا اس بات پر کہ قاتل کوئی انسان نہیں بلکہ کوئی اور ہی مخلوق ہے، جو نظر تبھی آتی ہے جب وہ کسی انسان کا قتل کرتی ہے۔''

''ان واقعات کے بعد ہمارے علاقے کے لوگ دن کے وقت بھی اس راستے سے نہیں گزرتے اور اب یہاں ہر طرف خوف کا ماحول ہے۔ لیکن تم بھی عجیب ہو اقبال بیٹا جو رات کی تنہائی میں اس خطرناک راستے پر سفر کرو گے۔'' یہ کہتے ہوئے کوچوان نور محمد نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''اقبال بیٹا میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ

بھی کوئی ایسا واقعہ ہوا اور ویسے بھی تم اکیلے ہو اگر تمہارے ساتھ ایسا کچھ ہو گیا تو کون تمہیں پہچانے گا تمہارے گھر والوں کو بھی پتہ نہیں ہوگا کہ تم کہاں ہو اور تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔"

"اس لیے میں تمہیں ایک مشورہ دیتا ہوں اقبال بیٹا کہ تم آج کی رات میرے گھر گزارو اور کل جیسے ہی صبح ہوگی میں تمہیں اپنے تانگے میں کسی دوسرے راستے کے ذریعے تمہارے گاؤں تک پہنچا دوں گا۔"

کوچوان نور محمد اپنی بات مکمل بتا کر خاموش ہوا تو میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ اب میں اس کی باتوں پر کتنا یقین کروں یا پھر اس کی ان ساری باتوں کو جھوٹ سمجھوں بھلا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی کو تھپڑ بھی مارے پھر اُن کی لالٹین بھی اٹھا لے اور وہ اپنا جسم بھی اُن کو نہ دکھائے صرف بازو یا ہاتھ دکھائے پھر تین انسانوں کا قتل بھی کر دے اور خود کہیں غائب ہو جائے مجھے تو کچھ عجیب سی باتیں محسوس ہوئی تھیں کوچوان نور محمد کی اس لیے میں نے کہا۔

"چاچا نور محمد مجھے ایک بات تو بتاؤ تم بھی انسان ہو اور اس راستے سے اکثر رات کو آتے جاتے ہو بلکہ ابھی بھی تو میرے ساتھ سفر میں ہو تو کیا اُس پُراسرار قاتل نے تمہیں کبھی کچھ نہیں کہا کیا تمہارا سامنا کبھی نہیں ہوا اس ظالم درندے سے۔" میری اس بات کا جواب کوچوان نور محمد نے کچھ اس انداز میں دیا اس نے فوراً ایک ہاتھ اپنے گلے میں ڈالا اور گلے سے ایک تعویذ نکال کر میری طرف کر کے بڑے فخر سے بولا۔

"اوئے اقبال بیٹا میں ایسے ہی نہیں راتوں کو ایسے خطرناک راستوں پر چلتا پھرتا یہ تعویذ دیکھو یہ تعویذ میری حفاظت کرتا ہے یہ اس پُراسرار قاتل سے بھی زیادہ خطرناک ہے جب تک یہ میرے گلے میں ہے تب تک وہ ظالم سفاک قاتل میرے قریب نہیں آ سکتا تعویذ کو دوبارہ گلے میں ڈال کر اس نے اپنی قمیض کے اندر نیچے والے حصے میں ہاتھ ڈالا اور ایک چمک دار نوکیلا خنجر نکال کر اس نے جیسے ہی میرے سامنے کیا میں ڈر کر فوراً پیچھے ہٹ گیا ایک بار تو مجھے یوں لگا کہ کہیں کوچوان نور محمد ہی تو وہ پُراسرار قاتل نہیں جس نے پہلے بھی تین انسانوں کا پُراسرار طریقے سے قتل کیا اور آپ خنجر نکال کر مجھ پر حملہ کرنے لگا ہے جیسے ہی ڈر کر میں پیچھے ہٹا تو نور محمد نے ہنس کر کہا۔

"دیکھا اس خنجر کا کمال تم اسے دیکھتے ہی ڈر گئے اس تعویذ اور خنجر کے ہوتے ہوئے کوئی بھی آفت مصیبت میرے قریب نہیں آ سکتی یہ خجر بہت تیز ہے یہ بھی میری حفاظت کا دوسرا سامان ہے جو میں ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہوں۔"

خنجر اور تعویذ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ نور محمد انہی دو چیزوں کی وجہ سے بلا دھڑک دن ہو یا رات اس راستے پر سفر کرتا رہتا ہے ایک طرح سے تو یہ دونوں چیزیں اس کی حفاظت کرنے والے باڈی گارڈ ہیں جنہیں وہ ہر دم اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

اس لیے میں نے کوچوان نور محمد کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اچھا تو چاچا نور محمد جی آپ نے اپنی حفاظت کا مکمل بندوبست کیا ہوا ہے۔ جو رات کے اتنے خطرناک اندھیرے سے بھی نہیں ڈرتے ہو۔" میں یہ کہہ کر خاموش ہوا تو نور محمد نے کہا۔

"جی کیوں نہیں پورا بندوبست کر رکھا ہے میں نے اپنی حفاظت کا نہ جانے کب اس قاتل سے میرا سامنا ہو جائے پھر اپنی حفاظت تو کرنی ہی پڑتی ہے ناں۔" تو میں نے جواب دے کر

ہا۔

"ہاں کیوں نہیں چاچا اپنی زندگی سے پیاری کوئی چیز نہیں ہوتی۔"

تب چاچا نور محمد نے دوبارہ مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"تو پھر اقبال بیٹا تم نے کیا سوچا۔ آج کی ت تم میرے گھر میں رہو تم اکیلے مت جاؤ اس ستے پر جس پر جان جانے کا ڈر ہو میں تمہیں اچھا شورہ دے رہا ہوں۔"

ایک طرح سے چاچا نور محمد ٹھیک ہی کہہ رہا ھا۔ ایسے راستے پر رات کی تنہائی میں مجھے سفر نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اصل مسئلہ تو اشرف خان کے تل کا تھا اور مجھے ہر حال میں وہاں پہنچنا تھا اس لیے میں نے کوچوان نور محمد سے کہا۔

"چاچا نور محمد جی اس تکلف کا ہزاروں بار شکریہ میں اللہ کی مدد سے اسی راستے سے چل کر پنے گاؤں جاؤں گا۔" میں نے جب کوچوان نور محمد کے گھر رات گزارنے سے انکار کر دیا تو اس نے ایک سرد آہ بھری اور یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"اچھا بیٹا تمہاری مرضی ہے جیسا تم مناسب سمجھو میں خواہ مخواہ کیوں تمہیں مجبور کروں کہ تم میرے گھر میں رات گزارو۔" تبھی اچانک کوچوان نور محمد نے ایک جھٹکے کے ساتھ تانگہ روک دیا میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا ہوا چاچا نور محمد جی آپ نے تانگہ کیوں روک دیا۔" تو کوچوان نور محمد نے مریل سی آواز میں کہا۔

"اقبال بیٹا فی الوقت تو خیر ہے اور میں نے تانگہ اس لیے روکا ہے آپ کا اسٹاپ جو آ گیا ہے۔" میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور چھلانگ لگا کر تانگے سے اتر گیا۔ میں نے اپنی جیب سے دس دس کے تین نوٹ نکال کر کوچوان نور محمد کو دے کر کہا۔

"چاچا نور محمد جی اب تم دعا کرنا میں خیریت سے اپنے گھر پہنچ جاؤں۔" نور محمد نے تانگہ آگے بڑھانے سے پہلے ایک بار پھر تاکید کی کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلا جاؤں اب بھی وقت ہے لیکن میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"چاچا جی میں اتنا بھی ڈرپوک نہیں ہوں کہ ایسے خطرناک راستوں سے ڈر جاؤں آپ کا شکریہ۔"

یہ سن کر نور محمد نے تانگہ اپنے گاؤں کی طرف بڑھا دیا میں نے چند سیکنڈ تک تو اس راستے کا بغور جائزہ لیا اندھیرا بہت تھا غور سے دیکھنے پر تھوڑا بہت راستہ نظر آتا تھا راستے کے دونوں اطراف کانٹے دار جھاڑیاں اور سرکنڈے بہت تعداد میں پھیلے ہوئے تھے میں نے اللہ کو یاد کیا اور اپنے قدم اس راستے پر آگے بڑھا دیے میں بڑی احتیاط سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا کانٹے دار جھاڑیوں کے جھنڈ اندھیرے میں کسی بڑی آفت کی طرح دکھائی دے رہے تھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے پلک جھپکتے ہی یہ جھنڈ مجھ پر حملہ کر دیں گے۔

سیانے لوگ کہتے ہیں کہ جب کسی بھی انسان پر مصیبت آتی ہے تو وہ انسان بھی خود بخود اس مصیبت کی طرف دوڑتا چلا جاتا ہے شاید میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہونے والا تھا جب میں نے دس پندرہ منٹ کی مسافت طے کر لی تو ایک جگہ چلنے کے دوران میں کانٹے دار جھاڑیوں کے جھنڈ میں لڑکھڑا کر گر گیا کانٹے دار جھاڑیوں کے نوکیلے کانٹے میرے وجود میں کئی جگہ گھس گئے کانٹے

اس قدر خطرناک اور زہریلے تھے کہ ان کے جسم میں لگنے سے میرا پورا وجود جلن اور شدید درد سے کانپ گیا کچھ کانٹے تو میرے چہرے کو بھی بری طرح زخمی کر گئے' درد اور شدید تکلیف کے ساتھ بڑی مشکل سے میں نے خود کو سنبھالا ار اس خطرناک جھاڑیوں کے جھنڈ سے اٹھنے کی کوشش کی میں بری طرح سے اس جھنڈ میں پھنس گیا تھا۔

بڑی ہی مشکل کے بعد میں نے خود کو اس جھنڈ سے نکالا اور اپنا گرا ہوا بیگ تلاش کرنے کی کوشش کی جو میرے ساتھ ہی یہیں کہیں جھاڑیوں میں گر گیا تھا میں اندھیرے میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر بیگ ڈھونڈنے لگا جھاڑیوں کے جھنڈ کے پاس ہی مجھے سیاہ رنگ کی ایک چیز نظر آئی اسے دیکھ کر مجھے لگا یہی میرا بیگ ہے اور جیسے ہی میں اسے بیگ سمجھ کر اٹھانے کی کوشش کی سیاہ رنگ کی اس چیز نے اچانک پھنکار مارتے ہوئے مجھ پر حملہ کر دیا حملہ اس قدر خطرناک تھا کہ میں چیخ مار کر پیچھے کی جانب گر گیا۔

ساری صورت حال میرے سامنے تھی جس چیز نے مجھ پر حملہ کیا تھا وہ ایک انتہائی خطرناک سیاہ رنگ کا سانپ تھا میں نے اس سانپ سے بچنے کی بہت کوشش کی پر سانپ مجھ پر حاوی ہوتا گیا اور مجھ پر پھنکارتے ہوئے بار بار حملہ کرنے لگا۔ اب مجھے اپنا بیگ تو بھول گیا اور اپنی جان کی فکر لاحق ہوگئی میری کوشش تھی کہ کسی طرح اس وحشت ناک سانپ سے میری جان چھوٹ جائے وحشت اور خوف سے میرا برا حال تھا۔ سانپ نے ایک بار اتنی شدت سے مجھ پر حملہ کیا اور اچھل کر میرا پورا بازو اپنی گرفت میں جکڑ لیا میرے بازو پر سانپ کی گرفت اور جکڑ اتنی سخت تھی کہ میں شدت درد سے بلبلا اٹھا اسی لمحے اگر یہ سانپ اپنی گرفت تھوڑی اور سخت کر دیتا تو ممکن تھا کہ میرا بازو بھی ٹوٹ جاتا خدا کی پناہ اس بھیانک سانپ کی پھنکاریں اتنی وحشت ناک تھیں کہ اس کی ایک ہی پھنکار سے میرا پورا وجود خوف سے کانپ جاتا اور پھنکار کی آواز کسی بڑی بھینس کے بولنے کی آواز کے برابر تھی جیسے کوئی بڑی بھینس بڑبڑا رہی ہو۔

جب میں نے دیکھا سانپ میری جان چھوڑنے والا نہیں تو میں نے اپنی پوری قوت سے سانپ کو ایک ہاتھ سے پکڑا اور کھینچ کر دور پھینک دیا اور اندازے سے ایک طرف دوڑ لگا دی اپنے ضروری بیگ کو ڈھونڈنا میں نے ضروری نہ سمجھا اور مسلسل اپنی جان بچانے کے لیے دوڑتا رہا فکر تھی تو اپنی جان کی دوڑنے کے دوران میں کئی بار جھاڑیوں کے جھنڈ سے ٹکرا کر منہ کے بل گرتا رہا مجھے گرنے کے دوران اور بہت ساری چوٹیں جسم پر لگیں میں دوڑتا رہا اور کافی دور نکل جانے کے بعد میں نے اپنی رفتار تھوڑی کم کر دی اور آہستہ آہستہ چلنے لگا مسلسل بھاگنے سے میری سانسیں پھولی ہوئی تھیں جب سانسیں اپنی مخصوص رفتار سے دوبارہ بحال ہوئیں تو میں نے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا مجھے فکر تھی کہ سانپ میرے پیچھے نہ ہو میں نے خدا کا شکر ادا کیا سانپ میرے پیچھے نہیں تھا میں نے آسمان کی طرف دیکھا اس وقت چاند آسمان پر نمودار ہو رہا تھا چاند کو دیکھ کر دل میں ایک امید سی پیدا ہوئی کہ میں چاند کی روشنی میں اپنا راستہ تو ٹھیک طرح سے دیکھ پاؤں گا۔"

میں اب مطمئن ہو کر اپنی منزل کی طرف آگے بڑھتا گیا میرا اندازہ تھا کہ میں اپنا آدھا سفر طے کر چکا ہوں چاند کی مدھم روشنی میں میں نے اپنے آس پاس دور دور تک نظر دوڑائی لیکن سوائے درختوں اور دور سے بھونکنے والے کتوں

ں آوازوں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا ویسے تو میرے آس پاس بھی رات کے وقت نکلنے والے حشرات کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔

ایک جگہ چلنے کے دوران راستے میں صاف میدان آ گیا صاف راستہ دیکھ کر میں نے سکھ کا سانس لیا اب صرف میں تھا میرا راستہ اور میرے راستے کے ساتھ منسلک نہر جو پانی سے شرابور ہو کر بہہ رہی تھی۔ میں بڑے اطمینان اور پُرسکون ذہن کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھاتا جا رہا تھا تو اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی دوسرا شخص میرے پیچھے میرے ساتھ چل رہا ہے یہ اندازہ میں نے اپنے پیچھے آنے والے قدموں کی آواز سے لگایا تھا۔

میں چند لمحوں کے لیے رک گیا اور میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن مجھے کوئی چیز دکھائی نہیں دی میں نے قدموں کی اس آواز کو اپنا وہم سمجھا اور دوبارہ اپنی منزل کی طرف چل پڑا ابھی میں نے چند قدم ہی طے کیے تو ایک بار پھر میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنی اس بار قدموں کی آواز پہلے کی نسبت کافی تیز سنائی دی تھی قدموں کی تیز آواز سے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بھاری بھرکم وجود اور بھاری پاؤں والا شخص میرے پیچھے آ رہا ہے۔

دوبارہ آواز سن کر میں جیسے ہی رکا میرے پیچھے بھاری بھرکم قدموں کی آواز بھی رک گئی میں نے تھوڑا غور کیا کہ اس بار میرا وہم نہیں بلکہ ضرور کوئی میرے پیچھے چل رہا ہے جس کے قدموں کی آواز بھی خاموش ہو گئی۔ آخر کون ہے میرے پیچھے میں نے اس بار بڑے غور سے پیچھے مڑ کر دیکھا چاند کی روشنی میں دور دور تک بہت کچھ نظر آ رہا تھا لیکن وہ شخص مجھے نظر نہیں آ رہا تھا جو میرے پیچھے آ رہا تھا اور اس کے قدموں کی آواز میں نے بڑے غور سے سنی تھی میں پورا ایک منٹ تک بار بار اِدھر اُدھر تکتا رہا مگر مجھے اپنے آس پاس کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔

پھر اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا کہ ہو سکتا ہے کوئی جنگلی جانور ہو گا جو میرے پیچھے چل رہا تھا جب میں اسے دیکھنے کے لیے رُکا تو وہ مجھے دیکھ کر کہیں جھاڑیوں میں چھپ گیا ہو گا۔

یہی سوچ کر میں دوبارہ آگے چل پڑا اور چلتے چلتے کافی دور تک نکل گیا اس دوران کوئی ایسی ویسی غیر معمولی حرکت میں نے محسوس نہیں کی لیکن اس وقت تو میرے قدم خود بخود چلتے ہوئے رک گئے جب میں نے اپنے آگے کسی دوسرے شخص کے قدموں کی آواز واضح طور پر سنی اس بار قدموں کی آواز میرے آگے سنائی دی تھی اور کافی بھاری بھرکم آواز تھی جیسے کوئی بھاری جسامت والا انسان میرے آگے چل رہا تھا میں ڈر کے مارے تیز تیز چلنے لگا تو ان قدموں کی آواز بھی تیز ہو گئی میں حیران تو اس بات پر تھا کہ اگر کسی کے زمین پر چلنے اس کے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے تو وہ چلنے والا کیوں نظر نہیں آ رہا آخر اس کے قدموں کی آواز ہے تو اس کا جسم کہاں ہے، وہ انسان ہے یا کوئی اور بلا یا آفت......

بلا اور آفت کا نام میرے ذہن میں آیا تو میرے جسم میں شدید خوف اتر گیا اور مجھے کوچوان نور محمد کی وہ باتیں یاد آ گئیں جو اس نے تانگے میں دوران سفر مجھے بتائی تھیں ایک پُراسرار قاتل کے بارے میں اس وقت تو میں اس کی باتوں کو غلط سمجھ بیٹھا تھا لیکن اب اپنے آگے اور پیچھے پُراسرار قدموں کی آواز سن کر تو مجھے اب یقین

ہو رہا تھا کہ اس کی باتیں حقیقت تھیں اس وقت مجھے اپنے آپ پر ندامت سی ہوں گی کہ کاش میں اس وقت اس کی بات مان لیتا اور اس کے ساتھ اس کے گھر چلا جاتا۔

اب کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے پُراسرار قدموں کی آواز سے تو لگ رہا تھا کہ میرے ساتھ کسی بھی لمحے کچھ نہ کچھ ضرور ہونا والا ہے میں نے دل میں اپنے رب اللہ کی مدد کے لیے پکارا اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

''کون ہے جو میرے آگے...... پیچھے میرے ساتھ چل رہا ہے تم جو بھی ہو سامنے آؤ۔'' لیکن آگے سے کوئی جواب نہ آیا تو میں نے دوبارہ یہی لفظ بلند آواز سے دہرائے تو مجھے اس بار آگے سے جواب مل گیا۔ جو کچھ اس انداز میں تھا۔

''اقبال خان کیوں پریشان ہوا بھی سے اتنی جلدی بھی کیا ہے آ جاتا ہوں' ذرا غور سے اپنے پیچھے تو دیکھو۔'' اتنا کچھ کہنے کے بعد وہ آواز خاموش ہو گئی۔

اس پُراسرار آواز میں' میں اپنا نام جان کر پریشان ہو گیا اور میں یہ بھی جان چکا تھا کہ ہو نہ ہو یہ وہی پُراسرار قاتل ہے۔ جسے میرا نام بھی معلوم ہے میں نے ڈرتے ڈرتے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرے ہوش اڑ گئے آٹھ دس فٹ کا بھاری بھرکم وجود والا انسان میرے سامنے صرف چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے کے سر کے بال بکھرے ہوئے پاؤں تک لٹکتے دکھائی دے رہے تھے آنکھیں بڑی بڑی اور وحشت ناک خوف ناک آواز سے دیکھ کر میری زبان بھی لڑکھڑا گئی میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کون ہو تم اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں یہ کہہ کر خاموش ہوا تو اس نے بھیانک سی مسکراہٹ اپنے خوفناک ہونٹوں پر لا کر کہا۔

''میں کون ہوں کیا تم نہیں جانتے ہو اقبال خان کیا میرے بارے میں تمہیں کوچوان نور محمد نے نہیں بتایا۔''

ڈر اور خوف سے کانپتے ہوئے میں نے کہا۔

''کوچوان نور محمد نے مجھے تمہارے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا ہاں البتہ اس نے مجھے ایک پُراسرار قاتل کی کچھ باتیں ضرور بتائی تھیں۔''

''اچھا تو تم جانتے ہو کہ جس پُراسرار قاتل کے بارے میں کوچوان نور محمد نے تمہیں جو کچھ بھی بتایا وہ پُراسرار قاتل کون ہے۔'' یہ کہتے ہی وہ شخص جیسے خاموش ہوا تو میں نے جلدی سے کہا۔

''نہیں میں نہیں جانتا کہ وہ پُراسرار قاتل کون ہے' اگر تم جانتے ہو تو تم بتا دو۔'' بڑی ہی وحشت ناک مسکراہٹ کے ساتھ اُس نے اپنے خوفناک ہاتھ کی انگلی اُٹھا کر اپنی طرف کی اور بڑے فخر سے بولا۔

''وہ قاتل میں ہوں جو بھی انسان میرے سامنے آتا ہے میں اسے بڑی بے دردی سے قتل کر دیتا ہوں۔'' وہ خاموش ہو گیا یہ بتا کر کہ قاتل میں ہوں اور مجھے نور محمد کی ایک ایک بات یاد آ گئی اس نے سچ کہا تھا کہ اس راستے پر جو تین نوجوان قتل ہوئے تھے اُن کا قاتل بھی یہ درندہ صفت انسان تھا اب میں یقین کر چکا تھا کہ میں ایک قاتل کے سامنے کھڑا ہوں زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے چند گھڑیوں کے بعد اور صبح جیسے ہی ہو گی کوچوان نور محمد میرے قتل کی خبر بھی سن لے گا۔

اب اس قاتل سے جان چھڑانے بے حد مشکل تھا مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ اگر میں نے بھاگنے

ی کوشش کی تو بھی یہ مجھے بھاگنے نہیں دے گا لہٰذا
یں نے سوچا اب راہ فرار کے تمام راستے بند
و چکے ہیں جو ہونا ہے وہ تو ضرور ہو گا کیوں نہ میں
س کا ڈٹ کر مقابلہ کروں۔ یہی سوچ کر میں تھوڑا
س شخص کے قریب چلا گیا اور میں نے اُس کی
طرف دیکھ کر کہا۔

''اچھا تو وہ قاتل تم ہو جس نے پہلے بھی تین
نسانوں کا قتل کیا ہے۔''

''ہاں میں ہی ہوں ان لوگوں کا قاتل۔''
س نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔ تو میں نے پھر
سوال کیا۔

''کیوں قتل کیا تھا ان لوگوں کا' کیا دشمنی تھی
ان کی تمہارے ساتھ جو تم نے ان کو قتل کیا۔''
میرے اس سوال پر وہ غصے میں آ گیا اور کہنے لگا۔

''بہت بڑی دشمنی تھی اُن کے ساتھ اور بلکہ
تمام انسانوں سے دشمنی ہے جب تک انسان اس
راستے پر میرے سامنے آتے رہیں گے میں ان کا
قتل کرتا رہوں گا۔''

''اقبال خان انسانوں سے میری بہت گہری
دشمنی ہے اور جب تک میں اس دھرتی پر زندہ
ہوں ہر اس انسان کا قتل کروں گا جو اس راستے پر
مجھے ملے گا۔''

''ویسے اقبال خان میں آپ کو بتادوں کہ
میں انسان نہیں ہوں بلکہ انسان کے روپ میں
ایک جن ہوں میں یہاں سے تھوڑی دور ایک پرانا
کنواں ہے جس میں رہتا ہوں دن بھر میں اس
کنویں میں پڑا رہتا ہوں اور جب شام ہوتی ہے
تو اس راستے پر سیر وغیرہ کے لیے نکلتا ہوں پھر جو
انسان اس راستے پر مل جائے میں اس کو بے
دردی سے مار دیتا ہوں آج کی رات بھی میرے
لیے بڑی خوش قسمتی کی رات ہے جو میں آج کی
رات بھی ایک انسان کا قتل کرنے والا ہوں۔'' یہ
کہہ کر وہ چپ ہوا تو میں نے پیچھے ہٹ کر کہا۔

''آج کی رات تم کس کا قتل کرنے والے
ہو۔''

وہ میری طرف بڑھا اور اپنے خوف ناک
ہاتھ میری طرف بڑھا کر بولا۔

''تمہارا قتل کرنے والا ہوں۔''

میں تیز قدموں سے پیچھے کی جانب بڑھا اور
اس سے کہا۔

''مجھے کیوں قتل کرنے والے ہو میں نے کیا
جرم کیا ہے؟''

وہ وحشت زدہ لہجے میں مسکرا کر بولا۔

''تمہارا جرم یہ ہے کہ تم اتنی رات گئے اس
راستے پر کیوں آئے ہو۔'' اتنا کچھ کہہ کر اس نے
اچانک مجھ پر حملہ کر دیا اس کے حملے سے بچنے کی
میں نے کوشش تو بہت کی لیکن ناکام رہا اس درندہ
نما انسان کی آنکھیں آگ کے شعلوں کی طرح
دھک رہی تھیں اور سانسیں کسی تیز آندھی کی طرح
سب سے پہلے اس نے میرے چہرے پر حملہ کیا
ہاتھ سے جس کی وجہ سے میرے چہرے سے خون
بہنے لگا۔ اس کے ناخن کسی تیز دھار آلے کی طرح
خطرناک تھے میں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے
چہرے پر رکھ لیے تو اس نے دوسرا حملہ میری
گردن پر کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میری
گردن دبوچ لی اور آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

اب مجھے یوں لگ رہا تھا کہ زندگی چند پل کی
مہمان ہے میری سانس رک سی گئی تھی اس نے
گردن سے پکڑ کر مجھے اوپر اٹھا لیا۔ میری آنکھوں
میں اندھیرا چھا گیا ایسا لگ رہا تھا کہ اس پل
موت آئی تو اس پل موت آئی۔ اس وحشی
درندے نے اپنی پوری قوت سے مجھے زمین پر پٹخ

دیا اور میری گردن میں اپنے نوکیلے ناخن پیوست کر دیے شاید زندگی کے وہ آخری پل تھے جب میں نے اپنے دل میں اپنے رب کو پکارا اور درود پاک کا ورد جاری کر دیا درود پاک کے بعد میں نے آیت الکرسی کا ورد کیا اور مسلسل اس کا ورد کرتا رہا چند لمحوں کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری گردن سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے میں نے آیت الکرسی کا ورد جاری رکھا اور پھر اچانک ہی اس نے میری گردن چھوڑ دی اور وحشت زدہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی جان چکا تھا کہ وہ مجھے وحشت زدہ ہو کر اس لیے دیکھ رہا ہے کہ میں اس کے ہاتھوں سے کیسے بچ گیا ہوں کون سی ایسی طاقت ہے جس نے اسے مجھے قتل کرنے سے روک دیا۔

میں چند منٹ زمین پر پڑا رہا اور جب کچھ ہوش سنبھلا تو میں بڑی ہی مشکل سے اٹھا اور دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا ہوا اب کیوں مجھے چھوڑ دیا تم نے، تم تو مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔" تب اس نے بڑی ہی لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں تو خود حیران ہوں کہ تم میری طاقت و گرفت سے بچ کیسے گئے میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ جب میں تمہاری گردن دبا رہا تھا تو وہ دوسرے کس کے ہاتھ تھے جو بڑی طاقت سے میرے ہاتھوں کو پکڑ کر تمہاری گردن سے جدا کر رہے تھے۔ اور آخر کار انہوں نے تمہیں میرے ہاتھوں کی گرفت سے چھڑا لیا۔" میں جلدی سے بولا۔

"وہ رب کی طرف سے ایک خاص مدد تھی جس نے مجھے تم جیسے ظالم جن کے ہاتھوں مرنے سے بچا لیا زندگی جیت گئی اور موت ہار گئی بس اب تم مجھے وہ وجہ بتاؤ کہ جس کی وجہ سے تم انسانوں کا قتل کرتے ہو اور یہ بھی بتاؤ کہ تم کون ہو تمہاری اصل حقیقت کیا ہے۔"

میرے اس سوال پر اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"تم سچ کہتے ہو آج زندگی جیت گئی اور موت ہار گئی تم میرے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئے میں تمہیں یہ بھی بتا دوں گا کہ تم کو یاد ہو گا تم پر پہلے ایک خوفناک سانپ نے بھی حملہ کیا تھا وہ بھی میں ہی تھا اس وقت بھی تم میرے ہاتھوں سے بچ گئے اور اب بھی اقبال خان میں انسانوں کا قتل کیوں کرتا ہوں اس کی بھی ایک بہت بڑی وجہ ہے لیکن میں تمہیں نہیں بتا سکتا اس لیے کہ انسانوں پر اعتبار کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور تم بھی انسان ہو میں تم پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا۔"

میں نے اس کی تمام باتیں غور سے سنیں اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تم جو بھی ہو اللہ کی مخلوق ہو اور میں بھی اسی ذات کی مخلوق ہوں تم مجھ پر اعتبار کرو اور ساری حقیقت بتاؤ مجھے جو بتانا نہیں چاہتے۔" میں خاموش ہوا تو اس نے کہا۔

"اگر تم کہتے ہو تو میں تم پر اعتبار کر کے سب کچھ تمہیں بتا دیتا ہوں لیکن تمہیں میرے ساتھ اس کنواں تک آنا ہو گا جس کنویں میں میں رہتا ہوں میں تمہیں وہاں بیٹھ کر اپنی ساری داستان سناؤں گا۔"

کنویں کا نام سن کر ایک بار پھر میرے ہوش اڑ گئے اور میں سوچنے لگا کہ اب یہ جن مجھے کسی بہانے اس کنویں کے پاس لے جا کر اس میں پھینک کر مارنا چاہتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں وہاں

نہ بچ پاؤں میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''تم یہاں ہی سب کچھ مجھے بتا دو میں یہاں ہی غور سے تمہاری حقیقت سن لوں گا ویسے بھی اس کنویں کے پاس جانے سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

میری بات سن کر وہ جن میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''ارے اقبال خان اب مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں اور میرے ہوتے ہوئے اب تمہیں کچھ نہیں ہوگا تم مجھے اب دوست سمجھو دشمن نہیں چلو آؤ میرے ساتھ......'' میں نے اس کی بات مانی اور اس کے ساتھ چلتا ہوا اس کنویں کے پاس چلا گیا جہاں وہ رہتا تھا کنواں بہت خطرناک تھا کنویں کے اندر سے عجیب قسم کی آوازیں آ رہی تھیں کنویں کے اندر مدہم سی روشنی بھی تھی کنویں کے پاس ہی اس جن نے ایک صاف جگہ پر مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس نے اپنی ساری حقیقت مجھے کچھ اس انداز میں بتائی۔

''اقبال خان میرا نام اسماعیل جن ہے اور میں بھی تمہاری طرح مسلمان ہوں آج سے چند سال قبل میں ایک گاؤں میں رہتا تھا جس گاؤں کا نام 193 شمالی ہے اس گاؤں سے باہر چند قدموں کے فاصلے پر بوہڑ کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس پر میں اور میرے بیوی بچے رہتے تھے زندگی بڑی ہنسی خوشی میں گزر رہی تھی۔''

''گاؤں کے بھی لوگ دوپہر کے وقت بوہڑ کے اس درخت کے سائے میں بیٹھتے اور اُن کے بچے بوہڑ کے اس درخت کی شاخوں کے ساتھ پینگیں باندھ کر جھولے جھولتے تھے میں نے کبھی بھی نہ گاؤں والوں کو سائے میں بیٹھنے پر تنگ کیا اور نہ ہی اُن کے بچوں کو اس لیے کہ مجھے اور میرے گھر والوں کو انسانوں میں رہنا اچھا لگتا تھا بوہڑ کا وہ درخت میرا گھر تھا جس پر ہم کئی سالوں سے رہ رہے تھے مجھے اس گاؤں کے لوگوں سے بے پناہ محبت تھی۔''

''میں ان کے ہر دکھ درد میں شریک ہوتا اور غائب ہو کر ان گاؤں والوں کی مدد بھی کرتا ایک بار ایسا ہوا کہ میں چند دنوں کے لیے اپنے کسی دوسرے قبیلے میں چلا گیا جو اس گاؤں سے ہزاروں میل دور قبیلہ تھا۔ اصل میں ہمارے کچھ رشتے داروں میں وہاں لڑائی جھگڑا ہو گیا تھا میں ان میں صلح کروانے گیا تھا۔ وہاں مجھے کچھ دن لگ گئے اور جب میں واپس آیا تو میرے بیوی بچے مرے ہوئے تھے انہیں کسی نے جلا کر قتل کر دیا تھا اور بوہڑ کا وہ درخت جو میرا گھر تھا اسے بھی کاٹ دیا گیا تھا اپنے مرے ہوئے بیوی بچوں کو دیکھ کر میں پاگل ہو گیا تھا۔''

''تب گاؤں والوں سے میں نے سنا گاؤں والوں نے جان بوجھ کر میرے بیوی بچوں کو مارا تھا اصل وجہ یہ تھی کہ جس شخص کی زمین پر وہ بوہڑ کا درخت تھا اسے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی اس نے ایک دن درخت کاٹنے والوں سے اس بوہڑ کا سودا کر دیا اور جب میرے بچوں اور میری بیوی نے دیکھا کہ کچھ لوگ ان کا یہ گھر کاٹنا چاہتے ہیں تو انہوں نے ڈرا کر درخت کاٹنے والوں کو بھگا دیا اس کے بعد بوہڑ کا مالک اور وہ درخت کاٹنے والے ایک عیسائی جادوگر کو لے آئے اور اس عیسائی جادوگر نے جادو کے ذریعے میری بیوی بچوں کو زندہ جلا دیا اور بعد میں وہ درخت بھی کاٹ دیا جہاں ہم رہتے تھے میں اتنا بڑا صدمہ برداشت نہ کر سکا۔''

''مجھے اس گاؤں والوں سے اور تمام انسانوں سے نفرت ہو گئی میں وہ گاؤں چھوڑ کر

یہاں ویران کنویں میں آ کر رہنے لگا اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ انسانوں سے ضرور لوں گا اقبال خان انسان ہم جنات کو ظالم کہتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں انسان ہم سے بھی بڑا ظالم ہے۔''

''تب میں نے سوچا کہ میں ہر اس انسان کو قتل کروں گا جو اس راستے پر آئے گا اس لیے میں نے پہلے دو بھائیوں کا قتل کیا اور پھر ایک اور نوجوان کا قتل کیا اب میں تمہیں بھی قتل کرنا چاہتا تھا لیکن تم بچ گئے اقبال خان مجھے میرے بیوی بچے بہت یاد آتے ہیں اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس صورت حال میں انسانوں کا قتل نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟'' یہ کہہ کر اسماعیل جن دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کی دکھ بھری کہانی سن کر مجھے بھی رونا آ گیا وہ اتنا طاقتور ہو کر اپنے بیوی بچوں کی یاد میں بلک بلک کر رو رہا تھا آخر اس کے سینے میں بھی تو دل تھا کوئی پتھر نہیں اس مظلوم اسماعیل جن کی ساری دکھ بھری داستان سن کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کو گلے لگایا وہ میرے گلے لگ کر بہت رویا میں نے اسے سہارا دیا اور اسے مخاطب کر کے کہا۔

''اسماعیل جن واقعی ہی تمہارے ساتھ انسانوں نے ظلم کیا اور تمہارے پورے گھر کو برباد کر دیا اسماعیل اب اگر تم نے مجھے دوست کہا ہے تو میں تمہیں ایک بات کہوں۔'' اسماعیل جن نے نمناک آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''ہاں دوست کہو......'' میں نے کہا۔

''اسماعیل میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں مجھے دل سے دکھ بھی ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ ظلم کی انتہا کر دی اس گاؤں کے ظالم لوگوں نے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ان ظالم لوگوں کو چھوڑ کر دوسرے بے گناہ لوگوں کا قتل کرو اگر میں آج اس راستے پر نہ آتا تو نہ جانے تم بدلے کی آگ میں اور کتنے انسانوں کا قتل کرتے بلکہ تم تو ان کو بھی معاف کرو جن ظالموں نے تمہارے بیوی بچوں کو زندہ جلایا ہے تم صبر کرو قیامت کے دن اللہ تمہیں صبر کا پھل ضرور دے گا اور ان ظالموں کو ان کے انجام تک بھی ضرور پہنچائے گا جس کے حق دار وہ ہوئے ایسا ظلم کر کے اسماعیل اب وعدہ کرو اگر مجھے دوست سمجھتے ہو تو آج کے بعد تم کسی بھی بے گناہ انسان کا قتل نہیں کرو گے۔''

اسماعیل جن نے نہ جانے کن آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مجھے لگا لگا کر بولا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اب کسی بھی انسان کا قتل نہیں کروں گا میرے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ مجھے میرا رب دے گا میں اب صبر کرتا ہوں اچھا ہوا دوست اقبال جو تم نے مجھے اچھی راہ دکھائی اور مجھے بے گناہ انسانوں کے قتل سے بچا لیا ورنہ میں بدلے کی آگ میں گناہ کی اس اندھیری رات پر سفر کرتا رہتا۔''

میں کافی دیر تک اسماعیل جن کے پاس اس کنویں کے پاس بیٹھا رہا پھر جب میں نے اس سے اجازت چاہی تو اس نے کہا۔

''میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں اور تمہیں گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔'' میں نے انکار کر دیا۔ لیکن اسماعیل جن جو اب میرا دوست تھا وہ مجھے گھر تک چھوڑنے آ گیا تھا جس وقت میں گھر کی دہلیز میں قدم رکھ رہا تھا تو اس وقت اسماعیل جن کی آنکھیں نمناک ہو گئیں تھیں وہ اس وقت آخری بار میرے گلے لگا اور خدا حافظ کہہ کر ہمیشہ کے لیے نہ جانے کہاں کھو گیا۔

☆☆......☆☆

کراچی سے ارسال کردہ انتہائی ڈراؤنی مگر سچی کہانی

سردرات اور انسانی ڈھانچے

دنیا سے جانے کے بعد بھی انسان کا دنیا والوں سے رابطہ رہتا ہے اگر وہ غیر فطری موت مرا ہو یا مار دیا گیا ہو، وہ ماں بیٹیاں بھی مرنے کے بعد کچھ کہنا چاہتی تھیں......

فرح انیس

ہندوستان سے جو لٹے پٹے قافلوں کی صورت میں ہم پاکستان کی سرزمین پر پہنچے تو بے اختیار میں اور میری بیوی شازمہ اس مٹی پر سجدہ ریز ہو گئے اور ہماری آنکھوں سے بہتے تشکر کے آنسو اپنے رب کے حضور گر کر اس کا شکر ادا کرنے لگے۔

اِس دھرتی تک پہنچنے کے سفر میں میرا قیمتی اثاثہ مجھ سے بہت دور ہو چکا تھا۔ جس کے پیروں تلے جنت اور جس کی موجودگی دھوپ میں گھنے شجر کی مانند ہے۔ میرے ماں باپ جن کو ہندوؤں نے بے رحمانہ طور پر قتل کر دیا تھا۔ جس وقت میں نے اور میری بیوی شازمہ نے اس دھرتی پر قدم رکھا تھا ہمارے وجود سوکھے پتوں کی مانند لرز رہے تھے۔ ہمارے قدموں نے ہمارے وجود کو مزید سہارنے سے انکار کر دیا تھا ہم دونوں وہیں دوزانو بیٹھ کر اپنے وطن کی مٹی کو ہاتھوں میں لے کر عقیدت سے چوم رہے تھے اور پھر رب کی بارگاہ میں شکر کا ترانہ پڑھتے ہوئے اپنی منزل کی جانب چل دیے۔

ہمارے حصے میں جو گھر آیا تھا وہ ایک منزلہ عمارت پر مبنی تھا۔ بڑا سا زنگ آلود دروازہ جس کو کھولتے ہی چرچراہٹ کی آواز نے ماحول میں عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ بڑا سا صحن تھا جس کا فرش کافی ٹوٹا پھوٹا سا تھا صحن کی دیواروں پر اکھڑا پلاستر اور اس سے جھانکتی ہوئی سیمنٹ کی اینٹیں وہاں کے مکینوں کی حالاتِ زار بیان کر رہی تھیں۔ صحن میں لگے نیم کے درخت اور برگد کے درختوں کی زمین کو چھوتی چوٹیاں ان درختوں کو عمر رسیدہ ظاہر کر رہی تھیں۔

سامنے کی جانب دو کمرے بنے ہوئے تھے ایک کمرہ کافی بڑا تھا جبکہ اس کے برابر والا کمرہ کافی چھوٹا تھا۔ جس میں کاٹھ کباڑ کا سامان پڑا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کے مکینوں نے اس کو اسٹور روم بنایا ہوا تھا۔ اس اسٹور روم کے برابر ہی چھوٹا سا باورچی خانہ تھا جو اس قدر تنگ تھا کہ وہاں دو لوگوں سے زیادہ کھڑے ہونے کی

گنجائش نہ تھی۔ صحن کے ایک کونے میں بنی بالائی منزل کی جانب جاتی گول محرابی لکڑی کی سیڑھیاں جن پر قدم رکھتے ہی وہ احتجاجی طور پر چوچراں کرنے لگی تھیں۔

سیڑھیوں کی خستہ حالت کے پیش نظر میں سنبھل کر سیڑھیوں پر قدم رکھنے لگا۔ اوپر ہال نما بڑا سا کمرہ تھا اس ہال نما کمرے کے ایک کونے میں پتھر کا چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر بڑا سا پتھر کا بت رکھا ہوا تھا اور اس بت کے ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں جو اس بات کی نشاندہی کررہی تھیں کہ یہ جگہ پہلے ہندوؤں کی رہائش گاہ تھی۔ سامنے ہی ایک بڑی سی بالکونی نظر آرہی تھی میں اس بالکونی میں آگیا جہاں سے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔

شام ہونے والی تھی ہر طرف عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی میری نظر گھر کے سامنے بنے مندر پر پڑی جس کی حالت نہایت ہی ابتر تھی میں غور سے مندر کا جائزہ لینے لگا اس مندر میں رکھی مورتیوں کو مسمار کردیا گیا تھا میں کافی دیر بالکونی میں کھڑا اِدھر اُدھر کا نظارہ کرتا رہا جہاں میرا گھر تھا وہ جگہ کافی سنسان تھی میرے گھر کے اطراف میں جھاڑیاں تھیں میں پلٹ کر واپس اس ہال نما کمرے میں آگیا نیچے صحن سے آتی شازمہ کی باتوں کی آواز پر میں نیچے چلا آیا جہاں وہ ایک لڑکی سے صحن میں کھڑی مسکرا کر باتیں کررہی تھی۔

''فیاض یہ سیتا ہے یہیں ہمارے گھر سے تھوڑا



آگے فاصلے پر رہتی ہے۔" شازمہ مجھے متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ ساڑھی زیب تن کی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل لگائے ہوئے وہ لڑکی مجھے مسکرا کر دیکھنے لگی۔

"میں یہاں سامنے مندرا آئی تو مجھے لگا اس گھر میں نئے لوگ آئے ہیں تو میں ملنے چلی آئی۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"اب چلتی ہوں میں......" وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔

"شازمہ کیا ضرورت تھی۔ اس طرح سے کسی اجنبی کو اندر بلانے کی۔" اس لڑکی کے جاتے ہی میں شازمہ پر برس پڑا۔

"میں کیا کرتی فیاض وہ خود آئی ہے۔"

"پر پھر بھی تم احتیاط کرو۔" میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"اچھا میں پوچھ رہی تھی کہ اس کمرے کا کیا کرنا ہے۔" وہ اسٹور روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"اس کو تو تم یونہی رہنے دو یہ بڑا کمرہ صاف کرلو جب اس کی ضرورت ہوگی تو اس کو بھی ٹھیک کرلیں گے۔" میرے کہنے پر شازمہ کمرے کی صفائی کرنے چل دی۔ ہم دو ہی تو لوگ تھے کل کو جب بچے ہوتے تو اس کمرے کو دیکھ لیتے ابھی تو ہم میاں بیوی کے لیے وہ ایک کمرہ بھی بہت تھا۔

ویسے بھی سب سے پہلے مجھے کوئی نوکری ڈھونڈنی تھی تاکہ گھر کی دال روٹی چل سکے اس کے بعد ہی گھر کی حالت زار کو بہتر بنایا جاسکتا تھا۔ میں صحن میں کھڑا آنے والے کل کو سوچ رہا تھا رات تک کمرے کی حالت پہلے سے بہت بہتر کردی تھی شازمہ نے، ہم اس کمرے کے فرش پر چادر بچھا کر لیٹ گئے تھے تھکن اتنی زیادہ تھی کہ لیٹتے ہی آنکھیں نیند سے بند ہوگئیں۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد میں تلاش روزگار کے لیے نکل گیا اور تھوڑے ہی دن بعد ایک دفتر میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ شازمہ میری نوکری سے بہت خوش تھی ہم دونوں کا تھا ہی کون ایک دوسرے کے علاوہ اس دنیا میں رات جب وہ بستر پر لیٹتی تو اپنوں کی یاد سے اپنے تکیے کو بھگوتی اس کے اپنے بھی ہندوؤں کی سفاکیت کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ ایسے میں میرے پاس اسے تسلی دینے کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا مگر بعض اوقات اس کو تسلی دیتے دیتے میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا تھا ہم دونوں کا غم ایک جیسا تھا۔

ہم دونوں نے ہی اپنے پیاروں کو کھویا تھا مگر اس بات کا اطمینان تھا کہ آج ہم اپنے وطن میں ہیں جہاں ہم آزادی سے زندگی بسر کرسکتے ہیں ہمیں سکھ کا سانس نصیب تھا۔ آج شام دفتر سے واپس آتے ہوئے جیسے ہی میں گھر کی گلی میں داخل ہوا میری نظر گھر کی بالکونی پر پڑی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی کھڑا ہے۔

ہوا سے اڑتا سرخ آنچل میں بری طرح سے چونکا شاید شازمہ ہو وہ جو کوئی بھی تھی اس کی پشت نظر آرہی تھی میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ پارہا تھا میں گھر کے اندر داخل ہوا تو سامنے ہی شازمہ نیلے سوٹ میں کھڑی چائے بنارہی تھی میں تیزی سے اوپر آیا مگر بالکونی میں کوئی بھی نہیں تھا۔

میں پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کیونکہ میں نے خود گھر میں داخل ہونے سے پہلے یہاں کھڑا کسی کو دیکھا تھا۔ میں سوچوں میں گم نیچے چلا آیا کہ میرے قدم جیسے کسی نے جکڑ لیے ہوں نیم کے درخت کے پاس پڑی ڈھیروں گلاب کی پتیوں نے مجھے تعجب میں ڈال دیا تھا۔

"یہ کہاں سے آئیں۔" ابھی میں ان پتیوں پر غور ہی کر رہا تھا کہ شازمہ کی آواز پر متوجہ ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"کہاں ہیں کب سے آوازیں دے رہی ہوں کہ چائے پی لیں۔" شازمہ میرا بازو ہلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں چلو......" میں اس کے ساتھ جاتے ہوئے بولا مگر پلٹ کر میں نے دوبارہ ان پتیوں کی جانب دیکھا مگر یہ کیا وہ پتیاں اب وہاں نہیں تھیں۔ میں غائب دماغی سے شازمہ کے ساتھ اندر چلا آیا مگر میرا دماغ سارا وقت ان پتیوں میں اٹکا رہا۔ رات کے کسی پہر میری آنکھ عجیب سی آواز سے کھلی جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو۔ میں کان لگا کر غور سے ان آوازوں کو سننے لگا ایسا لگتا تھا دو تین لڑکیاں مل کر آپس میں محو گفتگو ہوں میں اٹھ کر صحن میں چلا آیا وہ آوازیں اوپر کی منزل سے آرہی تھیں۔

ابھی میں نے سیڑھی پر قدم ہی رکھا تھا کہ شازمہ کی آواز پر پلٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔

"کہاں جارہے تھے؟"

"کہیں نہیں بس ایسے ہی نیند نہیں آرہی تھی۔" میں اسے ٹالتے ہوئے بولا۔

"مجھے اٹھا دیتے طبیعت تو ٹھیک ہے۔" میں اپنی شریک حیات کی فکر مندی پر محبت سے مسکرا دیا۔

"ہاں ہاں سب ٹھیک ہے چلو اندر......" میں اس کے ساتھ واپس پلٹ گیا۔ پلٹتے ہوئے بھی میں نے جس چیز پر غور کیا تھا وہ یہ تھا کہ آوازوں کا سلسلہ رک گیا تھا۔ آج شام دفتر سے واپس آتے ہوئے میری نظر مندر پر پڑی جہاں سیتا بہت گم صم سی کھڑی تھی میں خاموشی سے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر جب صحن میں آیا تو شازمہ کو سیتا کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھ کر میں واپس کمرے میں آ گیا اور وہاں بیٹھ کر وقت گزاری کے لیے اخبار پڑھنے لگا۔ مجھے سیتا کی بے وقت کی آمد بہت بری لگ رہی تھی اور ساتھ شازمہ پر بھی غصہ آرہا تھا ایک اجنبی لڑکی کو اتنا فری کر کے بیٹھ گئی۔

میں تھکا ہارا گھر آیا تھا اور اس وقت گھر میں کسی اجنبی کی موجودگی مجھے کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔

"سیتا یہ مندر تو اتنا ویران ہے یہاں تو کوئی بھی تمہارے سوا مجھے نظر نہیں آتا۔" شازمہ کے سوال پر میری سماعتیں سیتا کے جواب کی منتظر تھیں کیونکہ اس مندر کو دیکھ کر اکثر میرے ذہن میں بھی یہی سوال آتا تھا۔ میں نے بھی وہاں سیتا کے علاوہ اب کسی کو آتا نہیں دیکھا تھا۔

"ایک وقت تھا باجی یہ مندر بہت رونق والا ہوا کرتا تھا یہاں پر ہر وقت لوگوں کی بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ اس جگہ پر سب ہی لوگ دور دور سے اس مندر میں آتے تھے مگر شانتی کے سائے نے سب ختم کر دیا۔" سیتا اداسی سے بولی۔

میں بہت غور سے سیتا کی باتوں کو سن رہا تھا۔

"کیسا سایہ سیتا۔"

"باجی یہاں سے تھوڑا دور ایک عورت رہتی تھی شانتی نام کی بے حد حسین و جمیل سنا تھا وہ جوان رہنے کے لیے جوان لڑکیوں کی بھینٹ چڑھایا کرتی تھی۔ وہ اکثر راتوں میں اس مندر میں نظر آتی تھی مندر کی پچھلی طرف ایک ویران سی جگہ ہے جہاں کسی کا آنا جانا نہیں ہوتا تھا وہ وہاں بیٹھ کر اپنا علم کرتی تھی اور نجانے اس عورت نے کتنے لوگوں کی بھینٹ چڑھائی۔"

"تو کیا کسی نے اس عورت کو پکڑا نہیں سیتا......؟"

"نہیں کیونکہ کسی کو اس پر کبھی شک ہی نہیں ہوا تھا یہ تو جب لڑکیاں غائب ہونی شروع ہوئی تب لوگوں کو محسوس ہوا کہ ان کی لڑکیاں مندر جاتی تو ہیں پر وہاں سے کہاں غائب ہو جاتی ہیں پھر وہ وہاں آنے والی لڑکیوں کو شربت میں یا کسی بھی چیز میں نشہ آور دوا ملا کر دے دیتی تھی۔

"وہ بس موقع کی تلاش میں ہوتی تھی پہلے ان لڑکیوں سے دوستی کر کے اعتماد اپنا قائم کر لیتی تھی بعد میں ان کی جان لے لیتی تھی۔ اس مندر سے سب ڈرنے لگے تھے لوگوں نے یہاں آنا چھوڑ دیا تھا اور پھر یہاں پر ان کی آتمائیں بھی بے چین پھرتی ہیں اکثر راتوں میں لوگوں نے ان آتماؤں کو اس مندر کے اطراف میں دیکھا ہے بہت سو کو کرب میں ڈوبی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔"

"اوہ تو تم کو ڈر نہیں لگتا تم کیوں جاتی ہو اس مندر اور وہ شانتی اب کہاں ہے؟" شازمہ ڈرتے ہوئے اس سے ایک ہی سانس میں سب سوال کر گئی۔

"نہیں مجھے ڈر نہیں لگتا۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اور شانتی کا بہت برا انجام ہوا تھا اس کے گھر میں ایک رات خود بخود آگ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ جل کے مر گئی۔"

"برائی کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔" شازمہ افسوس سے بولی۔

"اچھا میں چلتی ہوں بہت دیر ہو گئی۔" وہ شازمہ سے اجازت لیتے ہوئے پلٹ گئی۔ میں بھی اس کے جاتے ہی صحن میں چلا آیا۔

"فیاض سنا آپ نے سیتا کیا بتا رہی تھی؟" شازمہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"ہاں سنا ہے اب چائے ملے گی۔" میں اس کی بات پر بولا درحقیقت میں اس کا دھیان بٹانا چاہ رہا تھا میں نہیں چاہ رہا تھا وہ زیادہ سیتا کی بات کو سوچے میں چائے لے کر اوپر چلا آیا میں بالکونی میں کھڑا ابھی اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ میری نظر سامنے مندر کی جانب پڑی جہاں سیتا کھڑی ہوئی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ مندر سے نکل کر اس کی پچھلی طرف جانے لگی میں بہت غور سے اُسے دیکھ رہا تھا اب وہ مجھے نظر نہیں آرہی تھی مگر کوئی تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس آتی مجھے دکھائی دی وہ واپس مندر کی طرف آرہی تھی۔ میرے وجود میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ میری بیوی کو الٹی سیدھی کہانیاں سنا رہی ہے۔

مجھے تو خود ہی یہ شانتی لگ رہی ہے اور شازمہ بھی بہت بیوقوف ہے جو اس کی باتوں میں آگئی میں شازمہ کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے نیچے آنے لگا کہ اچانک میری سماعتوں میں نقرئی قہقہے گونجے میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میں سر جھٹکتے ہوئے پلٹنے لگا کہ ایک بار پھر نسوانی ہنسی کی آواز آئی اب کی بار ایسا لگا تھا کہ دو تین لڑکیاں مل کر ہنسی ہوں پورا ہال سنسان تھا کسی کا کوئی وجود نہیں تھا میں سر کو جھٹکتا ہوا نیچے چلا آیا۔

میرے منع کرنے کے باوجود بھی شازمہ سیتا کو اندر آنے دیتی تھی شروع شروع میں مجھے کافی ڈر ہوا کہ میں دفتر میں ہوتا ہوں اگر میرے پیچھے ایسی کوئی بات ہو گئی یا سیتا نے شازمہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی مگر سیتا نہایت بے ضرر ثابت ہوئی وہ تو روز شام میں شازمہ سے باتیں کر کے چلی جاتی تھی مجھے اب اپنی سوچ پر ہنسی آرہی تھی کہ میں سیتا کو ہی جادوگرنی بول رہا تھا۔

"آج مجھے دیر ہو جائے گی دفتر سے آتے ہوئے کچھ کام ہے صاحب کو۔" صبح میں گھر سے نکلتے ہوئے شازمہ سے بولا۔

دفتر میں کام کے دوران وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا واپسی میں کافی دیر ہو گئی تھی میں جلدی جلدی گھر کی جانب قدم بڑھا رہا تھا کہ میں ٹھٹک کر رک سا گیا مندر کے پاس مجھے کوئی کھڑا نظر آیا تھا اور پھر تیز رفتاری سے وہ مندر کے پچھلے حصے کی جانب چلا گیا میں عجیب مخمصے میں کھڑا صورتحال سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ مندر سے اچانک ایک دل دہلا دینے والی چیخ نے میرے اوسان خطا کر دیے وہ کوئی نسوانی چیخ تھی میں تیزی سے مندر کی جانب بھاگا مگر وہاں کوئی نہ تھا اچانک وہاں سے سسکیوں کی آواز آنے لگی ایسا لگ رہا تھا بہت ساری لڑکیاں مل کر رو رہی ہو مجھے اس ماحول سے وحشت ہو رہی تھی آہستہ آہستہ وہ سسکیوں کی آواز اونچی ہونے لگی میں گھبرا کر وہاں سے باہر آ گیا۔

اور گھر کی طرف بڑھ گیا۔ گھر میں داخل ہوا تو کچن سے برتنوں کی آواز آ رہی تھی میں سمجھا شازمہ ہے ابھی میں آگے بڑھتا کہ اچانک کچن سے کوئی ہاتھ میں ٹرے لیے نمودار ہوا اور آہستہ سے سر جھکائے صحن میں بنی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا وہ کوئی عورت تھی میں ٹھیک طرح سے اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو خوف سے اس کا دل بند ہو جاتا میں فطرتاً کافی بہادر ہوں میں ہمت مجتمع کر کے اس کے پیچھے چل دیا اوپر کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں حیرت وخوف سے پھیل گئی تھیں کچھ عجیب ہی منظر تھا وہ ہال تو لگ ہی نہیں رہا تھا جیسا ہوتا تھا اس کی تو حالت ہی الگ تھی پورے ہال کو بتیوں سے روشن کیا ہوا تھا۔

زمین پر وہی عورت جو ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لے کر جا رہی تھی وہ بیٹھی تھی اس کے ساتھ ہی تین لڑکیاں اور تھیں۔

وہ تینوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے ہنسی مذاق کرتی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں میں غور سے ان کے چہرے دیکھ رہا تھا جو مجھے واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس ہال کا منظر ہی الگ تھا ایسا لگتا تھا وہاں دن نکلا ہوا ہے۔

"فیاض آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔" شازمہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی اوپر چلی آئی تھی نیند کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھی میں سو گئی تھی مگر مجھے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو میں اٹھ گئی تھی آپ کو نیچے نہ پا کر میں اوپر چلی آئی وہ جماہی لیتے ہوئے بولی۔

میں اس کی بات پر پلٹ کر ہال دیکھنے لگا جہاں پر اب مکمل خاموشی کا راج تھا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

"نیچے چلو۔" میں شازمہ کو لیے نیچے آ گیا۔

کمرے میں آ کر میں خاموشی سے لیٹ گیا میری آنکھوں کے سامنے کچھ دیر پہلے کا منظر آ گیا۔

"فیاض ایک بات بولوں۔" شازمہ میرے پاس بیٹھی ہوئی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ہاں بولو؟"

"میں بہت دنوں سے ایک بات محسوس کر رہی ہوں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"ایسا لگتا ہے اس گھر میں خالی ہم دو نہیں ہیں ہمارے علاوہ بھی اور لوگ ہیں میں کافی دنوں سے محسوس کر رہی ہوں چلتے پھرتے کسی کو ایک دو بار تو میں نے کچھ لڑکیوں کو بھی دیکھا۔"

"تم نے ان کا چہرہ دیکھا۔" اس کی بات پر

میں چونکتا ہوا بولا۔
''نہیں میں چہرہ نہیں دیکھ پائی۔'' وہ نفی میں سرہلاتے ہوئے بولی۔
''ہاں پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ان کا گھر ہو کام کرتی اٹھتی بیٹھتی وہ ایسے نظر آتی ہیں جیسے برسوں سے یہاں رہائش پذیر ہوں۔''
''دیکھو شازمہ میں بھی یہ بات جانتا ہوں کہ اس گھر میں کچھ ہے مگر تم دیکھو جو بھی ہے وہ ہم کو نقصان تو نہیں پہنچا رہا اور ویسے بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا یہ ایمان ہے کہ اللہ کا نام لینے سے کوئی بھی شے آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔'' میں شازمہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔
میری بات پر وہ اثبات میں سرہلانے لگی۔
آج چھٹی کا دن تھا شام معمول کے مطابق سیتا چلی آئی میری بھی اس سے پہلے کی نسبت اچھی بات چیت ہوگئی تھی وہ ایک اچھی لڑکی تھی اور کافی عزت سے مجھے بھائی کہہ کر بات کرتی تھی میرے دل میں شروع میں اسے لے کر جو بدگمانی تھی وہ اب صاف ہوچکی تھی۔ صحن میں ان دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر میں بھی وہیں چلا آیا تھا۔
''سیتا ایک بات پوچھوں؟'' میں صحن میں رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔
''جی بھائی......'' وہ احترام سے بولی۔
''کیا اس گھر کے بارے میں تم کچھ جانتی ہو میرا مطلب ہے تمہارا گھر یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے تو تم کو کچھ تو پتا ہی ہوگا۔'' میری بات پر اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔
''جی میں جانتی ہوں۔'' وہ اُداسی سے بولی۔
''کیا جانتی ہو۔'' میں متجسس ہوتے ہوئے بولا۔ شازمہ بھی پوری توجہ کے ساتھ اس کو دیکھ رہی تھی۔
''یہاں پر پہلے ایک عورت اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی' اس کا پتی کافی عرصہ پہلے مرگیا تھا۔'' اس کی بات پر میں اچھل گیا میں نے اوپر کی منزل پر ایسا ہی منظر دیکھا تھا ایک عورت اور تین لڑکیاں میں نے سیتا سے کچھ ذکر نہیں کیا کہ میں نے ایسا کچھ دیکھا ہے۔
''آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟'' وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔
''بس ایسے ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔'' میں اُسے ٹالتے ہوئے بولا۔ میں اُسے پوری بات بتا کر گھر کو بدنام نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔
میں جانتا تھا وہ اچھی لڑکی ہے مگر پھر بھی میں اسے تفصیل بتاتے ہوئے احتیاط کرر ہا تھا۔
''تو ان عورتوں کے ساتھ ہوا کیا تھا؟'' شازمہ اچانک سیتا سے سوال کرنے لگی۔
''ان عورتوں کو کسی نے بے رحمانہ طور پر قتل کردیا تھا اس ہی گھر میں ......'' سیتا کی بات پر شازمہ خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ نہیں ہوتا کی تسلی دے رہا تھا۔
''فیاض پہلے مجھے لگتا تھا کہ سامنے مندر کی وجہ سے ایسا ہورہا ہے' ہمارے گھر پر۔'' سیتا کے جانے کے بعد وہ مجھ سے بولی۔
''فیاض تو ان کی روحیں ہمیں کیوں نظر آتی ہیں؟ کیا وہ ہم سے کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔'' شازمہ میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔
''پتا نہیں میں خود نہیں سمجھ پارہا۔'' اس کی بات پر میں خیالوں میں گم بولا۔ رات تک ہم دونوں کافی دیر بیٹھے رہے۔
''سو جاؤ کچھ نہیں ہوتا اللہ مالک ہے' پریشان

ہونے کی کوئی بات نہیں۔'' میں شازمہ سے کہتے ہوئے نیم دراز ہوگیا۔ وہ بھی لیٹ گئی۔ رات کے کسی پہر مجھے محسوس ہوا کوئی میرے کانوں میں سرگوشی کررہا ہے۔ میں جو بہت گہری نیند میں تھا ایک دم سے ہڑبڑا گیا۔ شازمہ میرے اوپر جھکی کچھ بول رہی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''فیاض باہر کوئی ہے۔'' وہ ڈرتے ڈرتے صحن کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ اس کی بات پر میں صحن میں آگیا۔ مگر باہر کے منظر نے مجھے ششدر کردیا۔

اسٹور روم سے آتی آوازوں پر میں ابھی اسٹور روم کی جانب بڑھنے ہی والا تھا کہ میری آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا اسٹور روم سے کوئی ٹرنک گھسیٹتا ہوا لے کر جارہا ہے۔ مگر لے جانے والا نظر نہیں آرہا تھا کہ اچانک سے صحن کی سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی دھمک سنائی دی۔

''ارے جلدی لے آؤ میں نے کپڑے نکال کر دھوپ بھی لگانی ہوگی۔''

ان کو سیڑھی پر سے کسی عورت کی آواز اور پھر وہ نادیدہ وجود اس ٹرنک کو سیڑھیوں سے اوپر لے جانے لگا۔ میرے پیچھے کھڑی شازمہ دہشت زدہ سی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی وہ بری طرح سے لرز رہی تھی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کے اندر لے آیا وہ کٹی پتنگ کی طرح میرے سینے سے لگ کر بری طرح سے پھوٹ پھوٹ کے رودی۔

''شازمہ میری بات سنو دیکھو ایسے نہ رو۔'' میں اس کے اس طرح سے رونے پر بری طرح سے گھبرا گیا تھا اور اب میں سنجیدگی سے کسی دوسرے گھر کے بارے میں سوچ رہا تھا میں جانتا تھا وہ بہت کمزور دل عورت ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ خدانخواستہ اسے کچھ ہو۔

شام دفتر سے آتے ہوئے میں سیتا کی آواز پر رک گیا وہ مندر کے پاس کھڑی تھی۔

''بھائی میں نے سنا ہے آپ لوگ دوسرا گھر دیکھ رہے ہیں مجھے شازمہ باجی نے بتایا۔'' وہ مجھے دیکھتے ہوئے یاسیت سے بولی۔

''ہاں سیتا میں شازمہ کو اس طرح پریشان نہیں دیکھ سکتا۔'' میں سیتا کی بات کے جواب میں بولا۔

''تو کیا وہ لوگ آپ کو پریشان کررہے ہیں۔''

''نہیں پریشان تو نہیں مگر ان کی موجودگی سے شازمہ اب بہت ڈرنے لگی ہے۔'' میری بات پر وہ چپ سی ہوگئی اسے خاموش دیکھ کر میں گھر کی جانب بڑھ گیا۔ گھر میں داخل ہوا تو شازمہ کو باورچی خانے میں کھانا پکاتا دیکھ کر میں سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے رات وہ ٹرنک والی بات یاد آرہی تھی میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا آیا مگر حیرت کا شدید جھٹکا مجھے ہال میں رکھے اس ٹرنک کو دیکھ کر لگا جو کھلا ہوا تھا میں تھوڑا آگے بڑھا تو وہاں بالکونی کی منڈیر پر زرق برق لباسوں کو پھیلا کر کسی نے ڈالا ہوا تھا۔

میری سماعتوں میں رات والی آواز کی گونج تھی۔

''کپڑے اوپر لے آؤ میں نے دھوپ لگانی ہے۔ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے؟'' میں بڑبڑاتے ہوئے زیرلب بولا اور نیچے چلا آیا میں نہیں چاہ رہا تھا شازمہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی اوپر چلی آئی اور وہ یہ سب دیکھ کر خوفزدہ ہو ویسے بھی وہ ڈر کے مارے اوپر نہیں آتی تھی۔ وہ رات ہم نہیں جانتے تھے کہ ہمارے لیے کس قدر بھاری ہوگی ابھی ہم بستر پر

لیٹے ہی تھے کہ ڈھول کی آواز نے ہم دونوں کو ہی چونکا دیا۔ ڈھول کے ساتھ تالیوں کی آواز اور پھر لڑکیوں کے قہقہے شازمہ ہراساں سی مجھے دیکھ رہی تھی میں کھڑا ہوتا ہوا باہر جانے لگا۔

''رہنے دو نا فیاض......'' وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے روہانسے لہجے میں بولی۔

''کچھ نہیں ہوتا۔'' میں اس کا ہاتھ تھپکتا ہوا باہر آ گیا پورا صحن برقی قمقموں سے سجا ہوا تھا۔ لگ رہا تھا کسی کی شادی ہو۔ صحن میں آتی جاتی عورتوں کو میں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

بالائی منزل سے آتی گانوں کی آواز پر میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آ گیا گلاب اور ابٹن کی ملی جلی خوشبو نے ماحول پر عجیب سحر طاری کر دیا تھا۔ سامنے ہی ایک لڑکی ہال میں پیلا لباس زیب تن کی ہوئی تھی اور سر پر اوڑھا دوپٹہ جو آگے ماتھے تک آیا ہوا تھا اس کے اردگرد لڑکیوں کا جھرمٹ تھا مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کسی مہندی میں آیا ہوا ہوں۔

''فیاض کیا ہوا؟'' شازمہ کی آواز نے ہر منظر دھندلا دیا تھا اب وہاں کچھ بھی نہ تھا شازمہ میرے پاس کھڑی پوچھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں......'' میں اور شازمہ نیچے صحن میں چلے آئے تو ہم دونوں کی نگاہ نیم کے درخت کے نیچے پڑی گلاب کی پتیوں پر پڑی جنہیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی کا استقبال کیا گیا ہو ان گلاب کی پتیوں سے......

میں آج دفتر نہیں گیا تھا میں نے چھٹی کر لی تھی۔ سیتا آئی تو شازمہ اس کو ساری صورتحال بتانے لگی۔

''ہو سکتا ہے باجی وہ لوگ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔'' سیتا کی بات پر میں بری طرح سے چونکا اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا اور واقعی اگر ایسا نہ ہوتا اور ان کو خالی ہمیں تنگ کرنا ہوتا یا یہاں سے نکالنا ہوتا تو وہ ہمیں نقصان پہنچاتے' میں جو گھر بدلنے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا اب ملتوی کر چکا تھا اور ساتھ شازمہ کو بھی اس بات کا یقین دلایا تھا کہ وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ شامہ بھی چپ ہو گئی تھی۔

تھوڑے دن تو سکون رہا مگر ایک رات کھانے کے بعد کمرے میں شازمہ بیٹھی اپنے دوپٹے پر موتی ٹانک رہی تھی اور میں اخبار کے مطالعے میں گم تھا کہ برابر اسٹور روم سے آتی آواز پر ہم دونوں ہی اچھل گئے ایسا لگ رہا تھا کوئی سامان گھسیٹ رہا ہو میں برابر اسٹور روم میں آ کر دیکھنے لگا وہاں رکھے ٹرنک کھلے ہوئے تھے میں آگے بڑھ کر ایک ٹرنک کو دیکھنے لگا اس میں رکھے زرق برق لباس اور دیگر چیزیں جو کسی لڑکی کا جہیز لگ رہا تھا میں غور سے ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا کہ کسی لڑکی کی سسکیوں کی آواز پر میں گھبرا کر باہر صحن کی جانب دیکھنے لگا۔

جہاں ایک لڑکی ہاتھ میں آنچل لیے ہوئے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر جا رہی تھی میں بھی ہمت کر کے اس کے پیچھے گیا تو بالکونی میں مجھے وہ سرخ آنچل لہراتا نظر آیا میں تیزی سے اس سمت لپکا مگر اب وہاں کوئی نہ تھا میں کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا مگر وہ مجھے پھر نظر نہیں آئی۔

اگلے دن میں شام سودا لے کر گھر کی طرف ہی آ رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ مندر کی جانب اٹھی تو وہاں وہی لڑکی کھڑی تھی جس کی پشت میری جانب تھی وہ سرخ آنچل کا گھونگھٹ نکالے ہوئے مندر کے پچھلے حصے کی طرف بڑھی یہ وہی سرخ آنچل تھا جو میں نے اپنے گھر میں اس لڑکی کے

ہاتھ میں اور گھر کی بالکونی میں ایک لڑکی کو اوڑھے دیکھا تھا میں سوچوں میں گم گھر چلا آیا۔ رات دیر گئے تک میں اور شازمہ باتیں کرتے رہے جب وہ سو گئی تو میں آہستگی سے اُٹھ کر باہر چلا آیا صحن میں اور کچھ سوچتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ رات اچھی خاصی بیت چکی تھی کتے بھونکنے کی آواز ماحول پر عجیب سی ہولناکیت طاری کر رہی تھی۔

میرے قدم مندر کے پچھلے حصے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ جگہ بالکل ویران تھی جھاڑیوں کے علاوہ وہاں ایک کمرہ تھا میں نے آگے بڑھ کر وہ دروازہ کھولا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا ایک غلیظ بدبو نے میرا استقبال کیا میں نے بے ساختہ ہاتھ اپنی ناک پر رکھا اس بدبو نے میرا دماغ ہلا دیا تھا۔ اندھیرے کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا میں دروازہ بند کر کے واپس پلٹنے لگا۔ ابھی میں تھوڑے ہی فاصلے پر تھا کہ کسی کے سسکنے کی آواز نے میرے قدموں کو جکڑ لیا تھا۔

یہ وہی آواز تھی جو مجھے اپنے گھر میں سنائی دے رہی تھی۔ میں گھر کا دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ اوپر بالکونی میں مجھے کھڑی لڑکی نظر آئی جس کی پشت میری جانب تھی۔

وہی سرخ آنچل تھا میں بری طرح سے پریشان ہو گیا کہ آخر یہ ہے کیا معاملہ میں گھر میں داخل ہو گیا اور آ کر بستر پر لیٹ گیا ابھی لیٹے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ گھر میں لگا بھونچال آ گیا ہو۔ ایک عجیب سا شور تھا شازمہ سوتے سے گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گئی اور پریشانی سے مجھے دیکھنے لگی۔

کسی کے رونے کی آواز آ رہی تھی اور یہ آواز اوپر سے آ رہی تھی میں اوپر کی جانب بڑھا۔

''فیاض......'' شازمہ نے گھبرا کر میرا ہاتھ پکڑا۔

''میں دیکھ کر آتا ہوں اوپر......''

''نہیں میں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔ میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ......'' وہ میرا ہاتھ پکڑے میرے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

مجھے اس وقت اس پر بے ساختہ پیار آ گیا یہ محبت ہی تو تھی کہ ڈر و خوف کے ان لحات میں اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا ہم دونوں اوپر چلے آئے۔

ہال کا منظر دیکھ کر شازمہ کا پورا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا کوئی لڑکی گھٹنوں میں سر دیے سسک رہی تھی۔ اور وہیں پاس ہی سرخ آنچل اس کے قدموں کے پاس پڑا ہوا تھا۔

''کون ہو تم؟'' میں اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ اس نے سر اٹھایا تو حیرت سے میری اور شازمہ کی آنکھیں پھٹ گئیں وہ کوئی اور نہیں سیتا تھی۔

''سیتا تم؟'' شازمہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہاں میں سیتا......'' وہ بولی۔

''میں یہاں اپنی ماں اور دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میں سب سے بڑی تھی۔ ہم اس گھر میں ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ میں روزانہ سامنے مندر جایا کرتی تھی مگر شانتی کی بری نظر نے مجھے اور میرے گھر کو اجاڑ ڈالا۔'' وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''شانتی کبھی بھی مجھے اور میری ماں کو نہیں پسند تھی ویسے بھی اس کی شہرت اچھی نہ تھی۔ جب میری سگائی ہوئی میں بہت خوش تھی اور بہت چاؤ سے میں اپنے ویاہ کے لیے یہ سرخ آنچل تیار

کر رہی تھی۔'' وہ حسرت سے اس دوپٹے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرے ویاہ کے دن قریب آ رہے تھے اور شانتی نے ہمارے گھر آنا جانا کافی شروع کر دیا تھا وہ بڑھ چڑھ کر میرے ویاہ کی تیاریاں کرا رہی تھی۔

شروع میں تو اس کا آنا ماں کو بہت ناگوار لگا مگر اس نے اپنی محبت سے سب کو رام کر لیا اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے بارے میں غلط افواہ لوگوں نے پھیلائی ہوئی ہے وہ اچھی طرح سے اپنا بھروسہ ہمارے گھر پر قائم کر چکی تھی۔ برأت سے ایک دن پہلے وہ ہمارے گھر پر تھی۔ وہ بڑی بھیانک رات تھی۔''

''اس رات اس نے اپنا کام کر دکھایا مشروب میں نشہ آور دوا ملا کر اس نے وہ مشروب مجھے اور میری ماں بہنوں کو پلا دیا۔ جسے پی کر ہم بے ہوش ہو گئے وہ اپنے چیلوں کی مدد سے مجھے بے ہوشی کی حالت میں مندر لے آئی میں نیم بے ہوش تھی اور اس نے مندر میں دیوتا کے آگے میری بھینٹ چڑھا دی اس کی نظر کافی عرصے سے مجھ پر تھی وہ سدا جوان اور خوبصورت رہنے کے لیے جوان اور خوبصورت لڑکیوں کی بھینٹ چڑھاتی تھی۔''

''میری دونوں بہنیں ابھی چھوٹی تھیں اس لیے اس سفاکیت کا نشانہ میں بنی۔ اس نے مندر کے پچھلے حصے میں بنے کمرے میں میری لاش کو ڈال دیا کیونکہ وہاں کسی کا گزر نہیں ہوتا' اس شانتی نے اس ہی پر بس نہیں کیا میرے گھر والوں کو بے ہوشی کی حالت میں بے رحمانہ طور پر قتل کر کے اسٹور روم کی زمین میں دفن کروا دیا۔ مگر میں نے بھی اپنا انتقام پورا کیا اس کے گھر میں آگ لگا کر۔'' سیتا نفرت سے بولی۔

''تم اب کیا چاہتی ہو؟'' میں عجیب کیفیت میں بولا۔

میں اور شازمہ اس وقت ایک بے یقینی کی کیفیت میں گرفتار تھے کہ جو لڑکی ہمارے گھر آتی تھی ہم سے باتیں کیا کرتی تھی وہ ایک روح تھی۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ ہماری لاشوں کو نکال کر وہاں سے ہمارا انتم سنسکار کروائیں تاکہ ہماری بے چین آتماؤں کو سکون ملے۔''

میں نے سارا قصہ ایک مندر کے پنڈت کو سنایا اور پھر ان ہی کی مدد سے کچھ آدمیوں نے وہ اسٹور روم کی زمین کھدوائی جہاں سیتا نے نشاندہی کی تھی وہاں سے تین ڈھانچے ملے اور مندر کے پچھلے حصے کی جانب کمرے سے بھی انسانی باقیات ملے۔ جن کو ان کی مذہبی رسومات کے مطابق ان کا انتم سنسکار کیا گیا ہم دوسرا گھر لے چکے تھے اور جس دن ہم گھر سے نکل رہے تھے۔

میری اور شازمہ کی نگاہ بالکونی کی جانب اٹھی جہاں سیتا سرخ آنچل تھامے کھڑی تھی مگر آج اس کی پشت نہیں تھی۔ ہماری جانب بلکہ وہ ہم دونوں کی طرف منہ کیے کھڑی تھی اس کے چہرے پر اطمینان اور لبوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ہم دونوں کے لیے تشکر کے جذبات تھے۔

میں نے اور شازمہ نے اسے مسکرا کر ہاتھ ہلایا جس کے جواب میں وہ بھی ہاتھ ہلاتی غائب ہو گئی میں پُرسکون سانس لیتے ہوئے دروازے کو تالا لگانے لگا اور سامان اٹھائے شازمہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

ہمارا اس گھر میں آنا قدرت کو منظور تھا تاکہ ہم سیتا اور اس کے گھر والوں کی مدد کر سکے۔

☆☆......☆☆☆

سرگودھا سے ارسال کردہ تحریر

بھیانک روحیں

جوانی ہوتی ہی نڈر رہے اور وہ تینوں دوست بھی موت کو

کھیل سمجھ کر اذیت ناک موت کا شکار ہو رہے تھے......

فیصل مشتاق

رات کے بھیانک اندھیرے میں ہر طرف خوف کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ اماؤس کی رات میں آکاش پر پھیلے بادل ایسی خوفناک صورت اختیار کر چکے تھے جیسے برسنے کو بے چین ہوں۔ وحشت بھری رات میں جانور اور پرندے اپنے مسکن میں چھپ چکے تھے۔ اسی صورت حال میں جنگل کے بیچوں بیچ بنگالی کالی اپنا خصوصی چلا کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے پاس مختلف قسم کے کٹے ہوئے سر اور ہڈیاں موجود تھیں۔ وہ یکے بعد دیگرے کٹے سروں کو آگ میں پھینکتی تو دل دہلا دینے والا منظر دکھائی دیتا اس کے ساتھ ہی خوفناک آوازیں پیدا ہوتیں۔ ایسی خوفناک آوازیں کسی بھی ذی روح کی سماعتوں سے گزرتی تو وہ بلاشبہ بہرہ ہوسکتا تھا۔ مگر بنگالی کالی کو ان مناظر اور آوازوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جانے کتنی مرتبہ اپنے چلے میں ناکام ہوچکی تھی۔ اس کے پاس صرف آخری دو موقع تھے۔ اس کے بعد اس کا انجام صرف اور صرف موت تھا۔

عمران‘ ناصر اور شاہد کی دوستی کالج میں آکر ہوئی۔ وہ جلد ایک دوسرے کو جاننے لگے اور پھر خاص دوست بن گئے۔ عمران کی طبیعت ناصر اور شاہد کے مقابلے تھوڑی سادہ تھی۔ وہ ان کی طرح شریر نہیں تھا اور بچپن سے ہی ڈرپوک اور خوفزدہ رہنے والا تھا۔ ایک مرتبہ اسے ڈر لگا تو ماں نے پیرومرشد سے تعویذ لاکر ہمیشہ کے لیے اس کے گلے باندھ دیا۔ ناصر اور شاہد اس کا مذاق اڑاتے مگر وہ انہیں سمجھاتا۔

’’زندگی کے کسی موڑ پر بھی ڈر سے سامنا ہوسکتا ہے اور یہ تعویذ ہمیشہ میری حفاظت کرے گا۔‘‘ اس کی ایسی باتیں سن کر وہ دونوں خوب قہقہے لگاتے تھے۔

اس مرتبہ طلبا کے پُرزور اصرار پر اساتذہ بالآخر ہری پور ٹرپ پر جانے کے لیے راضی ہوگئے۔ کچھ طلبا کا اصرار تھا دیگر مقامات کے علاوہ انہیں ہری پور کا خوفناک جنگل اور حویلی بھی دکھائی جائے جس کے بارے میں ہمیشہ سے ڈراؤنی

کہانیاں مشہور تھیں۔

شاہد اور ناصر کالج کے ٹرپ لے جانے کے فیصلے پر بہت پُر جوش تھے۔ عمران نے انکار کیا تو ان دونوں نے زبردستی اُس کا نام ٹیچر کو لکھوا دیا۔ کالج کے تمام طلبا اپنی اپنی بسوں میں ٹرپ کی طرف روانہ تھے۔

''ویسے ناصر یہ وہی ہری پور ہے نا جس کا ایک مخصوص علاقہ جنات کے قبضے میں ہے اور یہاں ایک خوفناک حویلی اور جنگل بھی ہے۔'' شاہد نے ناصر سے پوچھا۔

''ہاں......اور جو بھی اس حویلی میں جاتا ہے واپس لوٹ کر نہیں آتا۔'' ان دونوں نے عمران کو ڈراتے ہوئے کہا تو عمران سہم گیا۔ پھر دونوں نے زور دار قہقہہ لگایا تو عمران کو تسلی ہوئی وہ دونوں مذاق کر رہے ہیں۔

تمام طلبا نے کالج ٹرپ کو بھرپور انجوائے کیا۔ اس اثنا میں پرنسپل صاحب نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بتایا کہ آج رات وہ حویلی اور جنگل کا رخ کریں گے۔ یہ وہی حویلی تھی جس کے بارے میں مشہور تھا جو کوئی وہاں جاتا ہے اس کی لاش ہی واپس آتی ہے۔ تمام طلبا نے پرنسپل اور اساتذہ کو حویلی دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ان طلبا میں شاہد اور ناصر کا بڑا کردار تھا جو حویلی کو دیکھ کر عمران کو ڈرانا چاہتے تھے۔ اساتذہ نے حویلی دکھانے کی ہاں تو کر دی مگر اس شرط پر کوئی حویلی میں داخل نہیں ہوگا اور محض تصاویر ہی لی جائیں



گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا تمام طلبا نے اس بھیانک حویلی کی تصاویر لی اور دیکھتے ہی دیکھتے سب پر خوف چھا گیا۔ کچھ طلبا ڈر کے مارے بے ہوش ہو گئے تو ایمرجنسی صورت میں کالج ٹرپ کو شہر کا رخ کرنا پڑا۔ شاہد اور ناصر اپنی چال چلنے کے لیے تیار تھے انہیں اچھا موقع ملا تھا پھر انہوں نے اپنے ٹیچر کو میسج کر کے کہہ دیا تھا وہ بس میں ہیں۔ اس طرح وہ عمران کو بہانے سے چہل قدمی کرانے لے گئے۔

"یار اب میں پیدل چل کر اُکتا گیا ہوں۔ رات بھی کافی ہو گئی ہے چلو چلتے ہیں۔" عمران نے کہا۔

"کہاں چلتے ہیں؟" ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم سوری...... کالج کا ٹرپ واپس جا چکا ہے اور یہاں ہم تینوں کے سوا کوئی نہیں ہے اب ہمیں مجبوراً اس حویلی میں رات گزارنا ہو گی۔" شاہد نے عمران کو بتایا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ شدید غصے میں آ گیا۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ جیسے جیسے اندھیرا گہرا ہوتا ڈر کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مگر ناصر اور شاہد کے دل میں حویلی کو اندر سے دیکھنے کا تجسس ابھی بھی جاری تھا۔

"ناصر...... یہ بہت بڑی حویلی ہے...... مہاراجوں کے دور کی ہے۔ وہ سب تو مر گئے مگر کوئی نہ کوئی قیمتی ہیرے جواہرات تو چھوڑے ہوں گے۔ ہمیں اندر ضرور جانا چاہیے کیا معلوم لاٹری لگ جائے میرے یار۔" شاہد نے لالچ کا اظہار کیا۔

"تم نے صحیح کہا یہاں بہت قیمتی خزانہ ہے۔" ایک خوفناک آواز نے ان تینوں کے جسم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ تینوں نے یکدم پیچھے مڑ کر دیکھا ایک خوفناک عورت جس کے بال پاؤں تک لمبے تھے آنکھوں میں سوجن نمایاں نظر آ رہی تھی جیسے کئی سالوں سے سوئی نہ ہو اس کے گلے میں مختلف کھوپڑیوں کے بنے ہوئے مالا لٹک رہے تھے۔

"ک ک...... کون ہو تم؟" شاہد نے گھبراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

جیسے جیسے وہ اپنے قدموں سے چلتی شاہد کے قریب آ رہی تھی۔ ڈر اس کے پورے وجود میں پھیلتا جا رہا تھا۔

"بنگالی کالی......" اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"ہمارے قریب مت آؤ دور رہو ہم سے۔" تینوں نے یک آواز میں کہا۔

"گھبراؤ مت میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی مگر وہ تمہیں نہیں چھوڑیں گی۔"

"وہ کون......؟"

"حویلی کی بھیانک روحیں۔" اس نے پھر سے خوفناک قہقہہ لگایا۔

"بکواس بند کرو ڈھونگی عورت اور ہمارا راستہ چھوڑو ہمیں جانے دو۔"

تینوں کے دل خوف کی زد میں آ چکے تھے انہیں لگا شاید اس وقت یہاں سے جلد از جلد نکلنا ہی بہتر ہے۔ تینوں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اور تیزی سے بھاگنا چاہا مگر......

ان کے پاؤں خود بخود جکڑے جا چکے تھے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے پاؤں کسی نے جکڑ لیے...... میں نے کہا تھا نا مجھے ڈرانے کے لیے کوئی چال مت چلنا مگر تم دونوں نے میری نہیں سنی۔" عمران کا پسینے سے شرابور جسم دیکھ کر وہ دونوں بھی گھبرا چکے تھے۔

"اماوس کی کالی رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا ہے۔ تم لوگ یہاں آ تو سکتے ہو مگر جا نہیں سکتے۔" بنگالی کالی نے تینوں کی طرف گردن گھمائی۔

"خدا کا واسطہ ہمیں جانے دو۔ ہماری مدد کرو۔"

"تمہاری مدد کی کوئی صورت نہیں۔"

"کوئی راستہ تو ہوگا ہماری مدد کرو تمہاری مراد پوری ہوگی آمین۔" وہ بے بس ہو گئے تھے۔

"میری مراد......"

"جانتے ہو میری مراد کیا ہے؟" وہ تینوں تاسف سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ وہ غصے سے آگے بڑھی۔

"اس حویلی میں جنتر منتر کی ایک پرانی کتاب چھپی ہے جسے حاصل کرنا میرا مقصد ہے اگر وہ کتاب مجھے مل گئی تو میں اپنے چلے میں کامیاب ہو جاؤں گی یاد رہے اس حویلی میں اس جادوئی منتر والی کتاب کے علاوہ کئی قیمتی جواہرات بھی ہیں اگر تم انہیں حاصل کرلو تو تمہارا ہی فائدہ ہوگا اور میری مدد کرنے کے علاوہ تمہارے پاس کوئی اور راستہ نہیں اگر تم لوگوں نے منع کیا تو اپنے جادو سے ابھی موت کے گھاٹ اتار دوں گی۔"

بنگالی کالی نے پُراسرار انداز میں ان کے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔

وہ تینوں بری طرح خوف کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ مگر خزانے اور قیمتی جواہرات والی بات سن کر لالچ جاگ اٹھی۔ شاہد نے آگے بڑھتے ہوئے بنگالی کالی کو ہاں کی جبکہ ناصر اور عمران ابھی بھی خوفزدہ تھے۔

"شاہد پاگل مت بنو...... اس کی کوئی بات نہ مانو مجھے تو یہ خود کوئی ڈائن یا چڑیل لگتی ہے۔"

"بکواس بند کر لڑکے تم لوگوں کے پاس کوئی راستہ نہیں یاد رکھنا اس حویلی کے اندر برسوں پرانی روحیں ہیں اور وہ روحیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں میں تمہیں ان سے نبٹنے کی کچھ تدابیر بتاؤں گی۔ تم لوگ خزانہ اور جادوئی کتاب لے آؤ اس خزانے اور کتاب کو پانے کے لیے میں بہت سال ترسی ہوں آخر کار آج مجھے تم لوگوں کی مدد مل گئی تم لوگوں کا یہاں آنا میرے لیے خوش قسمتی ہے۔"

"بنگالی اگر ہم نے خزانہ حاصل کر لیا تو آدھا حصہ ہمارا ہوگا۔" شاہد نے پرزور انداز میں کہا تو بنگالی نے قہقہہ لگا دیا۔

"میں تم لوگوں کو آدھا خزانہ دے دوں گی بس مجھے جادوئی کتاب کی ضرورت ہے جس سے میں حویلی کی روحوں کو اپنے قبضے میں کروں گی اور پھر عملیات کی دنیا کی رانی بنوں گی رانی......!" وہ چیخنے لگی۔

"مگر ہماری جان کو بھی تو خطرہ ہو سکتا ہے۔" ناصر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"حویلی کے اندر ایک بہت بڑی گھنٹی ہے تمہارے پاس یہ ایک طریقہ ہے تم اس گھنٹی کو بجا کر صرف ایک بار مجھے مدد کے لیے پکار سکتے ہو اور میں بھی ایک بار ہی آ سکتی ہوں۔"

"مگر ایک بار کیوں؟"

"کیونکہ میرے پاس اس حویلی یں جانے کا آخری موقع ہے اس سے پہلے میں نے کئی بار کتاب ڈھونڈنے کی کوشش کی نگران روحوں نے میرا برا حال کر دیا اور میں اپنے منتروں اور کیے گئے چلوں سے بچ گئی میرا ایک چلہ ہی مجھے حویلی میں داخل ہونے دے گا۔"

سب اس کی باتیں سن کر خوف کے مارے سکتہ میں آ گئے۔

پھر کالی نے انہیں احتیاطی تدابیر سے آگاہ کر دیا اور وہ حویلی کے بڑے گیٹ میں ڈرتے ڈرتے داخل ہو گئے۔ جیسے ہی وہ گیٹ کے اندر داخل ہوئے ایک خوفناک چیخ سنائی دی اور فوراً

گیٹ کڑ کڑاہٹ کی آواز دیتا بند ہوگیا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا وہ آگے بڑھے تو یکدم ساری لائٹس آن ہوگئیں اور حویلی جگ مگ کرنے لگی۔ وسط میں لگا بڑا جھومر جو ہر طرف روشنی بکھیر رہا تھا بے حد خوبصورت تھا۔

وہ تینوں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے۔ حویلی کے وسط میں دونوں طرف سیڑھیاں تھیں۔

وہ تینوں سوچ رہے تھے کہ الگ الگ راستے جائیں گے اتنے میں بند دروازے سے آتی آواز نے انہیں حیران کر دیا۔

''پلیز...... مجھے باہر نکالو خدا کے لیے میری مدد کرو۔'' یہ کسی لڑکی کی آواز تھی جو زور زور سے دروازہ پیٹتے ہوئے رو رہی تھی۔

''ضرور یہ کوئی چڑیل ہوگی۔'' عمران نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''بنگالی کالی نے ہمیں چڑیل سے محفوظ رہنے کی ترکیب بتائی ہے گھبراؤ مت چلو اس کمرے کی طرف۔''

دروازہ باہر سے بند تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو ایک لڑکی گھبرا کر باہر نکلی۔

''پلیز آپ لوگ مجھے بچالیں...... ورنہ وہ مجھے ماردے گی۔''

''کون؟ کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟''

''بنگالی کالی......''

''کیا؟''

''بنگالی کالی...... مگر وہ آپ کو کیوں مارنا چاہتی ہے۔'' تینوں حیران و پریشان کھڑے تھے۔

''وہ ایک ڈائن ہے جو میرا سر کاٹنا چاہتی ہے وہ اپنے چلے کو کامیاب کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی ہے اس کی موت کا راز ایک گھنٹی میں ہے۔''

''ہم جانتے ہیں۔''

''مگر ہمیں وہ کتاب بھی ڈھونڈنی ہوگی اس طلسمی کتاب میں بنگالی کالی کو مارنے کا طریقہ ہے۔''

''جلدی ڈھونڈو۔''

پھر سب لوگ الگ الگ سمتوں میں چل پڑے ناصر اور عمران ایک طرف ہولیے جبکہ شاہد اور لڑکی دوسری طرف چلے گئے۔ شاہد نے لڑکی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

''ویسے آپ کا نام کیا ہے؟'' شاہد نے پوچھا۔

''میرا نام سائرہ ہے۔''

''مجھے شاہد کہتے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

چلتے چلتے وہ بند کمرے میں پہنچے جس کا دروازہ اُدھ کھلا تھا وہ اُدھ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے وہاں دیکھا ایک بڑھیا جس کے سفید بال پاؤں تک لمبے تھے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے ہانڈی میں چمچ ہلا رہی تھی۔

''ک ک کون ہو تم......؟''

بڑھیا نے اپنی تین آنکھوں والی خوفناک شکل دکھائی تو سائرہ چیختے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''سائرہ جی رکیے' کچھ نہیں ہوگا میں اس سے چھٹکارے کا عمل جانتا ہوں۔'' وہ سائرہ کے پیچھے بھاگا مگر وہ کہیں گم ہو چکی تھی۔

اِدھر عمران اور ناصر ڈر کے مارے بمشکل چل پا رہے تھے اچانک نزدیکی کمرے سے بھاری آواز میں گانا گانے کی آواز آنے لگی وہ دونوں آگے بڑھے ہی تھے کہ یکدم انہیں ایک رسی نے گھسیٹتے ہوئے اندر پہنچا دیا۔

کمرے میں اندھیرا چھا گیا ان دونوں کو ایک دوسرے کے چہرے تک دکھائی نہ دے رہے تھے۔

"میرا گانا سنو گے؟" ایک بھاری خوفناک آواز نے اُن کی سماعتوں پر بم پھوڑا۔

"نہیں یہ کیا ہو رہا ہے؟" عمران چیخنے لگا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے زور سے باہر نکل آئے۔

بھاگتے بھاگتے وہ واش روم کے دروازے سے جا ٹکرائے۔ عمران پسینے سے بھیگ چکا تھا اس نے واش بیسن پر منہ دھویا اور شیشے میں چہرہ دیکھنے لگا۔ ایک لمحہ ہی گزرا تھا اسے لگا جیسے شیشے میں کوئی کالا سایہ ہو اس نے مڑ کر دیکھا تو وہاں ناصر کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شیشہ خون سے بھر گیا اور ہر جگہ پانی کی جگہ خون نکلنے لگا ان دونوں نے زور دار چیخ ماری اور واش روم سے بھاگ نکلے۔ بھاگتے ہوئے وہ شاہد سے ٹکرائے۔

"شاہد...... ہم مر جائیں گے...... بچا لو......"

"کچھ نہیں ہوگا ہمیں خزانے اور کتاب کو تلاش کرنا ہوگا خزانہ ہمارا ہوگا اور اس کتاب سے ہم بنگالی کالی کو ختم کر دیں گے اٹھو بھاگو اور جلدی سے وہ کتاب ڈھونڈو۔"

وہ دونوں شاہد کی ضد کے آگے مجبور تھے۔ روتے ہوئے وہ ایک پرانے تہہ خانے میں پہنچے جہاں اندھیرے میں کرسی ہل رہی تھی وہ آگے بڑھے۔

"بیٹا ڈرو نہیں ...... آگے آؤ طلسمی کتاب لے لو اور کالی کو ختم کر دو۔"

وہ دونوں خوش ہو گئے انہیں لگا طلسمی کتاب جلد ہاتھ لگ گئی اب جلد وہ چھٹکارا پا لیں گے۔

یہ کرسی پر بیٹھا ایک نارمل شخص تھا جو کتاب پڑھنے میں مگن تھا۔

"آؤ بیٹا...... یہ کتاب میرے ہاتھ سے لے لو۔" ناصر خوشی سے آگے بڑھا تو اس نے زور سے ناصر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جبکہ عمران دور کھڑا دیکھ کر رونے لگا۔

"بیٹا میری آنکھیں نہیں ہیں لاؤ اپنی آنکھیں دو...... دو مجھے......" اس نے پوری قوت سے اپنے لمبے ناخن ناصر کی آنکھوں پر مارے اس کی آنکھوں سے خون پھوٹ پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بوڑھا خوفناک قہقہہ لگا کر غائب ہو گیا۔

شاہد کافی دیر سائرہ کو ڈھونڈتا رہا مگر سائرہ نہ ملی چلتے چلتے وہ ایک پتھر کی مورت سے ٹکرایا یہ کچھ نایاب قسم کی مورت تھی اس کا شیطانی ذہن جاگا اور اس نے مورت کو موڑ کر دیکھا تو اس میں چابی اور نقشہ موجود تھا وہ خوشی کے مارے ہنسنے لگا۔

"مجھے خزانہ مل گیا...... مگر صندوق...... صندوق کہاں رکھا ہوگا۔" وہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگا اچانک اس کا پاؤں کسی وزنی شے سے ٹکرایا اور وہ گر گیا۔ اتنے میں سائرہ آئی اور اس نے شاہد کو سہارا دیا۔

"شاہد اٹھو۔" اس نے سہارا دے کر شاہد کو اٹھایا۔

"دیکھو سائرہ...... مجھے چابی اور نقشہ مل گیا اور وہ طلسمی کتاب اسی صندوق کے اندر ہے۔"

سائرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی۔

"وہ یہ کمرا بھاگتے ہوئے دیکھ چکی ہے۔"

"چلو سائرہ جلدی سے خزانہ اور کتاب لائیں۔"

"مگر......"

"مگر کیا؟"

''اس سے پہلے تمہیں وہ گھنٹی بجا کر بنگالی کالی کو یہاں بلانا ہوگا ہم اسے ختم کردیں گے اور پھر اکٹھے رہیں گے۔'' وہ مسکرادی۔

''ہاں سائرہ تم ٹھیک کہتی ہو چلو جلدی۔''

وہ پاؤں لنگڑاتا ہوا چلنے لگا اسی اثنا میں عمران اور ناصر بھی بھاگتے ہوئے حویلی کے وسط میں پہنچ چکے تھے۔

''کیا ہوا تمہاری آنکھوں کو؟'' وہ کانپ گیا۔

''ایک بدروح نے میری آنکھیں نکال لیں۔'' وہ چیخ اور بے بس ہو کر بیٹھ گیا۔

''فکر مت کرو تمہاری آنکھیں واپس آسکتی ہیں؟''

''کیسے؟''

''اگر ہم سب گھنٹی بجا کر بنگالی کالی کو یہاں بلائیں اور اسے ختم کردیں تو اس کتاب میں لکھے طلسم سے سب ٹھیک ہوسکتا ہے تمہاری آنکھیں دوبارہ واپس آجائیں گی۔''

پھر سب نے ہاتھوں سے وزنی گھنٹی ہلائی اور گھنٹی بجی۔

بنگالی کالی کی سرخ آنکھیں روشن ہوئیں اسے جس رات کا انتظار تھا وہ آچکی تھی وہ بھاگتی ہوئی حویلی میں داخل ہوئی۔

جیسے ہی وہ حویلی میں داخل ہوئی تمام لائٹس آف ہوگئیں۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا مگر حویلی میں لگی موم بتیوں کی ہلکی ہلکی روشنی سے کچھ کچھ نظر آرہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ چاروں بنگالی کالی کے گرد حصار بنا کر کھڑے ہوگئے۔

''ارے تم لوگوں نے یہ حصار کیوں بنایا ہے؟''

''تاکہ تمہاری موت کو دعوت دے سکیں۔''

''بکواس بند کرو تم لوگ ایک ایک کو جلا کر بھسم کردوں گی۔''

''سائرہ جلدی کرو کتاب سے منتر پڑھو۔''

''اے لڑکے اندھا ہے یا پاگل ہے کس کو بول رہا ہے؟''

''میں سائرہ سے کہہ رہا ہوں یہ ہمیں تمہاری موت کا منتر بتائے گی پھر تمہیں مار کر ہم یہ خزانہ حاصل کرلیں گے۔''

''یہاں کوئی لڑکی نہیں۔'' وہ بڑبڑائی۔

''بکواس بند کرو۔'' انہوں نے کانپتے ہوئے کہا۔

''تم لوگوں نے موت کو دعوت دے دی...... نہیں...... یہ نہیں ہوسکتا...... نہیں......'' کالی زور زور سے چیخنے لگی حتیٰ کہ اس کی آنکھوں سے خون بہنے لگا۔

کچھ ہی پلوں میں ان کے سامنے سائرہ کی شکل بدلنے لگی اس کے بال ہوا میں معلق تھے ہونٹ سلے ہوئے بند اور آنکھوں کی جگہ کالے گڑھے تھے وہ ہوا میں معلق ہوگئی دیکھتے ہی دیکھتے پوری حویلی میں کئی خوفناک روحیں واضح ہوگئیں وہ سب اُن کی موت کا شدت سے انتظار کررہے تھے۔

''سائرہ...... تم کون...... کون ہو؟''

''میں کوئی سائرہ نہیں...... چڑیلوں کی رانی ہوں اور میری اس حویلی میں جو بھی آتا ہے وہ کبھی زندہ واپس نہیں جاتا اور آج اس کالی کو بلانے کا طریقہ رنگ لے آیا یہ ہماری کتاب اور حویلی کا خزانہ چرا کر ہمیں اپنے قبضے میں کرنا چاہتی تھی۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔

وہ ڈائن ہوا میں معلق ہوگئی اور اس نے اپنے لمبے ناخنوں سے بنگالی کالی پر وار کیا اور پھر ایسا وحشت ناک منظر سامنے آیا جس کا انہیں یقین نہ تھا۔

ڈائن نے اپنے ہاتھوں کو کلہاڑی بناتے ہوئے بنگالی کالی کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اب اس کا خون آلود سر لے کر وہ پوری حویلی میں خوفناک قہقہے لگا رہی تھی۔

وہ تینوں بھاگتے ہوئے اوپر فلور پر آ پہنچے ناصر کی آنکھیں پہلے ہی جا چکی تھیں اسے کچھ نظر نہ آیا سائرہ ڈائن نے اسے بالوں سے پکڑا اور پھر تیز ناخنوں کو کلہاڑی بناتی اس کے سر کو تن سے جدا کر گئی۔

حویلی کی تمام روحیں خوفناک قہقہے لگا رہی تھیں۔ عمران اور شاہد بھاگتے ہوئے اوپری فلور کے ایک کمرے میں چھپ گئے۔ ڈائن کا قد پہلے سے لمبا ہو چکا تھا ہاتھ پاؤں بھی حد سے بڑھ گئے تھے۔

اس نے شاہد کو بالوں سے پکڑا۔

''میرے ساتھ ہمیشہ رہے گا نا......'' اس نے خوفناک قہقہہ لگایا۔

''پلیز مجھے چھوڑ دو......چھوڑ دو۔''

''ہاں تو بے شک میرے ساتھ رہے گا مگر جب تیری موت ہوگی۔'' ڈائن نے وحشت ناک طریقے سے اس کے سر کو تن سے جدا کر دیا بازو کندھوں سے جدا کر دیے گویا جسم کا ایک ایک ٹکڑا اپنی موت کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔

وہ عمران کی طرف بڑھ رہی تھی عمران نے آنکھیں بند کر کے موت کو یاد کرنا شروع کر دیا پھر اچانک اسے یاد آیا بچپن میں جب وہ ڈرتا تھا تو اماں نے پیر سے اسے تعویذ لے کر گلے میں ڈلوایا تھا اس نے گردن کو چھوا تو تعویذ لٹک رہا تھا۔ وہ خوش ہوا ڈائن اس کی جانب بڑھ رہی تھی اس کے ساتھ ہی حویلی کی تمام روحیں اکٹھی ہو کر عمران کو مارنے کے لیے بے تاب تھیں کمرے میں تمام بدروحیں اکٹھی ہو چکی تھیں۔

ناصر نے اِدھر اُدھر بھاگنے کا طریقہ ڈھونڈا بالآخر اسے ایک کھڑکی نظر آئی تمام روحوں نے اس کے گرد حصار بنا لیا تھا اس نے گلے سے تعویذ اتار کر سامنے کر دیا تو وہ دور جا گریں اتنے میں اس نے فلور سے چھلانگ لگائی۔ اس کی ٹانگیں بری طرح ٹوٹ چکیں تھیں وہ کسی سانپ کی طرح رینگتا ہوا حویلی سے باہر آنے لگا۔

اس کی آنکھوں سے وحشت اور خوف کے آنسو نکل رہے تھے۔ رینگتا رینگتا بمشکل وہ حویلی سے باہر آ گیا۔ کچھ دیر بعد فجر کی اذان ہو گئی اور لوگوں نے صبح دیکھا تو اسے اسپتال پہنچایا مگر وہ ہمیشہ کے لیے ٹانگوں سے معذور ہو چکا تھا۔ لالچ کی آگ میں اندھے ہو کر سب نے اپنی جان گنوا دی اس نے گلے سے لٹکے تعویذ کو دبایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اگر یہ تعویذ اس کے پاس نہ ہوتا تو شاید اس چڑیل کی بھیانک روح اس کا سر بھی تن سے جدا کر دیتی۔

ڈائن نے اپنے لمبے ناخنوں سے اس کی گردن پر وار کیا تو زور دار چیخ اس کے گلے سے برآمد ہوئی۔ آنکھیں کھولنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ یہ محض ایک خواب تھا۔ مگر حویلی کا وہ بھیانک واقعہ اس کے دوستوں کی موت اور چڑیل کا وار یہ سب اسے ہمیشہ خواب میں آتے' ایسے وحشت ناک خواب اور حویلی کا وہ واقعہ شاید عمران کو ہمیشہ ستاتے رہیں۔ مگر وہ اس حقیقت سے کبھی منہ موڑ نہیں سکتا تھا وہ پل پل اس لمحے کو پچھتاتا جب وہ سب حویلی میں گئے اور سب کی موت اس کے سامنے ہوئی اسے خود سے ڈر لگنے لگا جسم کانپنے لگتا اور ہر طرف وہی ڈائن دکھائی دیتی شاید اس کے مستقبل کی زندگی اسی ڈر کے سائے میں گزرے۔

☆☆......☆☆



قبولہ شریف سے ارسال کردہ سچا واقعہ

جنات کی معافی

اللہ نے نواب صاحب کو دنیا کی ہر نعمت سے نوازہ تھا مگر پھر بھی انہوں نے اپنے اجداد کی بنجر زمین کو ہموار کرنے کی ٹھانی یہ جانے بغیر کہ یہ کیوں کئی نسلوں سے ویران اور بنجر ہے

ایم حسن نظامی

نواب صفدر علی اپنی آخری منزل پر زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ کمزوری کی وجہ سے اس کا پورا وجود ساکت تھا۔ اس کا جسم سوکھ کر کانٹا بن چکا تھا اور اس کی ہڈیاں وجود سے واضح نظر آ رہی تھیں۔ اس پر غنودگی سی چھائی تھی مگر اس کے سینے میں آگ سی لگی تھی۔ پورا بدن کسی پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ اس کی سانسیں اٹکی ہوئی تھیں۔ لیکن اب جان دے کر بھی اپنے کیے کا ازالہ نہیں کرسکتا تھا کہ موت دھیرے دھیرے اس کے اعصاب پر مسلط ہو رہی تھی۔ اب اس کے ڈوبتے ابھرتے ذہن میں سوائے لامحدود پچھتاوے کے کچھ نہیں بچا تھا۔ اسے اپنا پورا وجود لرزتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے جیون کی ڈوبتی ابھرتی کشتی زندگی و موت کے بھنور پر ہچکولے کھا رہی تھی۔

☆......☆......☆

نواب صفدر علی کے والد علی اسد علاقہ بھر کی بارعب اور معروف شخصیت تھے وہ پچاس ایکڑ اراضی کے تنہا مالک تھے گاؤں کے قریب ہی سر سبز باغ تھا۔ جس میں کینو، امرود، سیب اور جامن کے پیڑ پھلوں سے لدے رہتے تھے۔ دوسری طرف دو بیگھہ زمین میں ہر قسم کی سبزیاں، اور ذرا پرے دور تک بکھرے کھیت کھلیان جن میں گندم، مکئی، کماد اور کئی قسم کی پیداوار عروج پر تھی۔ اور اس زمین سے انہیں ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی میسر تھی۔ اور پوری بستی بھی اس میں محنت مزدوری کرتے ہوئے کوشاں تھی اور اس خوشحالی کیفیت میں بھی علی اسد کو دعائیں دیتے تھے۔

مگر اس لہلہاتی اور پرُ منظر آراضی میں دو ایکڑ زمین عرصہ دراز سے کم اونچے مگر ناہموار ٹیلے کی صورت بے آباد پڑی تھی جو پوری زمین اور اس کے حسن میں گویا گرہ تھی۔ نواب علی اسد جیسے ہی اس جگہ سے گزرتے انہیں بیکراں دکھ اور اذیت سے دوچار ہونا پڑتا اور وہ سوچ کر رہ جاتے کاش، یہ جگہ بھی ہموار کرتے ہوئے کاشت کے قابل بنائی جاسکے تو کس قدر آمدن زیادہ ہوگی۔ کئی بار

یہاں سے گزرتے ہوئے اُن کا ذہن بوجھل سا ہو جاتا اور سر چکرانے لگتا' جس کی وجہ سے وہ کئی کئی روز اِدھر کا چکر بھی نہ لگاتے۔

اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا وہ اس ٹیلے نما غیر آباد اور ویران جگہ پر آ کر بوڑھے پیپل کے گھنے پیڑ کے نیچے ذرا دیر کو ستانے کے لیے رکے پھر یہی بے آباد جگہ ان کی سوچ کی پرچھائیاں بنتا چلا گیا۔ اور پل بھر میں ان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے اور پورا وجود بوجھل سا ہو گیا انہوں نے سر جھٹکا اور ماتھا صاف کرتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے پھر اسے آگے بڑھا دیا۔

اسی شب نیم خوابی کے عالم میں ایک ہیولا سا نمودار ہوا اور بولا۔

''نواب صاحب' آپ بہت بڑے آدمی ہیں اور علاقے بھر میں آپ کی عزت اور شہرت ہے۔ آپ کی غیر آباد اور بنجر اراضی کے ٹیلے پر ہمارا بسیرا ہے اور ہمارے بچوں کا مسکن بھی' ہم کئی سو سالوں سے اس پر آباد ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ وہ جگہ آپ کی بھی زمینوں کی ہمواری اور حسن و خوبصورتی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے مگر آپ کشادہ دل اور وسیع سوچ کے مالک انسان ہیں۔ اگر اسے برابر کرنے کا خیال دل سے ترک کر دیں تو ہم اس کے بدلے میں اس کی پیداوار اور آمدن نشیبی فصلوں سے پوری کرتے رہیں گے اس طرح آپ کا نقصان بھی نہ ہوگا اور ہم بھی بے آباد اور ویران ہونے سے بچ جائیں گے۔



"ٹ......ٹھیک ہے مگر......آپ ہیں کون؟"

"ہم غیر مرئی یعنی آتشی مخلوق (جنات) ہیں اگر آپ لوگ ہمیں تنگ نہ کریں گے تو ہم بھی آپ کے شایانِ شان رہتے ہوئے فائدہ پہنچائیں گے۔" اسی اثنا میں اچانک لائٹ چلی گئی اور وہ روشنی کی پتلی سی لکیر کی صورت چلتی ہوئی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

نواب صاحب نے واقعی اسے آباد کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور فصل کی آمدن بھی دوگنی ہونے لگی۔ اب وہ جب بھی اس راستے سے گزرتے لبوں ہی لبوں میں اس مخلوق خدا سے سلام و دعا کرتے...... اور فضا میں خوشگواری کا تاثر اور ان کی طرف سے سلام کا جواب اور دعائیں بھی سنتے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ جگہ یونہی چھوڑ کر انہیں دلی سکون اور اطمینان سا ہوا۔ اب وہ پہلے سے کافی خوش اور جواں سے نظر آنے لگے۔ اِدھر انہوں نے پوری بستی اور اپنے خاص مزارعوں کو بھی کہہ دیا کہ اس جگہ جا کر کبھی کسی قسم کی بے ہودہ گفتگو اور گالی گلوچ نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گے...... تب سے گاؤں میں ہر طرح کا سکون اور خوشحالی برقرار تھی۔ اور کبھی بھی کوئی ناخوشگوار واقع نہیں ہو پایا تھا۔ سبھی ایک دوسرے سے بھائیوں کی طرح دکھ سکھ اور خوشیاں شیئر کرتے تھے۔

☆......☆......☆

نواب علی اسد کو فوت ہوئے کئی برس بیت چلے تھے۔ ان کا بیٹا صفدر علی اپنی گاڑی سے اسی جگہ سے گزر کر قریبی شہر جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اس ٹیلے کے قریب سے گزرنے لگا ایکدم ہی اسے وہی خیال ابھرا جو کئی سال پہلے نواب علی اسد کی سوچ کا مسکن بنا تھا۔ وہ کئی روز تک اس غیر آباد اراضی کے بارے میں سوچتا رہا طرح طرح کے خیالات کی سوچیں اس کے ذہن کی آماجگاہ بنتے چلے گئے۔ اور پھر ایک روز اس نے منشی صابر کو بلایا اور اس ناہموار ٹیلے کے متعلق سبھی باتیں اس کے گوش گزار کرتے ہوئے اس سے مشورہ لیا۔

"جو حکم جناب والا...... ویسے بائی داوے اگر زمین ہموار کرتے ہوئے برابر کر دی جائے تو سبھی پلاٹ صاف ستھرے اور جاذب نظر ہوں گے۔ اور آمدن میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔"

"تو پھر......" صفدر علی نے اسے مزید کریدا۔

"حضور...... دو ٹریکٹر ہمارے پاس ہیں ایک ساتھ کے زمیندار اکمل سے مانگ لیں گے پچاس سے زائد مزارعہیں یہ کام ایک دن میں نہ مکمل ہوا تو دوسرے روز ضرور ہو جائے گا تم یوں کرو منشی پورے گاؤں کو ہمارے منصوبے سے آگاہ کر دو اور دو دن بعد ہی ہم ٹیلا ہموار کر دیں گے۔ اگر کوئی آدمی کام پر ہے تو وہ اسے کام شام تک مکمل کر لے۔"

"او کے جی......" منشی اٹھ کر گاؤں والوں کو اطلاع کرنے چلا گیا۔

☆......☆......☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی نواب صاحب ڈیرے سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں آئے ابھی وہ سونے کی کوشش میں تھے اور بیڈ پر بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔

"کون؟" وہ ایکدم ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور تجسس سے پوچھا۔ اتنی دیر میں پھر سے دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔

"بھئی کون ہے کھولتا ہوں ذرا صبر سے کام لو۔" اور پھر جیسے ہی انہوں نے دروازہ کھولا

سامنے دیو ہیکل شخص لال انگارہ آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر چلا آیا۔ اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹھیے نواب صاحب......''

''آ...... آپ ...... کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟'' وہ لرز کر بولے۔

''میں غیر مرئی مخلوق یعنی جنات سے ہوں' عرصہ دراز سے آپ کی بے آباد اور بنجر ٹیلا ہمارا مسکن ہے۔ آپ نے اسے ہموار کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہے اسے دل سے نکال دیں بیس سال قبل تمہارے بزرگوں نے بھی یہ سوچا تھا مگر ہم نے اردگرد کی کاشت سے اس کی آمدن دینے کا نا صرف وعدہ کیا تھا بلکہ آج تک دوگنا کررہے ہیں۔ جس سے وہ راضی ہوکر خاموش ہوگئے تھے۔ آپ دیکھ نہیں رہے دوسری زمینوں سے گندم چالیس من فی ایکڑ ہورہی ہے اور ٹیلے کے آس پاس ستر اسی من اوسط ہورہی ہے۔''

''سنو نواب صاحب اگر ٹیلا آباد کرنے کا ارادہ ترک کردو تو اس میں تمہاری اور پورے گاؤں کی بھلائی ہے اور اگر تم اپنے فرسودہ خواب وخیال سے باز نہ آئے تو بہت بڑا نقصان اٹھاؤ گے جس کے تم خود ذمہ دار ہوگے۔ جس طرح تم اور تمہارے گاؤں والے پرُسکون زندگی گزار رہے ہیں اسی طرح یہ جگہ ہماری اور ہمارے بچوں کی وجہ سے آباد ہے اور کسی کو بے آباد کرنے والے کبھی سکھی ہرگز نہیں بسا کرتے اس لیے اپنی ناقص سوچ سے باز رہو' ورنہ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں اپنے انجام سے نہیں بچا سکے گی۔'' یہ کہہ وہ شخص کمرے سے نکلا اور فضا میں تحلیل ہوکر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

☆......☆......☆

زندگی میں رونما ہونے والے بعض واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں نہ تو سائنس تسلیم کرتی ہے اور نہ ہی عقل' دنیا و آخرت میں کامیابی کا انحصار صرف اسی بات پر ہے کہ ہم کس حد تک احکام الٰہی پر عمل پیرا ہیں۔ اپنے کسی بھی غلط رویے اور منفی سوچ کو دلائل سے صحیح ثابت کرکے ہم خود کو فریب تو دے سکتے ہیں مگر کامیاب ہرگز نہیں ہوسکتے۔

نواب صفدر علی منشی کی آمد پر کچھ پریشان سے تھے رات کا واقعہ انہوں نے اسے سنایا اور اپنے ارادے سے منع کرنا چاہا۔

مگر اس نے بجائے اس پر سوچ و بچار کرنے کے نواب صاحب کو آمادہ کرلیا کہ آپ صرف حکم دیں۔ جن بھوت کیا شے ہوتی ہے۔ انسان سبھی سے افضل اور اشرف المخلوقات ہے ہم اپنی ہی زمین آباد کررہے ہیں کونسی کسی کی زمین پر اجارہ داری کرنا چاہتے ہیں۔''

نواب صاحب نے ڈیرے پر مزارعوں کی جوق در جوق آمد دیکھی پھر ٹریکٹر' ہل' کراہ' ٹرالا سبھی حکم پر تیار پائے' چند لمحوں بعد ان کے اشارے پر دھیرے دھیرے سبھی ٹیلے کی طرف بڑھنے لگے۔

پھر جیسے ہی دو ٹریکٹروں سے ہل اور کراہ چلایا گیا۔ خون کے فوارے سے ابلنے لگے اور ہر سو چیخوں کی بھیانک آوازیں آکاش کی بلندیوں تک پھیلنے لگیں۔ آن کی آن میں مغرب کی طرف سے لال آندھی کی صورت گرد و غبار ٹیلے کی طرف بڑھنے لگی اور جلد ہی آسمان کا رنگ لال ہوتا چلا گیا۔ ہر طرف گرد و غبار اور اندھیرا سا چھانے لگا۔

ہل چلانے والے ٹریکٹر کے پچھلے دونوں ٹائر

ر دار دھماکوں سے پھٹ گئے اور ڈرائیور اچھل
ر دور جاگرا۔ دوسرا ٹریکٹر الٹ کر قلابازیاں
ھاتا ہوا خشک پتوں کی طرح دوسری زمین کے
ہرے کھال میں جاگرا۔ اس کی ٹینکی میں آگ
نے سے وہ زور دار دھماکے سے پھٹ گئی۔ اور
ر دور تک آگ و خون کی ہولی بکھرنے لگی۔
ماکے کی خوفناک آواز بھی مزارعوں کو پریشان
رتی فضا میں تحلیل ہو کر پھیلنے لگی۔ کئی ایک بے
وش ہو گئے کچھ ٹریکٹروں کے نیچے اور کچھ آگ
ی لپیٹ میں آگئے۔ جو بچے تھے ان کے حوصلے
ست ہو گئے۔ وہ اپنی کدالیں اور بیلچے وہیں
چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

"ہمارے ہاتھ سے تم میں سے کوئی بھی نہیں
چ پائے گا۔ ہم تمہارا نام و نشان مٹا دیں گے
نسان کے بچے...... تم نے ہمارے بچوں کا ناحق
خون کیا ہے۔ ہم تمہارا خون پی لیں گے۔
تمہارے بچوں کو ذبح کر دیں گے۔"

آوازیں اس قدر بھیانک اور کرخت تھیں
کہ ہر ذی روح کو ان سے خوف آنے لگا۔ کبھی
کانپتے اور گڑگڑانے لگے اور کئی ایک بھاگتے
ہوئے گر کر سدا کے لیے خاموش ہو گئے۔ کچھ لوگ
اپنی یادداشتیں کھو بیٹھے اور عمر بھر کے لیے اذیتوں
سے دوچار ہونے لگے۔

☆......☆......☆

نواب صفدر علی کی پوری کوٹھی کسی زلزلے کی
مانند متحرک تھی۔ عالی شان اور اپنی نوعیت کی منفرد
یہ کوٹھی نواب اسد کے باپ نے نا جانے کتنے
سالوں میں روپے پانی کی طرح بہا کر مکمل کروائی
تھی۔ پوری حویلی میں دراڑیں ہی دراڑیں اور
گہری کھائیاں سی پڑ گئیں اور سب سے اوپر والی
منزل کے دونوں کمرے اور ٹینکی کی اینٹیں اڑا کر
پورے گاؤں اور اس کے باسیوں کو زخمی کرنے
لگیں۔ کئی ایک کچے مکان منہدم ہو گئے ہر طرف
آہ و بکا اور قیامت صغریٰ برپا ہو گئی۔

نواب صاحب اس موجودہ صورت حال سے
بھونچکا رہ گئے اور پھر ان کے سامنے وہی دیوہیکل
خونی بلا لمبے لمبے دانت نکالے رونما ہوئی۔

"سن لو نواب صاحب' ہمارے منع کرنے
کے باوجود تم نے ہمارے معصوم بچوں پر ہل چلا کر
ان کا ناحق خون بہایا ہے۔ تمہیں ہماری طاقت کا
اندازہ نہیں شاید...... ہم تمہیں اور تمہاری پوری
بستی کے باسیوں کو تباہ و برباد کر دیں گے۔ تم نے
ہمارا مسکن اجاڑا ہے ہم سے ہمارے بچے چھینے
ہیں ہماری ہنستی بستی نگری بے آباد کی ہے اور
تم...... تم اب خوش رہ سکو گے نہیں...... ہرگز نہیں
ایسا کبھی نہیں ہو گا۔"

اس دیوہیکل آسیبی مخلوق نے طیش میں آ کر
اپنے لمبے ہاتھ صفدر علی کی گردن میں حائل کر دیے
اور اسے کسی کرین کی مانند اٹھا کر چھت تک لے
گیا اور پھر اسے ایکدم ہی چھوڑ دیا۔ وہ دھڑام
سے فرش پر کمر کے بل جاگرا اور اس کی قمر کی ہڈی
تراخ سے ٹوٹ گئی نیچے گرتے ہی وہ زور زور سے
اپنے نوکروں اور بیوی کو آوازیں دینے لگا۔ مگر
اس کے کراہنے کی آوازوں تک کوئی بھی نہ پہنچ
سکا۔ اس کا پورا وجود دھکنے لگا تھا اور پھر جلد ہی اس
کی نگاہوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی ذرا دیر
بعد اسے اپنا کچھ پتہ نہ چلا وہ اوندھے منہ کمرے
کے فرش کی چٹائی پر بے حس و حرکت ہوتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

گاؤں کا ہر فرد رات سوتے ہوئے ہڑبڑا کر
اٹھ بیٹھا اسے اُسی طرح اپنے گھر میں ہر سو آگ
اور خون ہی خون دکھائی دیتا' اور دن کے اجالے

میں کبھی روڑے اور پتھر بارش کی صورت برسنے لگتے تو کبھی زمین تھرتھرائی ہوئی محسوس ہوتی۔ کسی جگہ آگ لگی ہوئی تو کہیں پانی ہی پانی بھرنے لگتا۔ وہی لوگ محفوظ رہتے جو مسجد میں ہوتے' تبھی ہر شخص پناہ کے لیے خدا کے گھر مسجد کی طرف ہی بڑھنے لگا۔ مگر مسجد کا احاطہ بھی اس قدر زیادہ وسیع نہیں تھا کہ پورا گاؤں اس میں سما سکتا آخر کار امام مسجد نے کہا۔

"ساتھیو! نواب صاحب اور ہم سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے اس کے ازالے کے لیے ہمیں اس آسیبی مخلوق کی منت سماجت اور خیرات کرنا ہوگی ہمیں اس مخلوق کو قطعی طور پر راضی کرنا ہوگا اگر ایسا نہ کیا تو پوری بستی تباہ و برباد ہو جائے گی یا پھر جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے گی۔

☆......☆......☆

صبح سویرے ہی گاؤں کے بزرگ بچے بچیاں اور عورتیں قرآن مجید کا ورد کرتے ہوئے لڑکیاں بالیاں سروں سے دوپٹے اتارے اپنی گردنوں میں حائل کیے سبھی ہاتھ باندھے اس آسیبی ٹیلے کی طرف بڑھے' بزرگوں نے اپنی بزرگی اور سفید بالوں کا واسطہ دیا بچیاں آنسو بہائے روبرو ہوئیں۔ عورتیں اپنے سر ننگے کرتے ہوئے آہ وزاری کر رہی تھیں۔ پھر ایک بزرگ آگے بڑھے اور ہاتھ باندھ کر گزارش کی۔

"اے مخلوق خدا...... ہمارا بھلا کیا قصور ہے ...... ہم تو نواب صاحب کے مزارعے اور غلام ہیں۔ اور اسی کے حکم پر ہم ٹیلے کی طرف بڑھے اور اسی کے اشارے پر سبھی کچھ ہوا۔ ہم سبھی اپنی عزتیں آبرو لے کر بڑی امید و آس سے آپ کی طرف آئے ہیں۔ آپ ہمیں ہمارے بے گناہ اور معصوم بچوں کو معاف کر دیں۔"

پیپل کے بوڑھے پیڑ میں تھرتھراہٹ سی ہوئی۔ اور بہت سی آسیبی مخلوق جن کا قد کاٹھ بہت ہی ہیبت ناک اور خونخوار سا تھا وہ عجیب و غریب جسامت میں رونما ہوا اور ان کی طرف غصیلے انداز سے بڑھنے لگا ابھی انہوں نے اپنے لمبے لمبے اور خونی پنجوں والے ہاتھ آگے بڑھائے ہی تھے کہ آواز آئی۔

"ٹھہرو......" اور وہ سبھی ایکدم ہی رک گئے اس اثنا میں ایک بارعب اور خوبصورت جسم والا شخص انسانی روپ میں آگے آیا اور بولا۔

"اے ابن آدم...... اے اپنے آپ کو اشرف الخلوق کہلوانے والے سنو! ہم بھی اسی خدائے بزرگ و برتر کے پیداوار ہیں۔ ہم بھی اسی دھرتی پر رہتے ہیں۔ ہماری بھی ضروریات زندگی ہیں مگر ہم نے بے جا کبھی کسی کو تنگ ہرگز نہیں کیا اور نہ ہی کبھی ہم نے کسی کا برا سوچا ہے۔"

"خود اپنے آپ گریبانوں میں جھانکو' تم ...... تم تو اپنے بھائیوں کو' اپنی بہنوں کو اور اپنے ماں باپ کو بھی کبھی معاف نہیں کرتے۔ اپنے دل کی ہوس کی خاطر وہ سبھی کچھ کر گزرتے ہو کہ خدا کی پناہ' تمہیں کسی کی عزتوں کا ذرا بھر خیال نہیں' شرم و حیا کی چادریں اتار چکے ہو۔ دل کی خواہشوں کی خاطر اپنوں کا خون کرنے سے بھی ذرا دریغ نہیں کرتے۔ کوئی اپنی تجوریاں بھر رہا ہے تو کوئی اپنی خواہشوں کا غلام ہے۔ مکروفریب' دہشت گردی' قتل و غارت' ناجائز کمانا' کھانا' چوری ڈکیتی' راہزنی کیا کچھ عیب اور محرومیاں خامیاں تم میں نہیں ہیں۔

"تمہارا دین تو دین حق ہے یہ تو...... یہ تو امن و سکون عجز وانکساری اور مساوات کا درس دیتا ہے۔ یہ تو سبھی انسانوں کو بھائی بھائی کا سبق سکھاتا ہے۔ حلیمی

دباری اور تحمل اس کا اصول ہے صراط مستقیم اس کی
ہ ہے اور سچائی جذبہ ایمان ہے۔"
"مگر...... تم تو خونی ہوس اور جھوٹی شان و
وکت بڑھاتے ہوئے ہر حد سے گزر رہے ہو...... تم
یوانوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہو' ہم نے تو
ری بستی کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا
گر...... مگر ایسا کریں تو پھر تمہارے اور ہمارے
میان کیا فرق رہ جائے گا۔"

"یہ بیبیاں یہ معصوم بچیاں اور یہ والی دو جہاں
ر آن مجید بھلا کیا کہیں گے۔" اس نے قرآن پاک
ا بوسہ لیا اور فرمایا۔

"جاؤ' ہم نے تمہیں معاف کیا مگر...... پھر بھی
ول کر بھی اپنی غلط سوچ اور سفاکی سے اس ٹیلے کی
رف مت بڑھنا' ورنہ عمر بھر کا پچھتاوا تمہارا مقدر بن
ائے گا' اور تم کبھی چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں رہو
گے۔"

سبھی گردنیں جھکائے اس کی باتیں بغور سن
ہے تھے۔ وہ بزرگ چند قدم پیچھے ہٹے اور پھر مڑ کر
لے۔

"یاد رکھو' اس وقت ہم نے خوف خدا سے تم سبھی
اؤں والوں کو معاف کر دیا ہے مگر نواب صفدر کے
لیے ہم سے کبھی فریاد ہرگز نہ کرنا' اس کا انجام ہم
رور کریں گے۔ اسے ہم تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔
م اسے ضرور سبق سکھائیں گے کہ کسی کے ہنستے
سکراتے آشیانوں کو جلانے والے کبھی سکھی نہیں بسا
کرتے۔" یہ کہہ کر وہ انسان صفت چند قدم چلا اور
ر ہوا میں تحلیل ہو کر پھیلتا چلا گیا اور سبھی گاؤں
الے سر نہوڑے خاموشی سے واپس چلنے لگے۔

☆......☆......☆

نواب صفدر علی زندگی و موت کی آخری منزل پر
ا اس پر غنودگی سی چھائی تھی۔ اس کے اعصاب ذرا
نارمل ہوئے پھر اس نے آنکھیں کھولنے میں پوری
طاقت صرف کر دی وہ ذرا سی وا ہوئیں تو اس نے ارد
گرد کا جائزہ لیا اپنے آپ کو اسپتال کے بیڈ پر پایا۔
اس نے ہلنا جلنا چاہا مگر اس کا وجود متحرک نہیں
ہو سکا۔ دھیرے دھیرے اسے سبھی کچھ یاد آنے لگا۔
وہ آوازیں آہ و بکاہ آگ و خون کی ہولی' دھماکے'
لال آندھی' اور ہر سو چیخ و پکار صاف اور واضح سنی
جانے لگیں۔ اور پھر غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ جڑ
سے گئے۔ اور زبان سے دعائیہ کلمات اور ٹوٹے
پھوٹے الفاظ طاری ہونے لگے۔

"اے میرے پروردگار مجھ سے غلطی ہوئی ہے
مجھ...... مجھے...... معاف...... کر دے' میں...... میں
نے تیری مخلوق کو بلاشبہ تنگ کیا ہے۔ یہ دولت کی
ہوس تھی شاید یا اپنی پگ اور آن و شوکت اونچی رکھنے
کی چاہ...... میں تجھے تیرے پیارے کا واسطہ دیتا
ہوں...... بلاشبہ تو بخش دیتا ہے مجھے...... مجھے معاف
کر دے......"

"ہاہاہا...... کرواتے ہیں معاف تجھے......" بہت
سی آوازیں اسپتال کی وسیع و عریض بلڈنگ کے باہر
اور اندر اس کمرے میں اسے سنائی دینے لگیں۔ اور
پھر ایکدم ہی بہت بڑا ہجوم دروازے کے راستے اس
تک بڑھنے لگا۔ اور وہ اپنے آپ کو ہواؤں میں
فضاؤں میں اوپر ہی اوپر بندھے ہاتھ پاؤں سے
یونہی تیرتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ پھر ہلکی سی کراہ کی
آواز اس کے لبوں سے پھسلی اور وہ ایک بار پھر گم سا
ہوتا چلا گیا۔ اسے اپنی کچھ خبر نہ رہی۔

☆......☆......☆

یہ کوئی غیر ملکی اسپتال تھا جہاں اسے علاج کی
خاطر لایا گیا تھا اور اس کا چچازاد اس کی تیمارداری اور
عیادت پر تھا۔ اور اس کی نگہداشت بھی وہی کر رہا
تھا۔ دھیرے دھیرے اسے سبھی کچھ معلوم ہونے

لگا۔ اور پھر وہ خود بھی اسے ملامت ہی کرنے لگا۔ روپے پیسے اس کے علاج پر بارش کی مانند خرچ کیے جانے لگے۔ اس کا علاج انتہائی نگہداشت روم میں ہوتا رہا مگر زیادہ دن یونہی بے حس و حرکت پڑے رہنے اور ریڑھ کی ہڈی نہ جڑنے سے اس کے پورے وجود میں کینسر جیسا موذی مرض پھیلنے لگا۔ بالآخر ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے کر ہاسپٹل سے ڈسچارج کردیا۔ اس کا چچا زاد اسے دوسرے کئی ایک اسپتالوں میں لیے پھرتا رہا مگر...... کسی ماہر ڈاکٹر نے بھی اس کی سلامتی اور صحت یابی کی ہامی نہ بھری۔

اِدھر گاؤں کے بھی باسی دھیرے دھیرے بیمار ہونے لگے اور وہ کئی کئی روز تک علاج کے باوجود بھی نہ اٹھ سکے۔ جو بچے کچھے رہ گئے تھے وہ پاگل یا پھر اپاہج ہوگئے۔ یوں ایک انسان کی ہوس پرستی سے پورا گاؤں بے آباد اور ویران ہونے لگا۔

اور پھر اس روز آخیر ہوگئی۔ جب نواب صفدر علی کا بے جان وجود ہیلی کاپٹر کے ذریعے بستی لایا گیا۔ اس روز کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہوئی ہو کوئی وجود ایسا نہ تھا جو خوفِ خدا سے تھرتھرایا نہ ہو۔ اور کوئی دل ایسا نہ تھا جو اپنے کیے پر پشیمان نہ ہوا ہو۔

سچ ہے کہ کسی کو برباد کرنے والے کبھی آباد نہیں ہوا کرتے' زمینیں یونہی پڑی رہ جاتی ہیں اور اس پر بسنے والے' غرور تکبر کرنے والے کئی فرعون' نمرود اور شداد جیسے اس دھرتی سے کوچ کرجاتے ہیں۔ وہ یہ ہرگز نہیں سوچتے کہ ہمیں بھی ایک روز خاموشی کی چادر اوڑھ کر اسی میں سمانا ہے۔ اگر بھی انسان سوچ ذرا پختہ کرلیں تو کوئی بھی نواب صفدر علی کی خونی ہوس کی بھینٹ ہرگز نہ چڑھے' اور نا ہی کوئی مخلوق خدا تباہ و برباد ہو۔

☆☆......☆☆

کراچی سے ارسال کردہ مختصر مگر بالکل سچی پُراسرار تحریر

اور پھر نقی مر گیا...

جنات اکثر پالتو جانوروں کی شکل میں انسانی بستیوں میں رہتے ہیں اور ایسے میں اگر اُن کے ساتھ زیادتی ہو جائے تو وہ جان لے کر ہی جان چھوڑتے ہیں......

نفیسہ فضل محمود

قارئین کرام! یہ قصہ جو تحریر کر رہی ہوں سو فیصد سچا حقیقت پر مبنی ہے یہ قصہ آج سے غالباً 5 سال پرانا ہے۔ ہم دہلی کالونی مدنی آباد میں رہتے تھے۔

میرے بچپن کا بہت وقت وہاں گزرا دہلی کالونی میں پنجابی سوداگران کی اکثریت تھی وہیں تقی حلوائی کی دکان تھی مجھے آج بھی یاد ہے چونی لے کر دو گلاب جامن کھاتی تھی ان کی بیگم سے ہمارے گھر والوں کے بہت اچھے تعلقات تھے۔

نانی اماں کی تو وہ بیٹی بنی ہوئی تھیں غالباً ان کے چار بچے تھے بڑا بیٹا کوئی 14 سال کا تھا اسکول سے آ کر اپنے والد کی دکان پر چلا جاتا تھا تقی حلوائی کی بیگم اکثر و بیشتر اپنی امی کے گھر چلی جاتیں تھیں کھانا وہ دونوں وقت کا صبح ہی بنا لیتی تھیں۔

پنجابی سوداگران میں صبح ہی دونوں وقت کا کھانا پکتا ہے جب میں سولہ سال کی ہوئی تو بیاہ کر لاہور چلی گئی دو ماہ بعد میکے آئی سب بہت خوش تھے باتیں ہو رہی تھیں تب ہی نسیم بھائی مرحوم نے کہا۔

''تمہیں پتہ ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''کیا......؟'' تو بولے۔

''تقی حلوائی کے بیٹے نقی کا انتقال ہو گیا۔''

''ہیں وہ کیسے......؟'' میں حیران ہو گئی۔

''اسے بخار ہوا تھا۔''

''تو ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟'' میں نے پوچھا۔ بھائی بولے۔

''چل پگلی کیوں نہیں دکھایا کئی ڈاکٹر بدلے پھر اسے بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے سب گھر والے بہت پریشان تھے۔

ڈاکٹرز کی سمجھ سے باہر تھا ہر طرح کے ٹیسٹ کروائے گئے اب اس کے دوروں کے دوران عجیب آوازیں آتی تھیں وہ کہتا۔

''یہ مجھے نہیں چھوڑیں گے بچالو مجھے' میری امی ہائے میرے ابو......'' ماں باپ تڑپ جاتے آخر کسی نے کہا۔

''کسی مولوی یا کسی عامل کو دکھاؤ......'' تب جا کے انہوں نے مولانا اسماعیل کو بلایا وہ کراچی سے باہر گئے ہوئے تھے دو دن بعد آئے تو انہوں نے نقی کو دیکھ کر پڑھائی شروع کی۔

اس دوران میں بھی وہیں تھا جب مولانا پڑھ رہے تھے اچانک ہی نقی نے بہت بھاری آواز میں بولنا شروع کیا۔

''ہم اِس کو تڑپا تڑپا کے ماریں گے جس طرح اس نے ہمارے بچے کو مارا ہے۔'' مولانا صاحب نے کہا۔

''اس بچے نے تو کسی کو نہیں مارا۔'' نقی بولا۔

''ایک ہفتہ پہلے یہ گھر میں اکیلا تھا ایک بلی کا بچہ گھر میں آ گیا۔''

''اس نے اسے بھگا دیا بچہ تو بچہ ہوتا ہے وہ بار بار آ جاتا تھا۔ اس نے سل کا بٹہ اُٹھا کر اُسے مار دیا وہ شدید زخمی ہو گیا۔ ہم نے اس کا بہت علاج کرایا۔''

''مگر وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا اب ہم نے بھی اس کا وہی حال کرنا ہے۔ ہم قوم اجناء سے ہیں اور بچے کا انتقام ضرور لیں گے۔''

مولانا صاحب نے اس کی بہت منت سماجت کی مگر وہ نہ مانے دو دن بعد نقی مر گیا۔

اُس کی گردن ایسے تھی جیسے کسی نے مروڑ دی ہو مجھے سن کر بہت دکھ ہوا اور نقی کے ایصال ثواب کے لیے دعا کی۔

☆☆......☆☆



اسلام آباد سے بھیجی گئی انتہائی دہشت ناک کہانی

موت کا پنجہ

جن جب کسی پر عاشق ہو جائے تب اپنے ساتھ ہی لے

جاتا ہے اگر اللہ کے نیک بندے کا قرب حاصل نہ ہو تو......

حمیرا وحید

''ہیلو ناہید کیا ہو رہا ہے؟''

''یار حمزہ کو ابھی ابھی سلا کر کچن کی طرف آئی ہوں حمزہ کو بخار ہے اس لیے صبح سے کوئی کام نہیں کرنے دیا۔''

''ناہید پلیز تھوڑی دیر کے لیے میرے گھر آ جاؤ۔ میں سخت پریشان ہوں۔ صبا کی طبیعت رات سے پھر خراب ہے ایک دفعہ رات کو ڈاکٹر یاسر سے چیک کروایا ہے۔ شام کو پھر اس کے پاس لے کر جانا ہے اس لڑکی کی کیفیت میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''اچھا تم پریشان نہ ہو۔ جیسے ہی حمزہ اٹھے گا میں اسے لے کر تمہارے پاس آ جاؤں گی۔'' اس نے بہت رسانیت سے کہا۔

ناہید نے جلدی جلدی کچن کا کام سمیٹا اور حمزہ کو لے کر شاہدہ کے گھر پہنچ گئی۔ شاہدہ صحن میں بیٹھی رو رہی تھی۔

''ہوا کیا صبا کی طبیعت زیادہ خراب ہے بچوں کی طرح کیوں رو رہی ہو؟''

''یار دیکھو میری بچی کو کیا ہوا ہے اس نے خود کو کمرے میں بند کیا ہوا ہے اور کمرے سے عجیب وغریب قسم کی آوازیں آ رہی ہیں۔ میرے دل میں عجیب وسوسے آ رہے ہیں۔''

ناہید نے اٹھ کر دروازے کو زور زور سے دھکیلا لیکن دروازہ کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر اس نے صبا کو باہر سے ہی نہایت پیار سے سمجھانا شروع کیا۔

''پیاری بیٹی دروازہ کھول دو دیکھو تمہاری مما رو رہی ہیں اور تمہارے بارے میں سخت پریشان ہیں۔ دروازہ کھول دو۔'' اندر سے زور زور کے قہقہوں کی آواز آنا شروع ہو گئی۔

''میں ایک شرط پر باہر آؤں گا جب تم اس لڑکی کی شادی مجھ سے کر دو گی ورنہ تمہاری بیٹی کو جان سے مار دوں گا۔''

شاہدہ اور ناہید نے جب یہ آوازیں سنیں تو دونوں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ کیونکہ ایسا انہوں نے کتابوں میں پڑھا ضرور تھا لیکن حقیقت میں بھی

دیکھا نہیں تھا۔ پھر ناہید نے ہمت کی اور صبا کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''بیٹا دروازہ کھولو ہم تمہاری ہر بات مانیں گے جیسا تم کہوں گی ویسا ہی ہوگا۔'' چند لمحے بعد ہی صبا نے دروازہ کھول دیا۔ صبا کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر نقاہت اور تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ شاہدہ بھاگ کر بیٹی سے لپٹ گئی پھر ناہید اور شاہدہ نے مل کر صبا کو بیڈ پر لٹا دیا اور بڑے پیار سے اس کا سر سہلانے لگیں۔

تھوڑی سی دیر میں صبا کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند میں سوگئی پھر ناہید نے شاہدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو شاہدہ اب اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ صبا پر کسی آسیب کا سایہ ہے اب اس کا میڈیکل علاج چھوڑو اور اسے کسی روحانی شخصیت کو دکھاؤ تاکہ اس کا علاج ہوسکے۔''

شاہدہ نے نہایت افسردگی سے اپنی دوست کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

''تمہارے بھائی بشیر ایسے بھوت آسیب پر بالکل یقین نہیں رکھتے میں پہلے بھی ان سے اس موضوع پر بات کرچکی ہوں لیکن وہ اس موضوع پر بات کرنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں ہیں اور انہوں نے مجھے اس ٹاپک پر دوبارہ بات کرنے سے سختی سے منع کر دیا ہے۔''



"چلو تم ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھ لو اگر انہوں نے تمہاری بات نہ مانی تو پھر میں انہیں سمجھاؤں گی۔"

"ناہید تمہارا بہت شکریہ' تمہارے ہونے سے مجھے بہت ڈھارس ملی ہے۔

وہ میں بیان نہیں کر سکتی ورنہ جوان بچی کی یہ کیفیت میں کسی دوسرے سے بیان نہیں کر سکتی۔ پھر تمہیں پتہ ہے جتنے منہ ہوتے ہیں اتنی ہی باتیں ہوتی ہیں۔"

"ایسی باتیں کر کے تم غیروں جیسا مجھے سمجھتی ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے اگر میں غیر سمجھتی تو تم سے ایسا معاملہ کبھی شیئر نہ کرتی۔"

"چلو چھوڑو ان باتوں کو اب مجھے اجازت دو اللہ حافظ۔" ناہید نے حمزہ کو گود میں اٹھایا اور رخصت ہو گئی۔

ناہید کے جانے کے بعد شاہدہ نے کمرے میں جا کر دیکھا صبا گہری نیند کی آغوش میں سو رہی تھی اس نے جلدی جلدی کھانا تیار کرنا شروع کیا کیونکہ صبا کی بیماری کی وجہ سے آج اس کے گھر کا کوئی کام نہیں ہوا تھا۔

وہ کچن میں تھی دروازے پر بیل ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے فیصل کھڑا تھا۔ صبا کا بڑا بھائی فیصل جو سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہے۔ وہ کالج سے آ چکا تھا۔ اتنے میں اس کے ابو بھی آ گئے۔ بشیر صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے صبا کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تو شاہدہ نے آج ہونے والا سارا واقعہ ان کے گوش گزار کر دیا۔

شاہدہ کی بات سن کر وہ آگ بگولہ ہو گئے۔

"تم عورتوں کے پاس سوائے جادو' ٹونوں اور بھوت پریت' آسیب کے اور کوئی بات ہوتی ہے کرنے کے لیے' جب دیکھو ایسی باتیں لے کر بیٹھ جاتی ہو۔"

شاہدہ نے ڈانٹ کھا کر اور کوئی مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"رات کو صبا کو شہر کے معروف ماہر نفسیات کے پاس لے کر جائیں گے' تیار رہنا۔" شاہدہ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے بشیر احمد بولے۔

شام کو سو کر صبا جب اٹھی اُس کی کیفیت پہلے سے کافی بہتر تھی اور وہ نارمل دکھائی دے رہی تھی۔

پھر رات تقریباً نو بجے بشیر صاحب بیٹی اور بیوی کو لے کر جا رہے تھے ایک جھٹکے سے ان کی گاڑی رک گئی۔

انہوں نے نیچے اتر کر گاڑی کا معائنہ کیا لیکن کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔

"صبا کے پاپا...... صبا کو دیکھیں۔ صبا کو کیا ہو رہا ہے۔" جیسے ہی شاہدہ کی آواز بشیر صاحب کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ بھاگ کر گاڑی کے اندر پہنچے اور دیکھا صبا کی آنکھیں پھیلی ہوئی ہیں۔

اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہے ہیں اور حلق سے عجیب و غریب آوازیں آ رہی ہیں۔

"صبا بتاؤ کیا ہوا؟"

"مجھے بتاؤ کیا تکلیف ہے......" ایک دم صبا کا چہرہ خوفناک نظر آنے لگا۔ اور اس نے اپنے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں تمہاری بیٹی کا گلا گھونٹ کر اسے مار دوں گا۔"

"تم کون ہو اور میری بیٹی کے ساتھ ایسا

کیوں کر رہے ہو؟''

''میرا تعلق جنات سے ہے مجھے تمہاری بیٹی پسند آ گئی ہے' تمہارے گھر میں شیشم کا جو پرانا درخت لگا ہوا ہے میرا اس پر برسوں سے بسیرا ہے اس شام تمہاری بیٹی اس کے نیچے بال سکھا رہی تھی میری نظر اس پر پڑی اور میرا دل اُس کا دیوانہ ہو گیا۔ اب میں اسے حاصل کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

''خدا کے لیے میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دو' میری کم سن بچی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ پلیز میری بیٹی کی زندگی سے چلے جاؤ۔'' زور زور سے قہقہے ابھرنے لگے اور پھر ساتھ ہی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ صبا پر غنودگی طاری ہو گئی۔ بشیر صاحب نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی اب آسانی سے اسٹارٹ ہو گئی۔

انہوں نے سیدھا اپنے مرشد کے دربار پر رخ کیا جو تحصیل گوجر خان کے ایک نواحی علاقے میں موجود تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کی مسافت طے کر کے بشیر صاحب اپنے پیر و مرشد کے دربار پر پہنچے سب سے پہلے دربار پر حاضری دی۔ بچی کی صحت کے لیے دعا مانگی۔ اچانک سے صبا کی طبیعت پھر خراب ہونا شروع ہو گئی۔ وہ فوری طور پر صبا کو لے کر دربار سے ملحقہ مسجد میں موجود سجادہ نشین پیر صاحب کے پاس پہنچ گئے اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

پیر صاحب نے بچی کو اپنے پاس بلا کر قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا۔ جیسے جیسے پیر صاحب دم کرتے اور قرآنی آیات پڑھتے ویسے ویسے صبا کی طبیعت زیادہ خراب ہونا شروع ہو گئی اور اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

اُس کی آواز میں ایک عجیب سی طاقت آ گئی۔

''میں نے کہا تھا نا کہ مجھے اس سے جدا کرنے کی کوشش نہ کرنا اور میں اس کی جان لے کر رہوں گا۔''

''پاپا کوئی میرا گلا دبا رہا ہے مجھے بچا لیں پلیز......'' پھر زور زور سے قہقہے ابھرنے لگے۔

''میرے ساتھ دھوکہ کیا اب اس کا انجام دیکھو۔'' اس کے ساتھ صبا کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی بشیر صاحب اور شاہدہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

پیر صاحب نے انہیں تسلی دیتے ہوئے دلاسہ دینے کی کوشش کی اور ان سے کہا کہ آپ لوگوں نے آنے میں بہت دیر کر دی اگر کوئی اس قسم کا مسئلہ ہو تو مریض کو ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر ضرور جائیں لیکن روحانی علاج کے لیے کسی قابل اعتبار شخص کے پاس لے کر جانا چاہیے یہ بات صحیح ہے کہ جعلی پیروں' فقیروں نے اس اعلیٰ منصب کو بدنام کر دیا ہے لیکن اب یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے جو پیروں پر آپ کی بے اعتباری کی وجہ سے ہوا یہ کہہ کر پیر صاحب خاموش ہو گئے صبا کے والدین کی آہیں اور سسکیاں سن کر دربار میں موجود ہر شخص جواں سال بچی کی وفات پر رنجیدہ اور آبدیدہ ہو گیا۔

بشیر صاحب آسیب اور جنات کو نہیں مانتے تھے اور ایسی باتوں پر یقین کرنے والوں کو راسخ العقیدہ تصور کرتے تھے۔

مگر آج اپنی اولاد کو کھو کر انہیں اندازہ ہوا کہ قرآن میں جنات کا ذکر ہے اور ان پر یقین کرنے والا بالکل عقیدے پر وہ غلط تھے اسی لیے ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔

☆☆......☆☆

لاہور سے ارسال کردہ ناقابل یقین واقعہ

وہ لوٹ آیا

زیادتی کا شکار ہونے والا بچہ مر تو گیا تھا مگر پھر وہ لوٹ آیا' ایسے بچے اپنے قاتل کے پاس ضرور پلٹتے ہیں اور پھر تِل تِل مارتے ہیں......

ماہ وش طالب

میں نے اپنے پچیس سالہ کیریئر میں کبھی خود کو اتنا بے بس اور تھکا ہوا محسوس نہیں کیا تھا جتنا کہ آج کر رہا ہوں...... دفتر میں اس وقت کوئی بھی نہیں ہے۔

شام کے اندھیرے سایہ فگن ہونے کو ہیں۔ میں حسب معمول بوسیدہ کاغذات کھولے کیس کی پیچیدگیوں میں الجھا بیٹھا ہوں...... نجانے کس کی نظر لگ گئی ہے کہ میں کبھی نہ ہار ماننے والا آج ہمت ہار رہا ہوں اور مجھے پہلی بار یہ کیس ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہو رہا ہے' حالانکہ میں ہمیشہ سے ہی دوستوں اور دشمنوں کے رولر کوسٹر میں جھولتا رہا تھا مگر اس بار محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی مجھے اس جھولے سے زور سے پٹخنا چاہتا ہے' مگر کون تھا' ایسی سنگین دشمنی تو میں نے کبھی کسی سے نہیں پالی۔

یکدم فائل میں سے کچھ کاغذات اڑ کر دور جا گرے' میں چونکا۔

ہوا میں اچانک تیزی آئی تھی خنک ہوا کی سرگوشی کرتی آواز اور کھڑکی پر لٹکے پردوں نے مجھے خیالوں کے سیارے سے باہر نکالا۔

پھر بکھرے کاغذات سمیٹنے کو میں جیسے ہی آگے بڑھا تو بری طرح سے ٹھٹک گیا' کھلی فائل میں کاغذات پر جو ریکارڈ درج تھا' اسے اور مجرم کی تصویر دیکھ کر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے قبل ان کاغذات پر یہ تصویر میں نے کبھی اٹیچڈ نہیں دیکھی' شدید ٹھنڈ کے باوجود مجھے پسینہ آنے لگا

☆......☆......☆

میں عرصہ پچیس سال سے کرائم انویسٹگیشن کے شعبے سے وابستہ تھا' یہ کیس میرے پاس تین سال قبل آیا تھا اس سے قبل یہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے سب سے مستند تفتیش کار مسٹر جارج کے پاس تھا مگر اس دورانیے میں یہ معمہ ان سے بھی حل نہ ہوسکا یہاں تک کہ ان کی ریٹائرمنٹ کا وقت آگیا۔ یوں یہ کیس لٹک گیا اور تین سال قبل ایک مظلوم دوبارہ جب اسی کیس کے متعلق ضروری معلومات لے کر آیا تو اس کیس پر نظرِ ثانی کرنا ناگزیر ہوگیا اور اپنی نوعیت کے اس پیچیدہ ترین کیس کو حل کرنے کی ذمہ

داری مجھ پر آگئی شروع شروع میں یہ کیس میرے لیے انوکھا اور دلچسپ تھا جو بعد میں جا کر میرے لیے کسی جینئس کے تیار کیے گئے جگسا پزل سے بھی زیادہ کنفیوز کر دینے والا ثابت ہونے لگا
اس کیس کی سب سے چونکا دینے والی بات مجرم کا عجیب و غریب ریکارڈ تھا...... culprit کی فائل میں اس کی عمر بیس سال درج تھی جبکہ پروفائل میں لگی تصویر کسی چالیس سالہ مرد کی تھی۔
میرے کولیگز نا صرف اس معمے پر خاموش تھے بلکہ حل طلب نظروں سے مجھے دیکھتے تھے بہر حال یہ شخص چھوٹے بچوں کی زیادتی کے جرم میں ملوث تھا۔
گو کہ شکایت درج کرانے والا وکٹم بھی ڈیڑھ سال سے غائب تھا، یعنی دوبارہ اس کی جانب سے کوئی درخواست درج نہ ہوئی تھی۔ مگر یہ کیس دراصل میری ضد بن گیا تھا، مجھ پر سب نے اعتماد کیا تھا لہٰذا مجھے ان کے مان اور اپنی ساکھ کو چکنا چور ہونے سے ہر حال میں بچانا تھا۔
دوسری پریشان کن اور چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ وہ شخص مفرور بھی نہیں تھا ایجنسی کے ریکارڈ کے مطابق اس شخص کا پاسپورٹ تک نہیں بنا ہوا تھا۔
بلکہ کچھ لوگ تو پُر یقین تھے کہ وہ نیوجرسی کے ہی نچلے طبقے کے کسی قصبے میں رہائش پذیر ہے۔
جبکہ اس کی فائل میں درج اس کا مکمل پتا کچھ اور تھا، جہاں اب اس کی غیر موجودگی سی آئی اے یا



پولیس کے کسی بھی افسر کے لیے ہرگز غیر معمولی نہ تھی۔

پھر وہ کہاں تھا اس سے پہلے کہ میں مزید الجھتا مجھے اس کیس میں پہلی پیش رفت ہوتی محسوس ہوئی جب میں نے اسے کیمڈن کے ہی ایک چھوٹے سے محلے میں ایک گھر کی پستہ سی عمارت پر کھڑے دیکھا' میں اپنی کولیگ اسٹیف کے ساتھ تھا اور اسی کیس کے سلسلے میں سراغ لگا رہا تھا جب اچانک میری نگاہ اوپر گئی وہ وہی تصویر والا آدمی تھا میں نے اسے سگریٹ پھونکتے دیکھا' سرمئی رنگ کا کارڈیگن پہنے وہ بھی اب مجھے گھور رہا تھا

''اسٹیف سامنے' اوپر دیکھو۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے کے بغیر اس کی جانب توجہ دلائی۔

''خدا کا خوف کرو فلپس مانا کہ میری عمر بھی زیادہ ہو رہی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کسی ڈھلتی عمر کے شخص کے ساتھ اپنی باقی کی زندگی بتا دوں۔''

وہ باقاعدہ برا مان گئی تھی جبکہ میں الجھ گیا دراصل کچھ دیر پہلے ہم دونوں اسٹیف کی شادی کی بابت گفتگو اور چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے' سو میری توجہ دلانے کو وہ اسی چھیڑ چھاڑ کا حصہ سمجھ بیٹھی۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو......اسے دھیان سے دیکھو۔'' میں نے اوپر نگاہ کی تو خود بھی چونک گیا۔

اب وہاں کوئی نہ تھا' میں اسٹیف کو وہیں چھوڑ گھر کی جانب چلا گیا شناختی کارڈ دکھا کر میں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

''آپ اپنے خاوند کو بلا دیں۔'' میں جلد از جلد دوبارہ اس آدمی کو دیکھنا چاہتا تھا لہٰذا کسی قسم کی تمہید کے بغیر پوچھ بیٹھا' پہلے تو اس نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا پھر بیڈ روم کی طرف منہ کر کے اپنے شوہر کو آواز دینے لگی۔

''جان' جان...... باہر آؤ۔'' وہ بوڑھا ایک ہاتھ سے سر کو کھرچتا ڈھیلی چال چلتا باہر آیا اور استفہامیہ انداز سے مجھے گھورنے لگا۔

اسٹیف میری پیروی کرتی اندر آ چکی تھی۔

''نہیں جو اوپر تھے میں ان کی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے اس بالکل مختلف خدوخال والے بوڑھے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اس گھر میں' میں اور میرے شوہر جان ہی رہتے ہیں۔ آپ ہمارا وقت ضائع مت کریں اپنی تلاش کہیں اور جا کر کریں۔''

وہ چالیس کے پیٹے میں داخل ہوتی خاتون اب بالکل بیزار نظر آ رہی تھی۔

میں حیرت میں گھرا باہر آ گیا۔

''اسٹیف میرا یقین کرو ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے اس مجرم کو اوپر چھت کے کنارے پر دیکھا تھا۔'' ایسا کہتے ہوئے اپنے لہجے کا کھوکلا پن میں نے خود بھی محسوس کیا تھا۔

''تم کو کیا ہو گیا ہے فلپس......تم اتنے جلد باز مت بنو۔''

شاید وہ صحیح کہہ رہی تھی...... میں جلد بازی میں ایک سنکی بوڑھے پر اس کا گمان کر بیٹھا تھا۔

پھر دوسری مرتبہ میں نے اسے نیویارک کے ایک بڑے سے بار میں دیکھا میں اپنے ہندوستانی دوست رنگولی کے ساتھ تھا جب ہاتھ میں پیگ پکڑے وہ بغور میری آنکھوں میں دیکھتا سامنے سے گزرا...... پہلے پہل میں نے اسے اپنی خام خیالی سمجھا پھر اگلے ہی لمحے چونک گیا۔

میری آنکھیں اتنا بڑا دھوکہ دوبارہ کیسے کھا سکتی ہیں۔ مجھے اس وقت بہت عجیب محسوس ہوا تھا میں رنگولی سے معذرت کر کے اس کے پیچھے بھاگا' وہ بار

سے باہر جا رہا تھا میں اپنی گاڑی میں سوار ہو کر اس کا
تعاقب کرنے لگا' سگنلز پر گاڑی رکی تو مجھے اپنے
اوسان خطا ہوتے محسوس ہوئے اب اسی گاڑی کی
اسی اگلی نشست پر ایک نوجوان شخص بیٹھا فون پر کسی
سے بات کر رہا تھا...... قبل اس سے کہ میں اس کو
روکتا وہ دائیں جانب مڑ گیا۔

میں نے محسوس کیا اُس غائب ہو جانے والے
شخص کی شکل کچھ میری جیسی تھی جیسا میں آنے
والے 10 سالوں میں لگ سکتا تھا۔

اور یہ عجیب و غریب اتفاق آخری بار نہیں ہوا
تھا...... تیسری مرتبہ مجھے وہ شخص نیو جرسی کے ہی
ایک مشہور تفریحی مقام پر نظر آیا تھا اور چوتھی بار میں
نے اسے ہوائی اڈے کی انتظار گاہ میں دیکھا تھا
تب میرے ساتھ ہلٹن بھی تھا مگر قبل اس سے کہ وہ
بھی اسے دیکھ پاتا وہ ڈیپارچر کی جانب بڑھ گیا
اور میں اسے دوبارہ ڈھونڈنے میں پھر سے ناکام
رہا۔

تھک ہار کر میں نے اپنی ساری الجھن اسٹیف
کے گوش گزار کی اسٹیف جو میری مزاج آشنا بھی تھی
اور دفتر میں گزاری جانے والی میری بیشتر تنہا راتوں
کی ساتھی بھی۔

''تم اس وقت ٹینشن میں ہو...... یہ ممکن ہی
نہیں کہ وہ مجرم نیو جرسی میں پناہ لیے بیٹھا ہو۔
دیکھو فلپس! اس کیس کو خود پہ سوار مت کرو......
یہ سوچ کے نجانے اس مشکل اور اعصاب شکن کیس
کو سلجھاتے سلجھاتے تم اپنا سابقہ بہترین ریکارڈ
برقرار رکھ پاؤ گے یا نہیں تمہیں ہوش و خرد سے بیگانہ
کر رہی ہے۔'' اسٹیف نے بڑی تلخ حقیقت بڑے
آرام سے میرے سامنے رکھ دی تھی اور میں اس
ٹھٹھرتی رات ٹھنڈا ہو کر اپنے دفتر میں بیٹھ رہا۔''

مجھے اس بلڈی اسٹیف کی بدلحاظی پر غصہ تو بہت

غزل

جو نہیں ہے' اسی کا رونا ہے
غم کا رونا' خوشی کا رونا ہے

سن' یہ رونا نہیں گرانی کا
یہ تو بے قیمتی کا رونا ہے

سچ تو یہ ہے کہ کچھ نہیں بس میں
ہے تو بس بے بسی کا رونا ہے

نامرادی تُو کیا رلائے گی
جستجو کی کمی کا رونا ہے

دلِ برباد نے کیا برباد
دلِ برباد ہی کا رونا ہے

یعنی رونا ہے زندگی بھر کا
جو گھڑی' دو گھڑی کا رونا ہے

جو کسی بات پر نہیں آتی
آج بھی اس ہنسی کا رونا ہے

اجمل سراج

آیا مگر...... نجانے کیوں خاموش رہا۔

جبکہ وہ کافی حلق میں اتارنے کے بعد وہاں سے چلی گئی۔

☆......☆......☆

پھر مختلف سوچوں میں غلطاں میں جب چونکا تو رات کی تاریکی چھٹ کر صبح کے ملگجے اندھیرے کا سواگت کررہی تھی۔

حیرت انگیز طور پر فائل میں اب کسی چالیس سالہ آدمی کی جگہ ایک دس سالہ بچے کی تصویر لگی ہوئی تھی اور صرف چند پل لگے تھے مجھے اس بچے کو پہچاننے میں وہ دس سالہ جونی...... یا میرے خدایا۔

اب مجھے نیو جرسی کے سرد خانے میں جانا تھا...... اکیلے...... اسٹیف اور ہلٹن میں سے کسی کو بھی ساتھ لیے بغیر......

سرد خانے کے داخلی احاطے کی سامنے والی دیوار پر ایک پراسرار پینٹنگ آویزاں تھی جس کے نیچے بہت دلچسپ کیپشن درج تھی مگر اس وقت مجھے محسوس ہوا جیسے یہ میرے لیے لکھی گئی ہے۔

Some bodies died but their souls remain alive to take revenge...

اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس آرٹ کے نمونے اور اس معنی خیز فقرے کا یہاں کیا کام تھا اور جلد ہی مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

ڈاکٹر پیکر کی معیت میں اس کمرے میں داخل ہوا جہاں جونی جیسے کئی بچوں کا ریکارڈ برسا برس سے محفوظ تھا۔

''مسٹر فلپس، یہ بچہ آٹھ سال کی عمر میں زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔''

دو سال تک یہ شدید ذہنی اور جسمانی دباؤ کا شکار رہا...... خودکشی کی کوشش نے اس کو مزید بے بس کردیا تھا جبکہ اس کے والدین نے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد اپنی اپنی دنیا بسا رکھی تھی یوں تنہائی کی زنجیر سے بندھے اس بچے کی لاچاری سے ایک بار پھر فائدہ اٹھایا گیا اور دس سال کی عمر جب اسے دوبارہ زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تو وہ تکلیف کی تاب نہ لاسکا اور اپنی زندگی کی بازی ہار گیا ڈاکٹر حقائق اور میری حالت سے بے خبر مجھے تفصیلات سے آگاہ کررہا تھا۔

میرا دم گھٹ رہا تھا اور میں جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا...... کیونکہ اس بچے کو موت کے منہ تک دھکیلنے والا وہ مجرم میں تھا۔

میں فلپس اگسٹ جس نے بیس سال کی عمر میں نشے سے چور حالت میں تنہائی سے فائدہ اٹھا کر ہوس کے زور پر دس سالہ جونی کو زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد تڑپتا چھوڑ دیا تھا...... جونی میرے ساتھ ایک بار میں ڈیلی ویجز پر کام کرتا تھا...... پولیس کے خوف سے میں نے اسی رات نیو جرسی چھوڑ دیا اور دوسری جگہ رہائش اختیار کرلی تھی۔

اگلے ہفتے میرے ہاں دس سال بعد بیٹے کی ولادت متوقع تھی اور انتقام کی آگ میں جلتی اس روح سے اب چھٹکارا پانا میرے لیے ناممکن تھا۔

''مگر میرے جرم نے میرا کسی بدروح کی طرح پیچھا کیا'' اور مجھے ایک بار اس غلاظت میں ڈبو دیا جہاں سے اپنے تئیں میں نکل چکا تھا میں اپنا گناہ بھول چکا تھا۔

مگر اب میں روز جیوں گا اور روز مروں گا کیونکہ جونی کی روح مجھے ہر جگہ نظر آنے لگی ہے۔ میں خوف زدہ ہوں کیونکہ 10 سال بعد میرے بیٹے کی ولادت متوقع ہے کہیں جونی اُس کو لینے تو نہیں آیا......؟''

☆☆......☆☆

سلسلے وار ناول

ایک نہایت ہی منفرد دلچسپ پُراسرار سلسلہ جسے آپ عرصۂ دراز تک یاد رکھیں گے

املتاس

علامہ سید اجتبیٰ حسین رضوی کا خیال

اس دل کا تحیر تھا آئینہ' اس سر کا تصور تھا موقلم
تمثال پہ نقطے لگا کیے' تصویر بدلتی چلی گئی

(قسط نمبر 13)

شازلی سعید مغل

اس وقت جنگل میں سید صاحب کے مکان کے گرد لگے شاہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ میں ایک عجیب وغریب چوپال منعقد تھی۔ جیسے سننے والے ہی نہیں بلکہ اگر کوئی دیکھنے والی آنکھ بھی ہوتی تو وہ بھی اُس کو آنکھوں دیکھا خواب سمجھتی۔

لیکن سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟ انسان جو سمجھ نہ سکے دیکھ نہ سکے ضروری نہیں کہ وہ وجود میں ہی نہ ہو...... ہوتا ہے ایسا ممکن ہے۔ یہ دنیا عجائب خانہ قدرت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کارخانہ قدرت میں کیا کیا کچھ بنا کر دنیا میں بھیج رکھا ہے۔ عام انسانی ذہن یا آنکھ اُس کا مشاہدہ تو دور کی بات اُس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اور یہ لاعلمی ہے اس لیے جب بھی عجیب' حیران کن عقل سے ماوراپُر اسرار ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہمارے آس پاس بستی وہ دنیائیں جن کا ایک عام انسان سوچ بھی نہیں سکتا کبھی آشکار ہو ہی جائیں قدرت کی مرضی سے اپنی مرضی سے تو ہم انسان جو بڑے عالم فاضل بنتے ہیں ان عقل سے ماوراان دیکھی ان جانی دنیاؤں کو سمجھنے کے بجائے دیکھنے والے یا بتانے والے کو مخبوط الحواس سمجھنے لگے ہیں۔ مگر ایسی کج نگاہی کم فہمی لاعلمی سے حقیقت کائنات بدل تو نہیں سکتی؟ جو کائنات میں ہے وہ اپنا اپنا حصہ رکھتا ہے۔

اور آج اس جنگل میں ایسی ہی مخلوق بہت بے چین ہو کر جمع ہوئی تھی۔ مہاگنی کے تراشیدہ نقوش والا سب سے لمبا قد اور نمایاں شخصیت رکھنے والا ان سب کے درمیان ایسے کھڑا تھا جیسے کوئی لیڈر ہو...... سید صاحب کے مکان سے جو اَن دیکھی شور مچاتی مخلوق نکلی تھی وہ شب تاب تھے ننھے ننھے قمقموں کی طرح وہ جا کر شاہ بلوط کے درختوں پر جڑ گئے اور کچھ اس کے اردگرد چکر کاٹنے لگے۔ جس درخت کے اونچے تنے پر وہ بیٹھی تھی۔ جنگل کے سارے مکین سید صاحب کی غیر موجودگی میں اس صورتحال پر غم وغصہ کا شکار نظر آرہے تھے۔ وہ صدیوں سے اس جنگل میں رہتے چلے آرہے تھے نسل در نسل ایک دوسرے کا تعارف تھے۔ یہاں ایک پوری دنیا آباد تھی انوکھی اور پُراسرار اُن کے اپنے قوانین اپنی روایتیں اور اپنے موسم تھے



ر اس انوکھی انسانی عقل سے ماورا دنیا کی سب سے اہم اور لازمی روایت تھی وفاداری دوست داری، نسانوں کے علاوہ جتنی بھی دوسری مخلوق قدرت نے بنائی ہے وہ وعدے کی پابند ہوتی ہے۔ وہ وعدہ چاہے یسا ہی کیوں نہ کیا گیا ہو...... نہایت افسوس ناک امر یہ ہے کہ انسان میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ وہ عدہ خلافی کر جاتا ہے مگر دوسری دنیاؤں میں ایسا کوئی تصور نہیں۔

وہ آتم کے اونچے تنے پر آ کر اتری تھی۔ شب تاب اس کے گرد تیزی سے چکر کاٹ رہے تھے۔ شاہ وط کی راہ نمائی میں پورے چاند کی روشنی میں جمع ہوئی جنگل کے باسیوں کی نظریں آتم (پیپل کے رخت) پر لگی ہوئی تھیں کرشن کلی اور کوکاش سب سے آگے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ فضا میں تیرتی نیچے اتر آئی۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں شنگرف چاند کا ٹکڑا معلوم ہو رہی تھی۔ حزن ملال اس کے چہرے کا خاصہ تو تھے ی مگر اس وقت تکلیف کے آثار کچھ زیادہ گہرے تھے۔ جنگل میں سید صاحب موجود نہ تھے اور جب تک وہ نہ چاہیں ان سے رابطہ نہیں کیا جا سکتا تھا حسب سابق وہ اپنے کسی لمبے دورے پر گئے ہوئے تھے۔

ان کے پیچھے پورے جنگل کا انتظام وانصرام نادیدہ ہستیوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بھی بلوط (مہاگنی کے تراشیدہ نقوش والا) کے سامنے تھی۔ کیا ایسا ممکن تھا بلوط کیا ایسی جرأت کرنی چاہیے تھی اس جادوگرنی کو...... شنگرف کی آواز شدت غیض وغضب سے لرز رہی تھی۔

''سید صاحب کے ہوتے ہوئے...... جن لوگوں کے پاس تمہاری امانت ہے انہوں نے بے احتیاطی کردی ہے...... لاپرواہ ہیں سید صاحب اس میں کیا کریں۔'' زنگی گل نے کہا۔

''اس سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔'' کرشن کلی نے شنگرف کو تسلی دی۔ شاتک اور کوکاش نے بھی زنگی گل کی تائید کی۔

''تم کیا کہتی ہو شنگرف......'' بلوط نے اس کے دوستوں کی تجویز سن کر کہا۔

''میں سب کچھ کرلوں گی...... تم لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں یہاں آنا بھی نہیں چاہتی تھی تم لوگ میرے لیے پریشان مت ہو اس قدر......''

''ٹھیک ہے...... بلوط اگر یہ خود کو آزمانا چاہتی ہے تو اسے آزمانے دو۔'' کہیں دور سے ایک گونجدار آواز گونجی سب کی نگاہیں آواز کی جانب اٹھ گئیں۔

''ویسے بھی کوئی کسی کا پابند نہیں ہے ہاں مگر مقرر کردہ حد بندیاں سب کے لیے ہیں کوئی تجاوز کرتا ہے تو اسے بھگتنا پڑے گا...... آزمائش شرط ہے۔'' آواز سن کر جنگل کے باسیوں میں ہل چل مچ گئی تھی۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اُن کی بات کا جواب اس طرح آ سکتا ہے۔

☆......☆......☆

باہر سے آتی کھٹر پٹر جمن دادا کی پاٹ دار سی آواز کے ساتھ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس کے سر پر کھڑے اسی کو پکار رہے تھے۔

''جلدی اٹھ کھڑے ہو باہر تمہارا دوست سمیر آیا ہے۔''

''سمیر آیا ہے؟'' اورنگزیب اٹھ بیٹھا تھا۔ سمیر کے نام کے ساتھ رات کا منظر اور ان لوگوں کا طے شدہ پروگرام سب یاد آ گیا۔

"اوہ...... اچھا...... دادا میں آتا ہوں فریش ہو کے۔" اورنگزیب واش روم، جمن دادا کچن کی طرف ہولیے۔ سمیرا تنا اچھا نوٹنکی ہے اورنگزیب کو آج اس کے اس ہنر کا معلوم ہوا جب اس نے باہر کا منظر دیکھا۔

"تم جب تک چاہو یہاں رہو بیٹا دو چار دن کی بات کیوں کرتے ہو...... تمہارا اپنا گھر ہے...... اور یہ چار جوڑے کیوں رکھ لائے ہو شام میں جا کے سارا سامان لے آؤ اپنی ضرورت کا......"

"جی بہتر آنٹی......" سمیر سر جھکائے انتہائی معصوم شکل بنا کر مودب بیٹھا تھا۔ اورنگزیب کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا وہ سمیر کی مکاریاں سمجھ تو رہا تھا اُسے کچھ زیادہ ہی اس معاملے سے دلچسپی ہو رہی تھی تنہائی ملتے ہی اورنگزیب نے اسے جالیا......

"یہ کیا کہانی گھڑ رہے ہو میری ماں کے سامنے......"

"مابدولت آئے آپ کی مرضی سے ہیں پر جائیں گے اپنی مرضی سے ہاہاہاہا......" سمیر نے اوور ایکٹنگ شروع کر دی۔

"زہر لگ رہے ہو تم بلکہ اس وقت سب سے بڑا آسیب تو تم ہی لگ رہے ہو۔" اورنگزیب کو یہ بے وقت کا مذاق پسند نہیں آیا۔

"ارے ارے ناراض کیوں ہوتے ہو میرے بھائی...... تسلی رکھو فیصل اور ہم رات بھر تمہارے مسئلے کے لیے بھاگے بھاگے پھرے ہیں...... تم تو یہاں محو استراحت تھے۔ لنکا والے چچا نے تو لنکا ڈھائی ہوئی ہے آج کل...... میرا مطلب ہے کوئی اتا پتہ نہیں جناب کا لیکن، لیکن مابدولت ایک بندے کو جانتے ہیں وہ اس سلسلے میں ہماری مدد ضرور کر سکتا ہے۔"

''اوہ اچھا...... پھر کب ملنا ہے اُس سے......''

''شام میں عصر سے مغرب کے درمیان......'' سمیر نے اورنگزیب کی بات کے جواب میں کہا۔

''یار میں سچ میں تم لوگوں کا شکر گزار ہوں میں کیسے شکریہ ادا کروں۔'' اورنگزیب اپنے دوستوں کے اس خلوص سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اسے پتہ نہیں تھا اس کے دوست اس طرح اُس کے لیے رات بھر مارے مارے پھرے رہیں گے۔

''اچھا بس......''

''اوہ...... یار وہ بندے عطر والے بابا کہلاتے ہیں' تمہیں اس نے نہیں بتایا کیا؟'' فیصل نے سمیر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ویسے وہ ڈاکٹر کلامی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔'' سمیر نے ایک اور انکشاف کیا۔

''اوہ یہ بھی کوئی وہی ویسے ہی......'' اورنگزیب کا اشارہ سمجھ کر فیصل نے کہا۔

''ارے بھائی نہیں یہ کبھی ہیومیو پیتھک ڈاکٹر رہے ہیں پرانے لوگ انہیں آج بھی ڈاکٹر کلامی کہتے ہیں اور نئے عطر والے بابا......''

''اُف...... یہ ڈاکٹری سے بابا تک سفر کی کیا کہانی ہوگی بھلا......'' اورنگزیب نے کہا۔

''وہی کہانیاں ہوتی ہیں عموماً جو تمہارے ساتھ آج ہو رہا ہے۔'' سمیر جیسے دور کی کوڑی ہی لے آیا۔

'اے اے بھائی ہرگز نہیں تم کیا سمجھ رہے ہو میں ان حالات کا شکار ہوں تو تنگ آ کر سنیاس لے کر جنگلوں میں جا نکلوں گا...... ایں بتاؤ تو ذرا مجھے......'' اورنگزیب نے تیز لہجے میں کہا۔

''ویسے ایسا ہی ہوتا ہے اکثر ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے سمیر۔'' فیصل نے کہا۔

''اکثر فلموں میں بھی یہی دکھاتے ہیں آسیبی واقعات کا شکار لوگ۔''

''یار...... زیادہ جذباتی مت ہو......'' سمیر نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کو موڑا۔

''چلو میں تھوڑا سا سونا چاہتا ہوں تمہاری تقریر اُدھار بعد میں سنیں گے۔'' کہتا ہوا وہ اورنگزیب کے بستر پر دراز ہو گیا۔

''اوکے اوکے...... چلو تم نیند پوری کرلو آرام سے......'' اورنگزیب کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

شام ہوئی تو فیصل گاڑی لے کر آ گیا سمیر اور اورنگزیب اُس کے ساتھ سمیر کے بتائے ہوئے 'بندے' سے ملنے نکل پڑے۔ فائزہ کو اورنگزیب نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ وہ ایک دوست سے ملنے جا رہے ہیں جو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جا رہا ہے۔ فائزہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ تو سمیر کے آنے پر ویسے ہی خوش تھی۔ اُسے لگتا تھا دوستوں کے ساتھ وہ چیک کی گمشدگی کا غم بھلا پائے گا آسانی سے...... گاڑی کا رخ شہر کی قدیم آبادی کی جانب تھا۔ وہ لوگ گھر سے عصر سے کچھ پہلے ہی نکلے تھے۔

''تمہارے دریافت کردہ 'بندے' مل تو جائیں گے نا......'' شام کے گہرے ہوتے سائے دیکھ کر اورنگزیب نے کہا۔

''دیر نہ ہو جائے' ہمیں ہی آگے چل کر آسیب کا شکار کرنے لگتے ہیں۔''

''ارے نہیں نہیں یہ میری ناقص رائے ہو سکتی ہے...... معذرت چاہتا ہوں احباب......'' سمیر نے اورنگزیب کے گھورنے پر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''ناقص رائے نہیں ہے یہ شاید ایسا ہی ہوتا ہے...... اکثر ہوتا ہے......'' اورنگزیب نے کہا۔ وہ ابھی اور کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ڈاکٹر کلامی (عطر والے بابا) کا 'عطر محل' (دکان کا نام) آ گیا۔

''چلو ہماری منزل مقصود آ گئی ہے۔'' فیصل نے جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کی۔

''دیکھو باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا...... وقت جیسے سمٹ گیا۔'' سمیر نے خود کلامی کے انداز میں اترتے ہوئے کہا۔ یہ شہر کا قدیم علاقہ تھا لیکن بالکل الگ تھلگ سا اونچے نیچے ڈھلان زدہ راستوں سے مزین ایسی ہی ایک اونچی ڈھلان پر چند دکانوں کی قطار تھی کچھ کھلی ہوئی اور کچھ بند...... علاقے میں نیم کے درختوں کی بھرمار تھی۔ فیصل نے گاڑی ایسے ہی گھنے نیم کے درخت کے نیچے کھڑی کی تھی۔ اوپر کی جانب ڈھلان پر ایک گھنے نیم کے درخت کے نیچے 'عطر محل' کا بورڈ لگا ہوا نظر آیا نیم کے درخت کے تنے پر بھی بڑا بڑا عطر محل لکھا ہوا تھا اور ایک تیر کے نشان سے دکان کی طرف اشارہ بنا ہوا تھا۔ دوسرے لمحے وہ دکان کے دروازے پر تھے ایک سترہ اٹھارہ سال کا دبلا پتلا لڑکا جھاڑ پونچھ کرتا نظر آیا تینوں کو دیکھتے ہی وہ اُن کی طرف لپکا۔

''جی فرمایئے......''

''ہمیں بابا جی سے ملنا ہے۔'' فیصل نے کہا۔

''جی کس سلسلے میں؟''

''کیا مطلب تمہیں کیوں بتائیں؟'' سمیر نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''تم اپنا کام کرو اور بابا جی کے حضور پیغام پہنچاؤ۔''

''جناب اپنا ہی کام کر رہے ہیں ہم...... آپ سلسلہ بتایئے...... عطر خریدنا ہے تو ہم دے سکتے ہیں بابا جی کو تکلیف نہیں دیں گے۔''

''سمیر چپ کرو...... یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' فیصل نے کہا۔

''ہم ایک مسئلہ لے کر آئے ہیں عطر خریدنے نہیں۔''

''اچھا...... پھر یہ لیں......'' لڑکے نے کاغذ قلم اُن کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''تینوں اپنے اپنے ہاتھ سے اپنا نام لکھ دیں۔'' فیصل نے کاغذ لے کر اپنا نام لکھا...... پھر وہ سمیر کا لکھنا ہی چاہ رہا تھا لڑکے نے کاغذ چھین کر سمیر کو دیا اور سمیر کے نام لکھنے کے بعد اورنگزیب کو دیا۔ نام لکھوا کر وہ اندر جا کر گم ہو گیا۔

''یار کیا ماجرا ہے یہ...... لگتا ہے نام نہیں لکھوا کر گیا باقاعدہ ہمارے دستخط لے کر گیا ہے۔'' اورنگزیب نے دکان کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔

''ہاں ہر جگہ کے اپنے اصول ہیں جنہوں نے ہمیں اِن کا پتہ دیا ایسا ہی کچھ کہا تھا مجھے یاد آ رہا ہے۔'' فیصل نے ایک کرسی کو جھاڑ کر اس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یار یہ کیا جگہ ہے......'' اورنگزیب ایک سنگھار دان کے پیچھے سے جائزہ لیتا ہوا نکلا۔ جس پر ہاتھی

دانت کا بنا ہوا شمع دان رکھا ہوا تھا۔ سنگھار دان کا آئینہ کہیں کہیں سے زنگ آلود ہو رہا تھا۔ ہاتھی دانت کے بنے ہوئے ظروف انہیں جا بجا نظر آ رہے تھے ایک بڑا قد آور شمع دان دکان کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ سمیر اس کے برابر کھڑے ہو کر اپنا قد اس سے ملا رہا تھا۔ شمع دان چاندی کا تھا۔

''مجھے تو یہ عطر محل سے زیادہ پرانے سامان کی دکان لگ رہی ہے۔''

''نوادرات کہتے ہیں......'' فیصل نے سمیر کو گھورا۔

''ہاں ہاں وہی یہ دیکھو۔'' اورنگزیب نے ایک جانب دیوار میں لگے محرابی کیبنیٹ کی طرف اشارہ کیا جس میں خوبصورت بلوری عطر کی چھوٹی بڑی شیشیاں رکھی تھیں کچھ تو بے حد لمبی لمبی تھیں اور کچھ انتہائی چھوٹی مگر انتہائی خوبصورت......

''میں نے ایسی عطر کی شیشیاں نہیں دیکھی ہیں آج تک بلاشبہ......'' فیصل اور سمیر بھی اُس کے ساتھ آ کے کھڑے ہو گئے تھے اور اس کی ہی طرح عطر کی خوبصورت شیشیوں کی تعریف میں قصیدے ملا رہے تھے۔

دکان میں بس یہی ایک محرابی کیبنیٹ تھی جس میں عطر رکھے ہوئے تھے باقی دکان پرانے سامان کی آماجگاہ تھی۔ ایک کونے میں پرانے جوتے تک رکھے ہوئے تھے۔ تو کسی کونے میں نہایت حسین تراش خراش کی نازک اصفہانی تلواریں......ایک دیوار گیر ریک پر انہیں دنیا کی قدیم ترین قوموں کے عبادت خانوں میں کام آنے والے پُراسرار ظروف نظر آئے جن پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے دیوار پر ہی زرکار و جواہر نگار دستوں والے خنجر لٹک رہے تھے تو کہیں ہاتھی دانت کی قدیم صنعت کے شرقی نمونے اور نہ جانے کیا کیا۔ سمیر نے پُراسرار انداز میں کہا۔

''مجھے تو سچ مانو عجائب خانہ نظر آ رہا ہے عطر محل کے بجائے۔''

''یار بہت دیر ہو گئی لڑکا تو غائب ہی ہو گیا ہے۔'' اورنگزیب نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف نظر ڈالی۔

''ہاں پندرہ منٹ سے اوپر ہو رہا ہے......'' ابھی وہ لوگ اس سلسلے میں مزید تشویش کا اظہار کرتے کہ ایک مسحور کن خوشبو کا جھونکا اندرونی دروازے سے اندر آیا اور پھر درمیانے قد کے دبلے پتلے سفید کرتا شلوار پہنے ڈاکٹر کلامی تیزی سے آتے دکھائی دیے۔

اُن کے ہاتھ میں ایک سفید کبوتر دبا ہوا تھا سفید براق داڑھی سے مزین مسکراتا چہرہ اُن کے پیچھے پیچھے وہ ہی لڑکا ہاتھ میں میڈیسن بکس اٹھائے چلا آ رہا تھا۔

''معاف کرنا بھائی ایک مریض آ گیا تھا۔''

انہوں نے کبوتر کی جانب اشارہ کیا۔

''دوا دارو میں آپ لوگوں کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی جس کی معافی چاہتا ہوں......تشریف رکھیے۔'' انہوں نے ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سامنے میز تھی اس کے گرد تین ہی کرسیاں رکھی تھیں وہ تینوں بیٹھ گئے۔

''جاؤ بھائی تم آرام کرو اب انشاء اللہ دو ایک روز میں طبیعت بحال ہو جائے گی۔'' وہ کبوتر سے محو گفتگو

تھے۔

"جاؤ بھائی بجیلا! اس کو لے جاؤ۔" انہوں نے لڑکے کو بجیلا کے نام سے پکار کر کہا۔ لڑکے نے ان کے سامنے جھولی پھیلا دی عطر والے بابا یا ڈاکٹر کلامی نے کبوتر کو اُس کی جھولی میں اس طرح ڈالا جیسے کسی بچے کو جھولے میں لٹاتے ہیں۔ بجیلا جھولی پکڑے پکڑے دکان کے اس حصے میں گم ہو گیا جہاں سے ڈاکٹر کلامی باہر آئے تھے۔

"چلیے جناب اب آپ بتایئے......" عطر والے بابا نے چشمے کو ناک پر جماتے ہوئے کہا۔ تینوں کے نام لکھا کاغذ انہوں نے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ کچھ دیر ناموں کو دیکھنے کے بعد انہوں نے اورنگزیب کی جانب دیکھا۔

"جی فرمایئے۔" اورنگزیب نے آرٹ گیلری سے لے کر کل تک کے واقعات سنا ڈالے۔

"اوں...... بس یا اور کچھ......" انہوں نے گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب ذرا ان پھولوں میں سے کسی ایک کو اٹھا لیں۔" انہوں نے دراز کھولی اور گلاب کے تین تر و تازہ پھول برآمد کر کے میز پر رکھ دیے۔ پھول انتہائی خوشنما اور تر و تازہ تھے جیسے ابھی ابھی شاخ سے توڑے گئے ہوں جبکہ وہ دراز میں نہ جانے کب کے رکھے گئے تھے اُن کے دراز سے نکالتے ہی پھولوں کی مہک اس قدر تیزی سے چکرانے لگی ساری دکان صرف گلاب کی مہک سے بھر گئی تین پھولوں کی اس قدر مہک؟ ان تینوں کے ذہن میں یہی سوال سر اٹھانے لگا شبنم میں ڈوبے تین گلاب میز پر رکھے تھے۔

"ایک پھول اٹھایئے اورنگزیب صاحب......" ڈاکٹر کلامی (عطر والے بابا) نے کہا۔ اورنگزیب جو ٹکٹکی باندھے پھولوں کو دیکھ رہا تھا ہوش کی دنیا میں آیا۔

"جی جی......" اس نے باری باری گلابوں کے تینوں پھولوں کی جانب دیکھا اور پھر درمیان والا اٹھا لیا۔

"اوں...... لایئے صاحب......" ڈاکٹر کلامی نے پھول اورنگزیب سے لے لیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر پھول کو سونگھنا شروع کر دیا۔ تقریباً پانچ منٹ گزر گئے تینوں باری باری ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کچھ منٹ اور گزر گئے اورنگزیب فیصل کی طرف سرگوشی کو جھکا ہی تھا کہ عطر والے بابا جماہی بھرتے سیدھے ہو گئے۔

"ہاں جی......" انہوں نے پھول کو ایک طرف رکھ دیا اور اورنگزیب کو بغور دیکھنے لگے۔

"خوشبو آپ اپنا تعارف ہوتی ہے جتنا چھپاؤ اتنی تیزی سے پھیلتی جاتی ہے اور ایسی ہی ایک خوشبو جو تم نے چھپانا چاہی وہ بھی تیزی سے پھیلتی ہوئی مجھ تک آ پہنچی ہے۔" ڈاکٹر کلامی نے اورنگزیب کو گہری نظروں سے دیکھا۔

"بہتر ہے تم بھی مت چھپاؤ...... کیونکہ بات بہت اہم ہے اور جو تم سمجھ رہے ہو وہ ہرگز نہیں ہے بلکہ تمہارے سامنے اشتباہ نظر بنائی گئی ہے۔ طاغوتی طاقتوں نے...... تمہیں فریب دیا ہے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جال میں پھنسانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ تمہاری لاعلمی سے فائدہ اٹھایا گیا ہے...... تم پر نفسیاتی وار کیے گئے ہیں...... اور ایسی ایسی جگہ جہاں کوئی بھی بھائی اپنی بہن کے لیے پسند نہیں کرے گا۔ تم

نے جس جس کو جہاں جہاں دیکھا وہ 'املتاس' نہیں تھی۔'' عطر والے بابا نے اورنگزیب کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

''اس ابلیس زادی نے تمہیں پھنسانے کے لیے تمہاری معصوم بہن کی شبیہہ کو استعمال کیا کیونکہ براہ راست یہ کام نہیں کر سکتی۔ تمہیں توڑ کر اپنے مقاصد پورے کرنا چاہتی ہے لیکن کچھ قوتیں ہیں جو تمہاری بہن کی رکھوالی کرتی ہیں اور بارہا تمہیں بھی بچایا ہے' تمہارے گھر میں ایک درخت ہے۔'' ڈاکٹر کلامی نے پیپر پین سنبھالتے ہوئے کہا۔

''جی ہے۔'' اورنگزیب نے تصدیق کی۔ ڈاکٹر کلامی نے بال پوائنٹ سنبھال لیا اور کاغذ پر مختلف پھول بوٹے بناتے رہے جب کاغذ بھر گیا تو اسے پلٹ لیا چھ سات منٹ تک وہ اس کی حساب کتاب میں مصروف رہے۔ پھر انہوں نے بال پوائنٹ بند کر کے میز کی دراز کھسکائی اور بال پوائنٹ رکھ دیا۔ کاغذ کو طے کیا اور کچھ دیر تک مٹھی میں دبایا اور کچھ پڑھتے رہے پھر مٹھی کھول لی ایک نظر اورنگزیب کی طرف دیکھا۔ گہری سانس لی۔

اپنی جیب سے پان کی ڈبیہ نکالی اور اس ڈبیہ سے ایک پان بڑی نفاست سے نکالا اور منہ میں رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے پان کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر پان چباتے رہے۔ پھر پان چباتے چباتے اچانک آنکھیں کھولیں۔

''قسمت سے لڑا نہیں جا سکتا...... بس دعا ہی کی جا سکتی ہے آپ کی بہن کا نام املتاس...... گھر میں درخت املتاس بہت گہرا تعلق بن چکا ہے اوپر سے اس کے اس دنیا میں آنے کا وقت جو ابھی آپ نے کچھ دیر پہلے بتایا...... وہ وقت ہی اُسے اس املتاس کے درخت تک لے کر گیا ہے طے شدہ وقت...... اور یہ جس کے لیے اتنا اہم ہے وہ بھی اس دنیا کی باسی نہیں ہے مگر اچھی قوتیں ہیں...... وقت سے مجبور ہیں......'' ڈاکٹر کلامی مٹھی میں دبا کاغذ کھول کر باقی بچی ہوئی جگہ پر مزید پھول پتے بنا رہے تھے۔ فیصل اور سمیر کو املتاس اور اورنگزیب کے درمیان چلتی چپقلش کا کچھ کچھ اندازہ تھا فیصل کو تو اس روز سے تھا جس دن کالج میں اورنگزیب نے املتاس کو ساتھ گھر چلنے کا کہا اور وہ بات سننے کے بجائے ہنستی ہوئی اپنی دوستوں کے ساتھ چلی گئی۔ جبکہ گھر میں ماں دادی باقی سب گھر والے گواہ تھے کہ املتاس گھر پر ہی رہی تھی۔ اس دن وہ کالج ہی نہیں گئی تھی۔

اس کے بعد بھی املتاس کے حوالے سے ہونے والے واقعات کو فیصل سے بیان کیا تھا اس نے' ہر بار فیصل نے اورنگزیب کو کہا کہ اُس کا وہم ہے۔ اور املتاس پر اس دن کا غصہ ہے۔ مگر اب جو ہوا اور عطر والے بابا کی 'انفارمیشن' سے وہ دم بخود رہ گئے۔

ابھی وہ کاغذ پر مزید نقش و نگار بنا رہے تھے کہ گہرے گہرے سانس لینے لگے ان کے رُکتے ہی وہ تینوں ڈاکٹر کلامی کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کے گہرے سانس لینے کا مطلب جب سمجھ آیا جب ملے جلے پھولوں کی انتہائی نفیس مہک ان کے نتھنوں سے آ ٹکرائی۔

''اوہ اچھا اچھا بھئی......'' ڈاکٹر کلامی کے منہ سے عجیب بے ربط جملے ادا ہو رہے تھے۔

''چلو ٹھیک ہے...... آنے دو...... اوں ہوں......'' وہ زور زور سے گردن ہلا رہے تھے جیسے کوئی ان

کے کان کے پاس سرگوشیاں کر رہا ہو۔ چند سیکنڈ تک وہ مہک اُن کے اطراف گردش کرتی رہی اور پھر معدوم ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ بالکل غائب ہوگئی۔

''کیا آپ دونوں نے کبھی ان شیطان کی چیلیوں میں سے کسی کو دیکھا ہے۔'' ڈاکٹر کلامی نے فیصل اور سمیر کی جانب اشارہ کیا۔

''نہیں...... ابھی تک تو نہیں۔'' فیصل نے کہا۔

''میں نے بھی نہیں دیکھا۔'' سمیر نے کہا۔

''اچھا تو پھر پندرہ منٹ رکیے وہ ٹھیک پندرہ منٹ بعد یہاں ہوگی...... نگار نگار کی بات کر رہا ہوں۔'' ڈاکٹر کلامی نے اورنگزیب کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔ ڈاکٹر کلامی (عطر والے بابا) اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے اور محرابی کیبنیٹ سے ایک چھوٹی سی عطر کی شیشی نکال لی زیرلب کچھ پڑھ کر عطر کی پوری شیشی دکان کے دروازے کے پاس جا کر انڈیل دی چھوٹی سی شیشی میں انتہائی کم مقدار میں عطر تھا مگر خوشبو کا ایک ریلا تھا جو امڈ آیا تھا تینوں کے لیے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ صرف ایک بار خوشبو محسوس ہوئی پھر صرف دکان کے دروازے تک محدود ہوگئی۔ یہ کام کر کے دوبارہ کرسی پر آ کر بیٹھ گئے اور پھر جیب سے پان کی ڈبیہ نکالی اور پان منہ میں ڈال لیا بظاہر ہوں معلوم ہو رہا تھا وہ جیسے پان چبا رہے ہوں لیکن ایسا نہیں تھا بلکہ وہ کچھ پڑھ بھی رہے تھے۔ اورنگزیب کو جب سے معلوم ہوا کہ نگار یہاں بھی پہنچنے والی ہے وہ جانے کیوں ایک خوف سا محسوس کر رہا تھا نگار سے تو اس کی دو ہی ملاقات ہوئیں تھیں زیادہ وقت سنہرا کے ساتھ گزرا تھا۔

''وہ یہاں کیوں آ رہی ہے؟'' ڈاکٹر کلامی سے ان کی ملاقات کا معلوم ہوگیا ہے اُسے اتنا تو واضح ہو چکا تھا کہ وہ تصویر حاصل کرنا چاہتی تھی اور کیوں؟ یہ بھی عطر والے بابا نے انہیں کافی حد تک بتا دیا تھا۔ ایک اَن جانا خوف اُسے گھیر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نگار دکان کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ڈاکٹر کلامی ان تینوں کو اندرونی حصے میں چلنے کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ لوگ یہاں سے اُسے دیکھ سکتے ہیں۔''

انہوں نے دیکھا کہ بجیلا ایک بار پھر جھاڑ پونچھ پر لگا ہوا تھا نگار نے دکان میں قدم رکھ دیا بجیلا نے اس سے ویسے ہی سوال جواب کیے پھر نام لکھنے کے لیے کاغذ بڑھایا۔

نگار نے نام لکھ دیا۔

جیسے ہی بجیلا اندرونی حصے کی جانب آیا نگار نے اپنا کام شروع کر دیا سب سے پہلے سنگھار میز کی جانب لپکی چیزوں کو تیزی سے اُلٹ پلٹ کر رہی تھی پھر وہ میز کی جانب آئی جس کے گرد وہ لوگ بیٹھے تھے اس نے میز پر رکھی چیزیں دیوار وار اُلٹ پلٹ کرنا شروع کر دیں پھر مڑ کر درازوں کی جانب آئی اور مقفل درازیں کھولنا شروع کر دیں۔ اسی وقت ڈاکٹر کلامی اس کے سامنے آ گئے۔

''جی فرمایئے محترمہ......'' نگار نے ڈاکٹر کلامی کی جانب نظر اٹھائی اس کے جسم میں جیسے تھرتھراہٹ کی سی کیفیت پیدا ہوئی پھر وہ سیدھی ہوگئی۔

(جاری ہے)

سرگودھا سے بھیجی گئی بالکل سچی کہانی

وبال جان بانسری

ہماری دنیا میں اور بھی مخلوقات بستی ہیں جو انسانی جان کیلیے نقصان کا باعث بن جاتی ہیں۔ ایسی ہی سچی مگر مافوق الفطرت کہانی اُن لوگوں کیلیے لمحہ فکر یہ جو غیر مرئی مخلوق کے وجود سے انکاری ہیں......

ڈاکٹر طارق محمود آ کاش

بانسری بجانا کوئی جرم نہیں مگر ہمیں 15 سال ری بجانے کی وہ سزا ملی جسے ہم جیتے جی نہیں سکتے۔ یہ ایسی بھیانک سزا تھی جس کے یاد تے ہی آنکھوں میں آنسو آنے کے علاوہ دل کانپ اٹھتا ہے۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں رحمانیہ ہائی ل لائل پور میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ ایک کزن ریلوے میں بھرتی ہو کر ہمارے ریلوے کوارٹروں میں پہنچا۔ اُن دنوں نشاط ور ریلوے اسٹیشن زیر تعمیر تھا۔ اور میرا کزن اَن ہونے کی وجہ سے 'بتی مین' بھرتی ہوا تھا۔ جس ڈیوٹی صرف یہ تھی کہ شام کے وقت نشاط آباد سگنلز پر بتی جلانی ہے اور صبح ہوتے ہی وہ بتی دینی ہے۔

ہمارے ریلوے کوارٹر کچے تھے جن کے پیچھے نہر رکھ برانچ گزرتی تھی۔ جو آج بھی پوری ب وتاب کے ساتھ اپنی منزل کی جانب رواں ہے مگر ہم وہاں سے ہجرت کر کے گوجرانوالہ کے پاس ایک گاؤں میں رہائش پذیر ہو گئے۔

میرے اس کزن کو بانسری بجانے کا بہت شوق تھا۔ اکثر شام کو یہ نہر کنارے بیٹھ کر بانسری بجاتا رہتا اور رات گئے واپس آتا حسب عادت ایک رات جب یہ بانسری بجا کر واپس لوٹا رات کافی بیت چکی تھی۔ اپنے بستر پر لیٹے اُسے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا ہو گا کہ اُس کی ٹانگیں اوپر اور سر نیچے اور خود بے ہوش' ابا جان گھر پر ہی تھے میں اور میرا چھوٹا بھائی ارشد یہ سب کچھ دیکھ کر رونے لگے۔ جبکہ ابا جان نے امی کی مدد سے میرے اس کزن کو جسے ہم بھائی کہتے تھے چارپائی پر سیدھا کیا اور خود لالٹین لے کر کسی سیانے کو لینے چلے گئے۔ کیونکہ ان دنوں ہمارے کوارٹروں میں بجلی نہیں ہوتی تھی۔

اُس اللہ کے بندے نے پانی دم کر کے بھائی کے منہ پر چھینٹے لگائے تو بھائی کے اندر سے ایک آواز آئی۔

”گھر والوں کو بولو آرام سے سو جائیں۔ ہم انہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ اس شخص نے جو بانسری بجائی ہے وہ ہمیں بہت پسند آئی ہے۔ اس لیے ہم نے اسے پکڑا ہے۔“ معلوم ہوا کہ پریوں کا ایک غول اوپر سے گزر رہا تھا بانسری کی سریلی آواز اُن کو بھا گئی اور وہ ہمارے بھائی جان پر عاشق ہو گئیں۔ وہ بزرگ اپنا زور لگا کر چلا گیا مگر بھائی جان کو ہوش نہ آیا۔

☆......☆......☆

غم اور دکھ والی رات لمبی ہو جاتی ہے۔ ہم نے بھی ساری رات تکلیف میں گزاری۔ خدا خدا کر کے دن نکلا۔ جیل روڈ کے قریبی محلّہ میں میرا ننھیال تھا۔ اُن کو اطلاع دی گئی۔ میرے نانا مرحوم ایک شخص کو لے کر آئے۔ اُس نے آتے ہی کوئلے دہکائے۔ ہینگ کی دھونی دی تو بھائی نے آنکھیں کھول دیں اور ہوش میں آ گئے۔ ہم سب نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

یہ سب کچھ عارضی ثابت ہوا۔ دو دن کے بعد بھائی جان کو دورے پڑنے لگے۔ اب کوئی وقت بھی خالی نہ جاتا صبح دوپہر شام ہر وقت دورے کی حالت رہتی۔ جہاں کسی عامل کا پتہ چلتا ابا جان فوراً اُسے لے آتے مگر چند دن آرام کے بعد وہی حالت ہو جاتی۔ اب تو اہل محلّہ نے بھی ہمارا بائیکاٹ کر دیا محلے کا کوئی بچہ یا عورت ہمارے گھر نہ آتا تھا۔ سب ڈر گئے تھے۔

☆......☆......☆



ہمارے کوارٹروں میں لاہور کی ایک فیملی رہتی
ں۔ اُن کی ایک چھوٹی بچی کافی خوبصورت تھی۔
ئی جان کو وہ اچھی لگتی تھی گول مٹول گڑیا جیسی
لہ کو ہر کوئی پیار کرتا بھائی صاحب کو وہ اچھی لگتی
ں۔ بھائی جب بھی اُسے بلاتے تو اُس کے
دین اُسے منع کر دیتے۔

ایک رات کا ذکر ہے نائلہ کے گھر والے کافی
یشان تھے۔ سارا محلہ چھان مارا نائلہ کہیں نہ
۔ چار و ناچار انہوں نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا
آپ ہی ہماری مدد کریں۔ ان چیزوں سے
چھ کر بتائیں کہ ہماری نائلہ کہاں چلی گئی۔ رات
ھی گزرنے کو ہے ہماری نائلہ ہمیں نہیں مل رہی
نے تو سارا محلہ چھان مارا ہے خدارا مدد
یں۔"

یہاں میں آپ کو ایک بات بتاتا چلوں کہ وہ
والی چیزیں میری امی جان کی بات مان لیا
تی تھیں۔ جبکہ ابا جان کے خلاف تھیں کیونکہ ابا
ن عاملوں کو جو گھر لاتے تھے۔ امی جان ان
ساتھ پیار سے پیش آتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ
جان کی وہ بات کو غور سے سنتیں اور جہاں تک
ں ہوتا امی جان کا کہا بھی مان لیتیں۔

☆......☆......☆

نائلہ کے متعلق امی جان نے پوچھا تو بھائی
ن نے کمبل ہٹایا تو نائلہ ان سے چمٹی سو رہی
۔ گھر والوں کو نائلہ ملی تو انہوں نے خدا کا شکر
کیا۔ اُس دن کے بعد سے انہوں نے نائلہ کو
ے گھر آنے سے نہیں روکا۔ ہم سب حیران و
شان تھے کہ دروازہ بند اور نائلہ کو ہم نے آتے
نہیں دیکھا مگر نائلہ ہمارے گھر موجود تھی اور
ں کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی حالانکہ ہم سب
ی گھر میں سوتے تھے۔

اس واقعے کے بعد تمام محلے والوں نے بھائی
صاحب سے ڈرنا شروع کر دیا۔ انہی دنوں
ہمارے محلے کے ایک کوارٹر میں ایک نہایت ہی
خوبصورت بچہ پیدا ہوا۔ رات کو ماں نے بچے کو
بستر میں ڈھونڈا تا کہ اُس کو دودھ پلائے مگر بچہ
غائب پایا۔

ہر کوئی پریشان اور بھاگ دوڑ میں لگ گیا۔
مگر بچہ بھائی جان کے بستر میں پڑا ملا۔ بچوں سے
اُن چیزوں کو بہت پیار اور بڑوں سے بیر تھا۔

ایک شاہ صاحب تھے وہ بھی ریلوے ملازم
تھے۔ اللہ والے لوگ تھے جب اُن کو اس واقعے کا
علم ہوا تو وہ ہمارے ہاں تشریف لائے انہوں نے
ابا جان سے مل کر پروگرام بنایا آج جونہی آپ
کے بھانجے کو دورہ پڑے تو اس کے ساتھ بالکل
رعایت نہ برتی جائے۔ بلکہ دونوں مل کر اُسے
خوب پھینٹی لگائیں گے۔

قدرت خدا کی شاہ صاحب کے بیٹھے بیٹھے
بھائی صاحب باہر سے آئے اور چارپائی پر
دھڑام سے گر پڑے اور دورہ شروع......

پروگرام کے مطابق آؤ دیکھا نہ تاؤ میرے ابا
جان اور شاہ صاحب نے بغیر کسی نقصان کی پرواہ
کیے بھائی صاحب کو پکڑا اور یہ کہتے ہوئے......

"آج یا تم نہیں یا ہم نہیں آپ نے ہمیں
بہت تنگ کیا۔ ہمارا کھانا پینا مشکل کر دیا ہے
عاملوں کو پیسے دے دے کر ہم تو مقروض ہو گئے
ہیں۔ آپ نے ہماری ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

باہر کی چیزوں کو مخاطب کر کے بھائی صاحب پر
پل پڑے۔ مگر بھائی صاحب میں پتہ نہیں کتنے
پہلوانوں کی طاقت تھی۔ وہ دونوں کے ہر وار کو
جھٹک دیتے۔ میں نے بھی ڈرتے ڈرتے مرچیں
پیسنے والا ڈنڈا اٹھایا اور بھائی صاحب کے سر پر

دے مارا۔ کیونکہ روز روز کے اس تماشے سے ہم سب عاجز آ چکے تھے۔ اکثر اوقات تو ہوم ورک بھی ادھورا رہ جاتا اور اسکول سے مار کھانا پڑتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ڈنڈا ایسا گھوما کہ وہ بجائے بھائی صاحب کو لگنے کے میرے ابا جان کے سر میں آن لگا اور ابا جان کا سر پھٹ گیا۔ دھینگا مشتی بند ہوگئی اور ابا جان نے بھاگ کر پٹی وغیرہ کروائی۔ شاہ صاحب بھی تھک ہار کر خود ہی اپنے گھر کو چلے گئے۔

اُس دن کے بعد ہم عاملوں کے رحم و کرم پر ہوگئے۔ طرح طرح کے عاملوں نے ہمارے گھر کا دروازہ دیکھ لیا تھا۔ سب اپنے اپنے جوہر دکھانے میں لگے ہوئے تھے مگر بھائی صاحب کی صحت پر کوئی اثر نہ ہوا۔

اب تو دورہ بھی اور اسٹائل کا ہوگیا۔ ہفتے میں سات دن ہیں اور ہر دن علیحدہ علیحدہ جن صاحب کی ڈیوٹی لگ گئی کہ وہ ہمارے بھائی کو طرح طرح کی تکلیفوں سے دوچار کرے۔ اب تو ان جنوں نے امی جان سے باتیں بھی کرنا شروع کردیں مجھے اتنا یاد پڑتا ہے کہ اتوار کے روز پری کی ڈیوٹی تھی وہ امی جان سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی مختلف قسم کی ٹافیاں لے کر آتی' وہ ٹافیاں ہمیں بھائی جان کے تکیے کے نیچے سے ملتیں ایک جن جس کا نام امی جان گوہر بتاتی تھیں اُس کی ڈیوٹی منگل کے روز ہوا کرتی تھی۔ اُس کا کام بھی آپ سن لیں۔ پچھلے ٹائم جب امی روٹی پکانے بیٹھتیں تو وہ روٹیاں کھائے جاتا سالن والی ہنڈیا میں روٹی کے دو ٹکڑے کرتا اور سالن لگا لگا کر کھائے جاتا۔ اگر امی جان ہنڈیا کو اٹھا کر اُس کے آگے پانی کا جگ رکھ دیتیں تو وہ پانی میں روٹی ڈبو ڈبو کر کھا جاتا۔ یہاں تک کہ ساری روٹیاں کھا جاتا' ہمارے لیے امی جان کو دوبارہ روٹیاں پکانا پڑتیں۔

☆......☆......☆

ایک دفعہ کسی صاحب نے ابا جان کو کہا کہ جڑانوالہ جائیں وہاں کوئی مولوی فیصل ہیں۔ بڑے اللہ والے ہیں۔ اُن کے پاس جا کر اپنا مدعا بیان کرو۔ ان دنوں جڑانوالہ کو بسیں بہت کم جایا کرتی تھیں ابا جان سائیکل پر ہی جڑانوالہ کے چک نمبر 30 گ ب چلے گئے۔

رات بارہ بجے جب واپس آئے تو نہر کی پٹڑی کے ساتھ جہاں اُن باہر کی چیزوں کی آماجگاہ تھی۔ وہاں پر ان چیزوں نے ابا جان کو نہر میں پھینچ دیا۔ سائیکل نہر سے باہر اور ابا جان نہر کے اندر......

سردیوں کی راتیں...... بھیگے کپڑوں سے گھر پہنچے۔ سائیکل اور تعویذ جو مولوی فیصل صاحب نے دیے وہ وہیں نہر کے کنارے پڑے رہ گئے۔ لالٹین کی روشنی میں رات کے پچھلے پہر میں اور امی جان نے وہاں جا کر تعویذ اور سائیکل اٹھائی اور گھر آئے۔

تعویذ گلے میں ڈالتے ہی بھائی صاحب کے دورے ختم بھائی صاحب مکمل ہشاش بشاش...... مگر یہ خوشی بھی عارضی ثابت ہوئی معلوم ہوا کہ بھائی صاحب نے ان چیزوں کے بہکاوے میں آ کر تعویذ کو اُتار پھینکا اب پھر وہی ٹانگیں اوپر اور سر نیچے......

ان چیزوں سے جھگڑا اسی تھا کہ ہم اسے کوہ قاف لے جانا چاہتی ہیں اور آپ ہماری راہ میں عاملوں کے ذریعے رکاوٹ ڈال دیتے ہیں ایک دفعہ تو انہوں نے میری امی کو یہاں تک کہہ دیا کہ آپ کسی بھی بینک میں ہمارے ساتھ چلیں نوٹوں

کی جتنی بوریاں بھرنا چاہیں بھر لیں۔ مگر ہمارا شکار ہمیں لے جانے دیں مگر امی ہر بار ان سے کہتیں کہ یہ ہمارے پاس امانت ہے۔ گوجرانوالہ سے ملازمت کرنے یہاں پہنچا ہے ہم امانت میں خیانت نہیں کرنے دیں گے۔

ایک دفعہ ان باہر کی چیزوں نے کہا۔

"ہمیں بھائی صاحب کی تصویر دو ہم اسے کوہ قاف بھیجنا چاہتے ہیں۔ امی جان نے تصویر کے متعلق ایک عامل سے بات کی تو اس عامل نے کہا کہ اس کی تصویر کو تمباکو میں رکھ دو پیاز اور تمباکو کے نزدیک یہ چیزیں نہیں جاتیں۔

ایسا ہی کیا گیا گھر میں تمباکو والا ڈبہ تھا کیونکہ ابا جان خود حقہ پیتے تھے تصویر کو تمباکو والے ڈبے میں رکھ دیا گیا۔ مگر ان چیزوں نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی تصویر دو تصویر دو۔

ایک روز غصے میں آ کر امی جان نے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور چلتی ہوئی نہر میں پھینک دیے امی جان تصویر کو بہانے پر مطمئن تھیں۔

مگر وہی تصویر دوسرے دن بھائی صاحب نے امی کو دکھائی کہ یہی تصویر تھیں جس کو آپ نے پھاڑ کر نہر میں بہایا تھا۔

امی جان بھائی کے ہاتھ میں تصویر دیکھ کر حیران ہو گئیں۔ اسی طرح ایک دفعہ ان چیزوں نے میرے چھوٹے بھائی ارشد کو جو اس وقت تیسری کلاس میں پڑھتا تھا گریبان سے پکڑ کر چھت پر پھینک دیا تھا۔

☆......☆......☆

بھائی گھر سے باہر گئے ہوتے تو آتے ہی بتا دیتے گھر میں فلاں مہمان آیا تھا فلاں عامل آیا تھا اس نے فلاں فلاں باتیں کی تھیں۔ روتے دھوتے شب و روز گزرتے گئے۔ بھائی صاحب کے والد تو تھے نہیں بھائیوں اور والدہ کو جب ان دوروں کا پتہ چلا تو انہوں نے بھی بھائی صاحب سے قطع تعلق کر لیا۔ بھائی بھی مجبور تھے وہ کون سا خود ایسا کرتے تھے۔ باہر کی چیزیں ہی اُن کو بولائے دے رہی تھیں۔ کسی کا جی تو نہیں کرتا کہ جب وہ سوئے تو اس کی ٹانگیں اوپر اور سر نیچے ہو جائے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی خبر بدمزہ جب بھائی ہوش میں ہوتے تو رو پڑتے کہ ایسی زندگی سے تو موت بہتر...... مگر امی جان اسے حوصلہ دیتیں کہ مصیبت ہے ٹل جائے گی۔ خدا تعالیٰ بڑا مہربان ہے۔ ضرور ایک دن اُس کا فضل و کرم ہوگا اور اس مصیبت سے جان چھوٹ جائے گی۔

☆......☆......☆

قارئین میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھ سے چھوٹا بھائی ارشد تیسری کلاس میں پڑھتا تھا۔ وہ ماشاء اللہ سے بہت خوبصورت تھا۔ بھائی صاحب کو اس سے بھی بہت پیار تھا۔ جب بھی ان بدروحوں سے امی جان کی بھائی جان کو کوہ قاف لے جانے کے متعلق بات ہوتی تو امی اُن کو امانت میں خیانت کا کہہ دیتیں۔ تو وہ فوراً کہہ دیتیں کہ چلو امانت میں خیانت نہیں کرتے۔

اپنا لخت جگر ارشد ہمیں اس امانت کے بدلے میں دے دو تو امی جان خاموش ہو جاتیں۔

اتوار کو جب پری کی آمد ہوتی تو گھر میں خوشبو پھیل جاتی امی جان فوراً کہہ دیتیں کہ یہ خوشبو پری کی آمد کی نشانی ہی ہے۔

چھن چھن کی آواز ہمیں تو نہ آتی مگر امی جان کو وہ آواز ضرور سنائی دیتی گھنٹوں وہ امی سے باتیں کرتی۔

زندگی عذاب بن کر رہ گئی۔ والدین دن

بدن مقروض ہوتے گئے۔ انہی چیزوں نے ہمارے گھر میں صفِ ماتم بچھا دیا۔ میرا چھوٹا بھائی ارشد ایک روز اسکول سے واپس آتے ہی بخار میں مبتلا ہوا اور دوسرے دن سحری کے وقت ہمیں روتا دھوتا چھوڑ کر اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کا سارا جسم نیلا ہو گیا تھا۔ عاملوں نے کہا کہ یہ سب بدروحوں کی کارستانی ہے۔ مگر ہم اسے رضائے الٰہی سمجھ کر صبر شکر کر کے بیٹھ گئے۔

☆......☆☆

بھائی جان بھی اب کافی پریشان رہنے لگے مگر اُن کے بس سے باہر تھا وہ کر کچھ نہیں سکتے تھے۔ ایک عامل نے بتایا کہ تم اس طرح کرو کہ سپارہ پڑھا کرو تب یہ چیزیں تمہارے نزدیک نہیں آئیں گی۔

مگر جب بھائی سپارہ پڑھتے تو سپارہ ایک طرف اور بھائی ایک طرف پتہ چلا کہ انہوں نے جو ورد بھائی صاحب کو بتایا ہوا ہے زبان سے وہ جاری ہو جاتا ہے اور وہ چیزیں فوراً حاضر ہو جاتی ہیں اور بھائی کو دورہ پڑ جاتا ہے۔

کافی ٹکریں مارنے اور جگہ جگہ کی خاک چھاننے کے بعد ہمیں جھال خانوانہ گلی نمبر 7 سے میاں وریام کا پتہ چلا کہ اس کی فیس تو کافی ہے مگر باہر کی چیزوں پر اس کا عمل کارگر ثابت ہوتا ہے۔ اس کے عمل سے یہ چیزیں کوسوں دور بھاگ جاتی ہیں۔

میاں وریام کو ڈھونڈ لیا گیا۔ میاں جی نے کافی تگ و دو کے بعد ان چیزوں کو قابو کر لیا۔ خرچہ تو ہمارا بہت ہوا مگر بھائی صاحب کو آرام آ گیا۔

65ء کی جنگ بندی کے بعد جب ریلوے اسٹیشن 'الھڑ' پر انڈین فوج کا قبضہ تھا۔ براستہ لاہور ہم آبائی شہر پسرور پہنچے۔ جہاں بھائی صاحب کی شادی رچائی جا رہی تھی۔

شادی کے بعد بھائی صاحب اپنے ایک دوست کے ہمراہ حضرت سلطان باہو کے دربار اقدس پر حاضری کے لیے گئے اب بھائی صاحب کو دورہ وغیرہ سے مکمل نجات مل چکی تھی۔ کافی عرصہ تک بلاناغہ ہر سال وہ مزار اقدس پر حاضری دیتے رہے بعد ازاں وہ عمرہ کرنے کی غرض سے سعودیہ گئے۔

تین سال وہاں لگانے کے بعد حاجی صابر بن کر لوٹے اور اپنے آبائی شہر میں ہوٹل بنا کر بیٹھ گئے۔ اور پھر دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

ہم ان چیزوں سے تنگ آ چکے تھے۔ رسی تو جل گئی تھی مگر اس کے بل ابھی باقی تھے۔

بے شک کچی نہر کی پٹڑی اب پکی سڑک میں تبدیل ہو چکی تھی۔ کچے کوارٹروں کی جگہ پکے کوارٹر بن چکے تھے۔ جڑانوالہ کی کچی سڑک اب پکی بن چکی تھی۔ جس میں اس زمانے میں ٹریفک برائے نام ہوتی تھی اب ٹریفک رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

ہمیں ان چیزوں سے آئے دن پریشانیوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ ابا جان ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ میں نے بھی میٹرک کر لیا تھا۔

کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصل آباد کو روتی آنکھوں سے خیر باد کہہ دیا۔ ننھیال کبھی کبھار آنا پڑتا ہے مگر کوارٹروں میں جانے کی جرأت نہیں ہوتی۔ میری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ان چیزوں سے محفوظ ہی رکھے جن کا علاج آج کی سائنس ابھی تک دریافت نہیں کر سکی۔

☆☆......☆☆

کراچی سے ارسال کردہ بالکل سچی اور پُر اسرار کہانی جس کے کردار آج بھی موجود ہیں

نیک جنات

پتھر پھینکنے کا مقصد صرف اماں کو

بتانا تھا کہ ان سے خطا ہو گئی ہے......

فوزیہ فرید

سخت سردیوں کے دن تھے، لوگ اپنے اپنے
گھروں میں بستروں میں گھسے نیند کے مزے لے
رہے تھے۔ میں بھی اپنی کمرے میں نرم گرم بستر میں
سویا ہوا خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ میں
نیند کی حسین وادیوں میں کھویا حسین نظاروں کی سیر
کر رہا تھا۔ یہ سیر صبح تک جاری رہتی اگر اس دھماکے
سے میری آنکھ نہ کھل جاتی۔ وہ آواز بہت زوردار تھی
۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ دھماکے جیسے آواز مسلسل
آ رہی تھی، مجھے خیال گزرا کہ شاید ژالہ باری ہو رہی
ہے۔ میں حیران تھا کہ رات تک تو سب کچھ ٹھیک
ٹھاک تھا۔ موسم تو ابر آلود نہ تھا۔ پھر یہ اچانک موسم
نے پلٹا کیسے کھا لیا۔

اب آنکھ کھل ہی گئی تھی تو اتنی جلدی نیند بھی
متوقع نہ تھی۔ سوچا باہر کے موسم کا حال احوال ہی
معلوم کر لوں۔ اس غرض سے میں اپنے بیڈ سے نیچے
اترا اور سلیپر پاؤں میں ڈالے اور کھڑکی کھول کر باہر
جھانکا۔ مگر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ آسمان
پہ بکھرے کہکشاں واضح تھی اور دور دور تک مطلع
صاف تھا، ژالہ باری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا
۔ تو پھر یہ آوازیں کیسی تھیں جواب ابھی تک آ رہی
تھیں۔

میں فوراً کھڑکی سے ہٹا اور کمرے کا دروازہ کھول
کر باہر آ گیا۔ باہر صحن میں میری نظروں کے سامنے
پتھر آ کر گرے تھے۔ میں نے پلٹ کر کمرے کی چھت
کو دیکھا تو وہاں بھی مجھے پتھر نظر آئے۔ انہی پتھروں
کی وجہ سے میری آنکھ کھلی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی باقی گھر
والے بھی جاگ گئے اور صحن میں جمع ہو گئے۔ سب
کے چہروں پر سوالیہ نشان تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے،
رات کے اس پہر سردی کے سخت موسم میں کس کو ایسی
بے ہودہ شرارت سوجھ رہی ہے۔ وجہ جاننے کے لیے
میں نے بیرونی دروازہ کھولا اور باہر نکل کر گلی میں
جائزہ لیا کہ پتھر پھینکنے والا نظر آئے مگر گلی دور تک
سنسان پڑی تھی۔ کہیں بھی کسی ذی روح کا نام و نشان
تک نہ تھا۔ آس پاس کے لوگ پڑھے لکھے سلجھے
ہوئے لوگ تھے ان کے بارے میں ایسا سوچا نہیں جا
سکتا تھا۔ تو پھر یہ کس کی حرکت ہو سکتی تھی۔ میں وہیں

کھڑا سوچ جا رہا تھا کہ میری والدہ نے مجھے آواز دے کر اندر آنے کو کہا۔ میں دروازہ بند کر کے اندر گیا۔ ابھی بھی کچھ پتھر آ کر گر رہے تھے۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ سب حیران تھے کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا تھا، سب اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے مگر اصل وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میرا ذہن صحن کے کونے میں پڑے پتھروں کی جانب گیا مگر وہ پتھر شاید اماں نے ہٹوا دیے تھے۔ فجر کی اذان سے پہلے پتھر گرنے کا سلسلہ رک گیا۔

پاکستان کوارٹر کے علاقے میں بنے اس پرانے طرز کے گھر خریدے ہوئے کئی ماہ بیت چکے تھے۔ اس گھر میں داخل ہوتے ہی سامنے تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ اسکے ساتھ ہی باتھ روم اور کچن تھا۔ باقی صحن تھا اور صحن کے بیچ و بیچ ایک نیم کا درخت تھا جو کافی پرانا اور بڑا سا تھا جس کی شاخیں نہ صرف صحن بلکہ پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ صحن کے کونے میں پتھروں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں نے گھر میں ایسا کوئی تعمیراتی کام نہیں کرایا تھا جسکی وجہ سے پتھر جمع ہوتے، مگر شاید پچھلے رہائش پذیر لوگوں نے چھوڑ دیے تھے اور وقت کی کمی کے باعث میں بھی انہیں ہٹوا کر پھینکوا نہیں سکا۔

ہماری فیملی میں ہم میاں بیوی، دو بیٹے، ایک بیٹی اور میری والدہ تھیں۔ میری والدہ صوم وصلوۃ کی پابند اصول پسند خاتون تھیں اور یہی خوبیاں میری بیوی میں بھی تھیں اس لیے ان دونوں میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ دونوں کے بیچ ذہنی ہم آہنگی کچھ ایسی تھی کہ روایتی ساس بہو والے مسائل نہ تھے۔

میری والدہ بہت صفائی پسند تھیں، ایک روز صحن کی صفائی کرتے ہوئے انکی نظر پتھروں کے ڈھیر پر پڑی تو انہوں نے سوچا کہ کب سے یہ پتھروں کا ڈھیر



یونہی پڑا ہے اگر یہ سب ہٹا دیے جائیں تو یہ جگہ استعمال کے قابل ہو جائے۔ اسی سوچ کے تحت انہوں نے اب پتھروں کو وہاں سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ اگلے دن انہوں نے اس سوچ پر عمل درآمد کے لیے گھر کے بچوں کو اپنے ساتھ لگا لیا اور کچھ دیر کی محنت کے بعد ان پتھروں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ پھر انہوں نے اس جگہ کی اچھی طرح صفائی کی۔ ان پتھروں کے ہٹنے کے بعد واقعی میں وہ جگہ بہت صاف ستھری نظر آ رہی تھی اس سے پہلے کسی نے اس بات پر توجہ نہ دی تھی۔ اماں کی صفائی کا یہ عمل سب کو بہت پسند آیا تھا۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان پتھروں کو وہاں سے ہٹانے کے کیا نتائج بھگتنے پڑیں گے۔

اسی رات ہی پتھر آنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ روزانہ رات انجان سمت آنے والے ان پتھروں کی وجہ سے ہم سب بے حد خوفزدہ تھے۔ حالانکہ اس پتھر سے اب تک کوئی بھی زخمی نہیں ہوا تھا۔ مگر آوازوں نے ہم سب کو بہت خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

میری والدہ جہاندیدہ خاتون تھیں، وہ اس معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئیں تھیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگیں۔

"بیٹا تم کسی سے پتہ کرو آخر ہمارے گھر میں یہ اچانک روزانہ پتھر کیوں آنے لگے ہیں۔ آخر یہ سب کب تک چلتا رہے گا؟"

"امی آپ فکر نہ کریں میں خود بھی ایسا کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں آج ہی اپنے دوست سے بات کرتا ہوں وہ ایک صوفی صاحب کو جانتا ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ وہ انکی فیملی ممبر کی طرح ہیں۔ میں نے اپنے دوست عابد کے ذریعے ان سے ملاقات کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور کوئی نہ کوئی حل بتائیں گے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا تم جو بھی کرو وہ جلد از جلد کرو۔ اور سب کو اس خوف سے نجات دلاؤ۔" وہ خود بھی اس ناگہانی آفت سے نجات کی دعائیں کر رہی تھیں۔ اس سلسلے میں اپنے دوست عابد سے بات کی تو فوراً بولا۔

"چلو میں آج ہی ان سے تمہیں ملواتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ہم دفتر سے فارغ ہو کر چلتے ہیں۔"

دفتر سے فارغ ہوتے ہی میں عابد کے ساتھ صوفی صاحب کے گھر چلا گیا۔ صوفی صاحب خاصے پرنور چہرے کے مالک تھے۔ خلق خدا اور اللہ کی عبادت نے انہیں یہ اعزاز بخشا تھا۔ ہمارا مسئلہ سننے کے بعد وہ گویا ہوئے۔

"عابد بیٹے آپ ہر بار اپنے مسئلے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ آج کس کو ساتھ لائے ہو؟" ان کے پر شفیق سی مسکراہٹ تھی۔ وہ چہرے سے جتنے بارعب نظر آ رہے تھے۔ لہجے سے اتنے ہی نرم گو تھے۔

"صوفی صاحب یہ میرے دوست شکیل ہیں۔ گذشتہ راتوں سے ان کی فیملی کے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آ رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے شکیل صاحب بے حد پریشان ہیں۔ انہوں نے جب اپنے ساتھ آنے والے واقعات کا ذکر کیا تو میں انہیں لے کر آپکے پاس آ گیا۔ آپ اپنے علم کی مدد سے ان واقعات کے وقوع پذیر ہونے کی وجہ معلوم کر لیں۔" عابد بولا۔

"میں کہاں میری اوقات کہاں! جو بھی کرنا ہو وہ اللہ کی ذات کرتی ہے۔ اسی کے کرم سے میں اس قابل ہوا ہوں۔ آپ لوگ مجھے بتائیں کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔

عابد نے مجھ سے کہا کہ جو کچھ بھی اب تک تمہارے گھر میں ہوتا رہتا رہا ہے۔ سب کچھ صوفی صاحب کو تفصیل سے بتاؤ۔

میں نے صوفی صاحب کو وہ تمام واقعات بتائے جن کی وجہ سے میں انکے پاس آیا تھا۔ صوفی صاحب نے کہا۔

"میں فی الحال آپ کو یہ پانی دم کر کے دیتا ہوں۔ کل شام عصر کے وقت میں آپکے گھر آؤں گا۔"

میں نے صوفی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور عابد کے ہمراہ گھر واپس آگیا۔

گھر آکر میں نے دم کیا ہوا پانی گھر کی دیواروں پر چھڑکا اور گھر والوں کو صوفی صاحب کے آنے کا بتایا۔ رات کو بھی پتھر آئے مگر ان پتھروں کی نوعیت شدید پتھراؤ جیسی نہ تھی۔

دوسرے دن عصر کے وقت صوفی صاحب عابد کے ہمراہ ہمارے گھر آئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے زوردار آواز سے سلام کیا۔ پھر پورے گھر کا جائزہ لینے لگے، میں نے اپنی بیوی، اماں اور بچیوں کو ایک علیحدہ کمرے میں بھیج دیا۔

صوفی صاحب گھر کا جائزہ لیتے ان پتھروں والی جگہ پر آکر رک گئے اور مجھ سے پوچھا۔

''یہاں پہلے کیا رکھا تھا؟''

''یہاں پر پتھروں کا ڈھیر تھا جسے میری والدہ نے بچوں کی مدد سے ہٹادیا ہے تاکہ یہ جگہ استعمال میں لائی جاسکے۔'' میں نے صوفی صاحب کو بتایا۔

انہوں نے بغور اس جگہ کا معائنہ کیا پھر ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جائے نماز چاہیے۔''

میں نے فوراً کمرے سے جائے نماز لاکر دی جسے انہوں نے اسی جگہ بچھائی اور کچھ دیر تک کچھ پڑھتے رہے پھر جب فارغ ہوکر کھڑے ہوئے تو مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''آپکی والدہ نے جن پتھروں کو فالتو سمجھ کر وہاں سے ہٹایا تھا اصل میں وہاں جنات کا بسیرا تھا۔ آپکی والدہ کو ان پتھروں کو ہٹانے سے پہلے اتنا کہنا چاہیے تھا کہ اگر اس جگہ کسی کا بسیرا ہے تو ہمیں بتائیں ہم اس جگہ کو پاک صاف کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی کو اعتراض ہو تو وہ ہمیں خواب میں آکر بتادیں۔ آپکی والدہ سے نادانستگی میں یہ خطا ہوگئی ہے مگر وہ غیر مرئی مخلوق ان کی اس حرکت پر ناراض ہیں۔ وہ آپ لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول کرانے کے لیے پتھروں کو پھینکنے کی حرکت کرتے ہیں۔ تاکہ آپ لوگوں پتھروں کے آنے کی وجہ جان سکیں۔''

''اب کیا ہوگا؟ ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم کیا کریں؟'' میں انکی بات سن کر پریشان ہوا۔

''آپ کو کچھ زیادہ نہیں کرنا پڑے گا۔ صرف اتنا کریں کہ اس جگہ کو پاک صاف رکھیں اور اپنی والدہ سے کہیں کہ اسی جگہ آکر ان سے معافی مانگیں اور کہیں کہ ہم نے جو کچھ کیا وہ انجانے میں کیا اگر ہمیں پتہ ہوتا کہ یہاں کوئی آباد ہے تو وہ ایسی غلطی ہرگز نہ کرتی۔ اب جبکہ انہیں پتہ چل گیا ہے تو وہ انہیں شکایت کوئی موقع نہیں دیں گی اور اس جگہ کو صاف ستھرا رکھیں گی۔ بدلے میں انہیں بھی یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔''

''بلکل ہم ایسا ہی کریں گے۔'' میں نے کہا۔

''آپکی طرح وہ بھی اچھے جنات ہیں اس لیے آپ لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ورنہ جس طرح بڑے پتھر آپکے گھر میں آکر گرتے ہیں اس سے لازمی کوئی زخمی ہوسکتا تھا۔''

واقعی ان کی بات حقیقت پر مبنی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

صوفی صاحب نے اجازت چاہی تو ہم نے ان سے کہا کہ اگر وہ ایک کپ چائے ہمارے ساتھ پئیں گے تو ہماری عزت بڑھ جائے گی۔

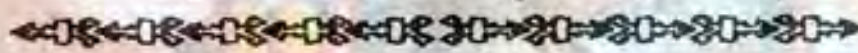
''بیٹا کسی کے کام آنے کا صلہ اللہ دیتا ہے اور مجھے خوشی ہوتی ہے اگر میں کسی کے کام آجاؤں۔ آپ نے پوچھ لیا یہ آپکی مہربانی ہے۔ میں رک جاتا مگر اب مغرب کا ٹائم ہوگیا ہے۔'' وہ کہہ کر چلے گئے اور میں سوچنے لگا کہ واقعی آج تک دنیا میں ان جیسے نیک اور پرہیزگار لوگ موجود ہیں جبھی یہ دنیا قائم ہے۔

☆☆......☆☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

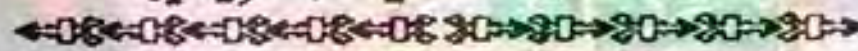
محترم قارئین! "مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ "سچی کہانیاں" میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 500/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی 500/= روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔



(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔



88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

بلند فشار خون کے لیے دوا دستیاب ہے

دانتوں کے جملہ امراض کے لیے اکسیر دوا ہر عمر اور ہر جنس کے افراد کے لیے دستیاب ہے' اپنا آرڈر سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے نوٹ کروائیں۔

عزیز بچو! اللہ تم سب کو خوش رکھے۔ حالات پر اگر گرفت چاہتے ہو تو اپنے رب کو یاد رکھا کرو۔ حالات تنگ ہوں تو صبر کرو اور اچھے ہوں تو شکر' اللہ اپنے اُن بندوں کو جو دکھ میں صبر اور خوشی میں شکر کرتے ہیں بہت عزیز رکھتا ہے۔ نماز کی پابندی کرنے والے کبھی ناکام نہیں ہوتے۔ ہم سب کو چاہیے کہ یہ دعا ضرور کریں' اللھمہ حسبنی حسبان یسراً' ترجمہ: میرے رب میرا حساب سہل رکھنا۔' میرے بچے مجھ سے مختلف ادویات کا پوچھتے ہیں تو بچو میں صرف ضرورتاً ادویات تیار کرتا ہوں کمرشل مقصد تو ہے نہیں لہٰذا جو ادویات درکار ہوں سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے بتا دیا کرو۔ دانتوں اور زخموں کی ادویات' بالوں کا تیل لوگ درجنوں کے حساب سے مانگتے ہیں جس کی وجہ سے سچی کہانیاں کے دفتر میں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے میری گزارش ہوگی کہ جتنی دوا درکار ہے بس اتنی ہی لیں۔ دوسروں کو بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بچیاں اور اکثر حضرات تیل اور شوگر کی دوا گھر کے پتے پر منگوانا چاہتے ہیں وہ ممکن نہیں میری تیار کردہ ادویات صرف سچی کہانیاں کے دفتر سے لی جا سکتی ہیں۔

□ یاسمین جاوید۔ نامعلوم

○ محترم و بزرگ بابا جی السلام علیکم! بابا جی آپ جس طرح سے ہم دکھی لوگوں کی مدد کر رہے ہیں اور ہمارے دین وایمان کو تازہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عظیم دے اور آپ کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھے آمین۔ بابا جی میں پہلے بھی آپ سے بہت سے کاموں کے سلسلے میں رہنمائی لیتی رہی ہوں اور فیض یاب بھی ہوئی ہوں الحمدللہ' آج میں اپنی بیٹی اور بیٹے دونوں کا مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ بابا جی میرا نام یاسمین ہے اور میری ماں کا نام شمیم بانو تھا۔ میری بیٹی کا نام صندل ہے اس کے شوہر کا نام یاسر علی ہے بابا جی مسئلہ یہ ہے کہ صندل کی شادی کو ابھی صرف 14 مہینے ہوئے ہیں اور ابھی سوا مہینے پہلے اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ جس کا نام انہوں نے اقراء رکھا ہے۔ بابا جی بہت دکھ کے ساتھ یہ بات آپ کو بتا رہی ہوں کہ اقراء کا ایک ہاتھ الٹا ہاتھ

چہرے پر رونق نہیں ہے، کیل مہاسے، چھائیاں
ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے خالص
جڑی بوٹیوں سے تیار دوا سچی کہانیاں کے دفتر سے
حاصل کی جاسکتی ہے۔

جنی بایاں ہاتھ پیدائشی طور پر آدھا ہے۔ صرف آدھا
بازو ہے کہنی کا جوڑ بھی نہیں ہے اور یہ بات ہمیں
صندل کے حمل کے ساتویں مہینے کے الٹرا ساؤنڈ
میں پتا چلی۔ باباجی اس وقت تک تو بچہ پورا بن چکا
ہوتا ہے اس میں جان بھی پڑ چکی ہوتی ہے تو اس وجہ
سے ہم اسے ضائع بھی نہیں کرا سکتے تھے۔ بس باباجی
اس بچی کی پیدائش کے بعد سے ہی اس کے شوہر کا
اور سسرال والوں کا رویہ بالکل بدل گیا ہے۔ حالانکہ
بان بند کر کے گھر کے سارے کام بھی وہی کرتی
ہے۔ اور اپنی بیٹی کو بھی خود ہی سنبھالتی ہے کوئی مڑ کر
بھی نہیں دیکھتا اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہ سب تو خدا
کی قدرت ہے صندل کا تو اس میں کوئی قصور نہیں
ہے لیکن رویے اتنی جلدی بدل سکتے ہیں کہ اس کا
شوہر تو بیزار ہو کر اپنی ماں کے ساتھ ان کے کمرے
میں سوتا ہے۔ اور اگر اپنے کمرے میں آتا بھی ہے تو
اپنی ماں کے ساتھ وہ وہیں بیٹھی رہتی ہیں کھاتی پیتی
بھی وہیں پر ہیں۔ مطلب یہ کہ میاں بیوی کو بالکل
بھی بات کرنے کا موقع تک نہیں دے رہیں اس بچی
کا علاج کرانے کے لیے بھی اس نے اپنے شوہر سے
بہت منتیں کی ہیں کہ اب تو ٹیکنالوجی نے بہت ترقی
کر لی ہے آپ اس کو توجہ تو دیں۔ لیکن نہیں سنتا' بابا
جی اگر اس کا پلاسٹک کا ہاتھ لگوا لیں تو کیا یہ صحیح رہے
گا۔ اور اس کے لیے پیسوں کا بندوبست کرنا بھی
ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کیونکہ اس کا شوہر نوکری کرتا
ہے۔ باباجی آپ بزرگ ہیں اللہ والے ہیں۔ ہمیں
مشورہ دیں کہ ہم کیا کریں۔ زندگی کو کیسے لے کر
چلیں باباجی میں ماں ہوں شادی کے ایک ہی سال
میں اپنی بیٹی کی اتنی مشکل زندگی دیکھ کر میرا دل بہت
کڑھتا ہے کیونکہ اقراء لڑکی ذات ہے پہلے ہی
ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کے لیے اتنی مشکلات
ہیں۔ تو بغیر ہاتھ کے تو دنیا اس کے ساتھ کیا سلوک
کرے گی۔ یہ ہمارے لیے ایک بہت بڑا سوالیہ
نشان ہے۔ یہ بھی بتائیں کہ اس کے شوہر کا رویہ اس
کے ساتھ صحیح کرنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے اور
کیا دوسری اولاد پیدا کرنے میں اسے وقفہ دینا
چاہیے یا فوراً ہی دوسری اولاد کا ہونا مناسب ہے۔
باباجی اس کا شوہر باہر دوسری عورتوں کے چکر میں
بھی ہے۔ ہر وقت فون کان سے لگائے ان سے
باتیں کرنا اور میسج بھیجنا اور بیوی کو بالکل بھی کوئی
اہمیت نہ دینا' میں نے صندل کو منع کیا تھا کہ اس سلسلے
میں اپنے شوہر سے کوئی بھی بات نہ کرنا وہ چڑ جائے
گا۔ اس کے اندر اور بھی ضد پیدا ہو جائے گی۔ باباجی
میں اور صندل یہ چاہتے ہیں کہ صندل کے دوسرے
تین جیٹھ ملک سے باہر دبئی میں ہوتے ہیں اور وہ بھی
اپنی ماں کی عادتوں کو دیکھتے ہوئے اپنی فیملیز کو اپنے
بیوی بچوں کو باہر لے گئے ہیں تو یاسر اور صندل بھی
اپنی بچی کو لے کر باہر دبئی میں سیٹ ہو جائیں وہاں
اچھی تنخواہ بھی ہو گی پُر سکون ماحول بھی ہو گا۔ اور اقراء
کے علاج میں بھی سہولت رہے گی۔ تو آپ سے
درخواست ہے کہ اُن کا ویزا بھی دبئی سے آجائے
فیملی کے ساتھ اور نوکری بھی وہاں پر لگ جائے تو اس

کے لیے آپ تعویذ عنایت کردیں اور اس کا ہدیہ بھی بتادیں۔ اور اگر کچھ اور معلومات درکار ہوں تو وہ بھی بتائیں ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔ بس میری بیٹی کا گھر بچ جائے اور اس کی زندگی میں سکون آجائے۔ بابا جی صندل کو بے انتہا قبض کی شکایت ہے بہت تکلیف ہوتی ہے دوائی کے بغیر تو باتھ روم جاتی ہی نہیں تین تین دن گزر جاتے ہیں۔ اس کا کوئی حل بتادیں کیونکہ اسپغول کی بھوسی اور اسی قسم کی بہت سی دوائیاں استعمال کر کے دیکھ لیں اسے فائدہ نہیں ہوا۔ بابا جی دوسرا مسئلہ میرے بیٹے شہ روز کا ہے۔ بیس سال کا ہے ایک جگہ کسی نے کام پر رکھوایا ہے لیکن اتنی مہنگائی کے دور میں کیا سوچ سکتے ہیں ہمارا کرائے کا گھر ہے پھر وہ بچہ پڑھ بھی رہا ہے۔ شوہر میرے اُن کا نام جاوید ہے اور وہ پانی کی سپلائی کا کام کرتے ہیں بجلی گیس کے بل گھر کے کرایہ دکھ بیماری ان ساری چیزوں نے مل کر ہمارا بہت ہی حشر خراب کر دیا ہے۔ بابا جی گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑے کی سی کیفیت رہتی ہے۔ کیونکہ میرا ایک اور بیٹا ہے بڑا ہے 28 سال کا ہے لیکن بیمار ہے۔ اسے دورے پڑتے ہیں۔ پچھلے سات سال سے دنیا کا ہر علاج ہم نے کرا کے دیکھ لیا کتنے ہی مولویوں نے اتنے پیسے کھائے اب ہمارے اندر ہمت نہیں ہے نہ ہی ڈاکٹر سے علاج کرانے کے پیسے ہیں۔ اس کو انتہائی خراب حالت میں کبھی کیچڑ سے کبھی برستی بارش سے کبھی چلتے ہوئے ٹریفک سے اٹھا کر بچا کر لاتے ہیں۔ اس کی زندگی موت کا کوئی بھروسہ نہیں اب تو لوگ اُدھار بھی نہیں دیتے اور ہمارے اندر کسی سستے علاج کے لیے بھی پیسے نہیں سر ڈھکی تو پیر ننگے والی

بات ہے۔ بابا جی میں نے اپنے بچپن سے غربت دیکھی ہے آج تک تو حالات سنبھلے نہیں ہیں آگے کا اللہ جانے دعائیں مانگ مانگ کر بھی زندگی یہاں تک آگئی اب تو دل چاہتا ہے یا تو حالات سنبھل جائیں یا پھر ہم ہی ختم ہو جائیں۔ اور میرا یہ بیٹا جسے دورے پڑتے ہیں اس کی تو تکلیف دیکھی ہی نہیں جاتی۔ میری خواہش ہے کہ اللہ کرے وہ مر جائے اسے موت آجائے کم از کم دنیا والوں کے گندے رویے اور باتیں سننے سے تو بچ جائیں گے وہ بھی اور ہم بھی اوپر سے یہ میری بیٹی صندل کا مسئلہ بابا جی ہماری مدد کریں اللہ کے واسطے ایک تو صندل کے لیے تعویذ عنایت کردیں تا کہ اس کی فیملی باہر سیٹ ہو جائے اس کے میاں کو باہر نوکری مل جائے اور دوسرے میرے بیٹے کے لیے کہ اگر اس کے حق میں بہتر ہے تو اسے بھی باہر نوکری مل جائے تا کہ کچھ زندگی کا ڈھب بدل جائے اور آگے اس کی زندگی بھی سکون سے گزر جائے۔ میں تعویذ کے بہت سارے پیسے نہیں دے سکتی خیال کر لیجیے گا بہت ممنون ہوں گی۔

☆ بیٹی یاسمین! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے بیٹی سے کہو معلومات حاصل کرے ایسے بہت سے ادارے ہیں جو بنا رقم کے اعضا کی پیوند کاری کرتے ہیں بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی مگر بچی کا

اندرونی اور بیرونی زخموں' آپریشن کے بعد ٹانکوں کا کچا رہ جانا یا کسی بھی قسم کی چوٹ کے لیے دوا دستیاب ہے۔ جن گھروں میں چھوٹے بچے ہیں وہاں اکثر کھیل کود کے دوران سر پر چوٹ لگ جاتی ہے ایسے میں یہ دوا سر میں خون جمنے نہیں دیتی' دوا حاصل کرنے کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کریں۔

لاج ہوجائے گا انشاء اللہ..... تم بیٹی اور بیٹے دونوں سے کہو دن میں دو بار گرم پانی میں اسپغول دو چائے کے چمچے ضرور پئیں اس کے علاوہ پانی کا بہت ستعمال کریں کم پانی پینے سے بھی قبض کی شکایت وجاتی ہے۔ بیٹی ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھوان للہ مع الصابرین یہی ورد بیٹی بھی کرے اللہ ضرور سباب پیدا کرے گا۔

□ حاجرہ۔کامرہ۔

o محترم باباجی! السلام علیکم! میں بہت امید لے کر آپ کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کر رہی ہوں۔ باجی! میں بہت مشکلات کا شکار ہوں۔ ہم دو بہنیں یں۔ میری بڑی بہن طلاق یافتہ ہے اور میری بہن کے ساتھ یہ حادثہ صرف میرے والد کی وجہ سے ہوا ہے وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ اچھی صحت ہونے کے وجود اپنے آپ کو بیمار ظاہر کرتے ہیں۔ ہر وقت امی سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ اب میری بہن یک کمپنی میں ملازمت کرتی ہے اور ہم لوگوں کا پیٹ لتی ہے مگر میرے باپ کو ذرا سی بھی غیرت ہیں ہے۔ سارے خاندان والے ہم پر باتیں اتے ہیں۔ میں لوگوں کی طنز بھری نگاہوں کو داشت کر کر کے بھی تھک گئی ہوں۔ ہر کوئی ہمیں س بات کا طعنہ دیتا ہے کہ بہن کے ٹکڑوں پر پل ہے ہیں۔ میں اس گھر کے جہنم سے نکلنا چاہتی وں لیکن میری شادی بھی نہیں ہو رہی۔ کوئی بھی رشتہ آتا ہے تو سب سے پہلے یہی پوچھا جاتا ہے کہ باپ کیا کرتا ہے؟ لیکن ہمارے پاس تو اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ہم لوگ اتنا جہیز بھی نہیں دے سکتے۔ کوئی ایسا کلام الٰہی بتائیں کہ میرا کسی شریف اور پڑھے لکھے گھرانے سے رشتہ آئے اور میری شادی ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ شکریہ۔

☆ بیٹی حاجرہ! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو' وہ ضرور کرم کرے گا۔ نماز عشاء کے بعد یَامُتعالی کا ورد کرو 11 تسبیح پھر حاجت بیان کرو۔ یہ وظیفہ 41 روز کرو۔ بہت اسباب پیدا ہوں گے۔

□ نوین علی۔یو ایس اے۔

☆ بیٹی! تمہارا خط پڑھا' یقین جانو' بہت دکھ ہوا۔ بہرحال جو ہوا' سو ہوا۔ بہتر یہی ہے کہ اس شخص سے واسطہ ختم کرلو۔ اس میں تمہاری اور تم سے زیادہ بچوں کی بھلائی ہے۔ بیٹی کا بہت خیال رکھا کرو۔ نماز کی پابندی رکھو۔ صبح و شام بچوں پر اور اپنے اوپر آیت الکرسی پڑھ کر حصار کر دیا کرو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور جہاں جہاں لفظ ''مُبین'' آئے' وہاں رک کر 7 بار سورۃ فاتحہ پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔ مجھے حالات سے مطلع رکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

بچیاں جن کی شادی میں رکاوٹ ہے اپنی والدہ کے نام کے ساتھ لکھیں کلام الٰہی سے شرطیہ علاج انشاء اللہ چند دنوں میں رکاوٹ دور ہوں گی اور من پسند شخص ملے گا۔

شعر و سخن

غزل

ہم سے وفا کے بارے میں جو پوچھنا ہے پوچھ لو
لیکن وفا کی کیا ہے سزا نہ پوچھنا
راہ وفا میں ہم پر جو گزری وہ پوچھ لو
منزل پر کیا معاملہ ہو یہ نا پوچھنا
چاہت کی داستان تو ہے ذاتی معاملہ
توڑا ہے کس نے عہد وفا یہ نہ پوچھنا
راستے میں کون کون ملا پوچھ عشق سے
کس کس کا ساتھ چھوٹ گیا یہ نہ پوچھنا
کیا ہم نے دیا زندگی کو یہ سب کو یہ خبر
کیا زندگی نے ہم دیا یہ مت پوچھنا

خضرت حیات۔روڑہ تھل

غزل

اندھیروں میں
اجالوں میں
محبت کے جیالوں میں
کہیں ایک نام آتا ہے
کہیں ایک پیغام آتا ہے
جیسے ہم پیار پیار کرتے ہیں
وہیں اک نام آتا ہے
محبت مر نہیں سکتی
محبت امر ہے پیار ہے پاکیزہ
اگر سچا ہو جذبہ تو
محبت مر نہیں سکتی
سدا یہ ساتھ رہتی ہے
جس سے ہم پیار کرتے ہیں
اسی کے پاس رہتی ہے

ایم وسیم۔روڑہ تھل

مرحومہ خالہ کے لیے

لو تھر تھرا اٹھی ہے دیے کی کیوں دیکھنا
وقت اجل قریب ہے یا دور دیکھنا

............*

مرحوم بھائی منیر خان کے لیے

میری حیات کی سانسیں تمام تر لے کر
حیات جاوداں دے دے تو میرے بھائی کو

نفیسہ فضل۔کراچی

غزل

پہلے اپنی محبت کا اسیر کیا تُو نے
پھر اپنے ہجر میں دلگیر کیا تُو نے
پہلے خواب دکھائے محبت کے شہنشاہی کے
پھر ہمیں لوٹ کر فقیر کیا تُو نے
پہلے خوشیوں سے بھر دیا دامن ہمارا
پھر اِس دل کو غموں کی جاگیر کیا تُو نے
پہلے کی میٹھے میٹھے لفظوں سے جادوگری
پھر اِن ہی لفظوں کو تیر کیا تُو نے
حل نہ ہو سکے جو کبھی بھی کسی سے
ایسی اُلجھی ہوئی ہمیں تدبیر کیا تُو نے
نہ اپنے زخم دکھا سکے نہ رو سکے بخاری
ایسی بے بسی کی ہمیں تصویر کیا تُو نے

(نامعلوم)

غزل

میں نے لاکھ چاہا کہ غم میرا رہے خاموشی کے حصار میں
میری خاموشی کو سمجھ گیا میرا دوست کتنا ذہین تھا
میرے دل کو کتنا سکون تھا میرا ماضی کتنا حسین تھا
میرا چین اس نے چرا لیا جو میرے سکوں کا امین تھا
نہ گلہ ہے شعلہ طور سے نہ یہ آگ آئی تھی دور سے
میرا گھر اسی نے جلا دیا مجھے جس پر پورا یقین تھا

............*

اے موج بلا تیرے برابر کے نہیں ہیں
دریا کے شناور سمندر کے نہیں ہیں
نفرت سے نہ دیکھو ہمیں بے کار سمجھ کر
ہم لوگ اسی گھر کے ہیں باہر کے نہیں ہیں
کل تک جنہیں آتا نہ تھا جینے کا سلیقہ
وہ آج یہ کہتے ہیں کہ برابر کے نہیں ہیں
یہ اشک ندامت ہے نسیم اس کی نہ پوچھو
موتی ہیں یہ پلکوں کے سمندر کے نہیں ہیں

............*

دل میں ہماری یاد بسا کر تو دیکھتے
حق دوستی کا کچھ بھی نبھا کر تو دیکھتے
شک رہ گیا تھا گر تمہیں میرے خلوص پر
جو اور ستم کچھ اور بڑھا کر تو دیکھتے
تم میرے ذہن و دل میں سمائے ہوئے تو ہو
مجھ کو بھی اپنے دل میں سما کر تو دیکھتے
سمیہ نسیم۔ انڈیا' پٹنہ

انمول تحفہ

یا الٰہی نرم تکیہ باعث عشرت رہے
سونے والا سو رہا ہے جاگتی قسمت رہے
رات بھر جس نے سلایا وہ کارساز ہے
تکیہ سے سر اٹھالے کہ اب وقت نماز ہے
بنا ہے تختہ یاسمین بستر!
ہوا ہے دستہ نسرین و نسرین تکیہ
محمد حنیف شاکر۔ بھاگووالی

غزل

ذکر تیرا ہی یار ہوجائے
تو بھی خوشیوں سے ہمکنار ہوجائے
جیون میں کبھی آئے نہ تری خزاں
بس یوں ہی جشن بہار ہوجائے
کتنا روئی ہوں اے جان جاں تیرے بنا
آنکھ تیری بھی اشکبار ہوجائے
جب سے تو نے میرا قرار لوٹا ہے
کاش تو بھی بے قرار ہوجائے
چاند تو چھپ گیا ہے بدلی میں
جگنوؤں کا انتظار ہوجائے
انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے
اب تو تیرا دیدار ہوجائے
فریدہ فری۔ لاہور

غزل

میرا مقصد بتانا اُسے جانے کی جلدی تھی
مجھے بھی دکھ سنانا تھا اسے جانے کی جلدی تھی
نہیں تھا وقت پاس اس کے کہ سنتا داستاں میری
بڑا لمبا فسانہ تھا اسے جانے کی جلدی تھی
بڑی مدت کی خواہش تھی مگر پیاسی رہی میں تو
گلے اُس کو لگانا تھا اُسے جانے کی جلدی تھی
نہیں ٹھہرا وہ اک لمحہ جو راتیں ٹھہر جاتا تھا
تعلق تو پرانا تھا اسے جانے کی جلدی تھی
میں محسن روکتا کیسے کہ رکنا تھا کہاں اُس نے
اسے ہر حال جانا تھا اُسے جانے کی جلدی تھی
نفیسہ فضل محمود

غزل

کس سے کروں اپنی حالت بیاں
درد کا اٹھا ہے عجب طوفاں
ملتا نہیں سکون اس دنیا میں
ہر پل اس کی یادوں کا سماں
محبت میں گزارا ممکن نہ تھا
پھر کی میں نے عاشقی افشاں
جھوٹے وعدے جھوٹی قسمیں کھا کر
کر گیا وہ اپنی حقیقت عیاں
کتنی چاہت سے کی تھی وفا
تیرے چھوڑنے سے ہوا ویران
افسوس وہ جان نہ پایا فیصل
وہ ہی تو تھا میرا سارا جہاں
فیصل مشتاق۔قبولہ شریف

غزل

اس کے لبوں سے جو لفظ ادا ہوں گے
نصیب ان فقیروں کے بھی کیا ہوں گے
سنا ہے گل کھلتے ہیں ان کے مسکرانے سے
سننے والے بھی ایسے ہی ہم نوا ہوں گے
میں اسے مانگ تو لوں رب سے جا کر
پتا نہیں فیصلے قدرت کے کیا ہوں گے
اس کی یادیں جب حد سے گزر جائیں گی
میری آنکھوں تب تب آنسو رواں ہوں گے
میں کہاں جاؤں اس دل بے قرار کو لیے
اس کی یاد کے لمحے تو ہر جگہ ہوں گے
ان کی وفاؤں کا ملن ہوگا جنہیں نصیب
وہ خوش نصیب زمانے سے جدا ہوں گے
چوٹ عشق کی کھا کر بھی جو مسکرائیں
حسن جیسے وہ صبر کی انتہا ہوں گے
ایم حسن نظامی۔قبولہ شریف

غزل

بات چھوٹی پھر فسانہ بن نہ جائے سوچ لو
دوستی ہی تازیانہ بن نہ جائے سوچ لو
کسی سے چھپنے کے لیے تم یوں مقید ہو گئے
گھر تمہارا قید خانہ بن نہ جائے سوچ لو
آج ہے جس دل پہ اتنا ناز تجھ کو دلربا
حسرتوں کا آستانہ بن نہ جائے سوچ لو
ان کی آنکھیں کہہ رہی ہیں بچ کے رہنا غافلو
پھر کسی کا دل نشانہ بن نہ جائے سوچ لو
شکوہ بے جا نہ غیروں سے کرو اتنا ہنوز
دشمنی سے دوستانہ بن نہ جائے سوچ لو
یہ تیری مجبوریاں یہ دُوریاں یہ فاصلے
قربتوں کا اک بہانہ بن نہ جائے سوچ لو
سایہ دیوار چھنا ہم سے مانا ٹھیک ہے
تیرا آنچل شامیانہ بن نہ جائے سوچ لو
بے اجازت دل میں شاکر کے نہ آنا پھر کبھی
میرا مجرم تو ہی جاناں بن نہ جائے سوچ لو
محمد حنیف شاکر۔بھاگووالی

رُلاتی پھر کیوں ہیں یہ اولادیں

اک چھوٹا سا ننھا سا بیج بویا تھا جب ہم نے
کتنی محبت اور کتنی محبت سے اسے پروان چڑھایا
سخت گرمی میں اسے ہمیشہ ٹھنڈا سا رکھا
سخت سردیوں میں اسے ہمیشہ گرم سا رکھا
بچایا ہمیشہ اسے زمانے کے سرد و گرم سے
رلاتی پھر کیوں ہیں آج یہ اولادیں
ڈال دی خدا نے حد درجہ محبتیں ماں باپ کے دل میں
اپنی ہر آن ہر مان ہر احساس نچھاور کیا ان پر
کاٹ کاٹ کر پیٹ اپنا سونے نہ دیا کبھی اُن کو بھوکا

مرغ و مسلم قورمہ بریانی دال روٹی سب کھلایا ان کو
اپنی ہستی اپنا مان تن من کچھ تو کچل دیا ہم نے
رلاتی پھر کیوں ہیں آج یہ اولادیں
زندگی کتنی مول اور بے نذر ہو گئی ہے
دیکھیے ستم ظریفی کہ یہ ارمان تھا دل میں
کوئی کہے گا نانا تو کوئی کہے گا دادا
تو کوئی کہے گا نانی اور کوئی کہے گا دادی
بس اب یہ آوازیں بازگشت سی بن گئی ہیں
رلاتی پھر کیوں ہیں یہ اولادیں
کیا سوچا تھا کہ بنے گی اولاد اپنا مان اپنا سہارا
گزر جائے گا بڑھاپا شاید شان سے اور سکون دل سے
لیکن کاتب تقدیر نے کیسا گل کھلایا ہے کہ
اب آنکھوں میں آنسو صدا بہتے ہی تو رہتے ہیں
دل ناداں یہ زندگی کتنی بوجھ بن گئی ہے
رلاتی پھر کیوں ہیں یہ اولادیں

کاش ہم پڑھے لکھے ہوتے

اے دل ناداں یہ ہم کیا کر بیٹھے
اپنے ہی مقصد کو کھوتا سا کر بیٹھے
نہیں دی کبھی اہمیت تعلیم علم کو ہم نے
کہ کاش ہم پڑھے لکھے ہوتے
ہر معاملے میں ہر معمول میں ہم رہے پیچھے
نہ کوئی سوجھ بوجھ رہی اور نہ ہی کوئی قدر
ہر کوئی مذاق سا اڑاتا ہماری نااہلی پر
کہ کاش ہم پڑھے لکھے ہوتے
کتنا کہتے تھے کہ سب ارے پڑھ لو ارے پڑھ لو
وقت کی گرد اور وقت اہمیت کو ہاتھ سے نہ جانے دو
زندگی مہلت کی اس قیمتی شے کو نہ ضائع کرو
کہ کاش ہم پڑھے لکھے ہوتے

کتنے بے بس ہیں آج ہم اور نوکری ہم سے دور
اٹھا رہے ہیں اینٹیں تو کبھی کسی کا سامان ڈھوتے
جاہل ہی رہ گئے ہم آج سب سمجھتے ہیں ہمیں مزدور
کہ کاش ہم پڑھے لکھے ہوتے
کس شانِ بے نیازی سے لوگ گزر جاتے ہیں
کیسی بے قدری سی کی ہے ہم نے تعلیم زندگی کی
آج لمحہ لمحہ یاد کر کے لمحے لمحے مرتے ہی تو ہیں ہم
کہ کاش ہم پڑھے لکھے ہوتے
دولت عیش ہی کو اپنا سامان ہی کر ڈالا
ماں باپ کی کتنی آرزوؤں کو کچل ڈالا
اپنے اور بے گانے سب کو پرایا سا کر ڈالا
کہ کاش ہم پڑھے لکھے ہوتے
آج کی دنیا پڑھے لکھوں اور قابلوں کی ہے
زندگی تو صحیح معنوں میں ایک مسافر کی ہے
سر ہی تو جھکا ہوا ہے آج اور کیسی ندامت سی ہے
کہ کاش ہم پڑھے لکھے ہوتے

از رفعت خان

دسمبر

اس سے بچھڑے زمانہ گزرا
لیکن میرے دل سے
روگ نہیں جاتا
برسوں بعد بھی
ہر دسمبر کی لمبی رات
اس کی یادوں کو سینے سے لگائے
آہیں، سسکیاں بھرتے
میں سوگ مناتا ہوں

مور شاہد حسین

☆☆......☆☆

پاکستانی شوبز

شوبز سے جڑی تہلکہ خیز خبریں......

اور نئی ریلیزز......

ادارہ

لمبی جدائی

مشہور زمانہ شیف جناب طاہر چوہدری جو اپنی سہل تراکیب کی وجہ سے خواتین میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ ہفتہ کی شام حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال کر گئے شیف طاہر نے اپنے کیرئیر کی ابتدا دبئی کے مشہور ہوٹل سے کی۔ پاکستان آنے سے قبل شیف طاہر نے فرانس اور اٹلی میں بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ شیف طاہر کے فینز کے لیے ان کا یوں اچانک چلے جانا انتہائی صدمے کا باعث ہے۔ اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور



لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

وقت کا زیاں

فضا علی جو شوبز انڈسٹری کا ایک روشن ستارہ ہیں اپنے فینز کو پچھلے دنوں کافی حیران کر گئیں۔ بظاہر ٹھیک ٹھاک نظر آنے والی شادی اچانک طلاق پر ختم ہوگئی۔ پہلی شادی سے فضا کی ایک بیٹی بھی ہے لوگوں کو اُن کی طلاق کا اس وقت پتہ چلا جب ان کی دوسری شادی کی خبر لیک ہوئی۔ ہر روز مختلف مارننگ شوز پر نظر آنے والی فضا کا کہنا ہے کہ اب ایک اور نجی چینل سے جاری اپنے شو پر توجہ دیں گی اور اس کے بعد اپنی گھریلو زندگی پر...... (ہم تو پہلے بھی کہتے تھے کہ مارننگ شوز سوائے وقت کے زیاں کے اور کچھ بھی نہیں)

بینڈ' باجا اور بارات

مایا علی نے عثمان خالد بٹ سے شادی کرلی۔ جی ہاں موجودہ دور کی سب سے مشہور اور پسندیدہ اور طیفا ان ٹربل ہیروئن مایا علی نے عثمان خالد بٹ سے خاموشی سے نکاح کرلیا ہے۔ خبر تو یہ بھی ہے کہ سجل علی اور احد میر بھی جلد رشتہ ازدواج میں جڑنے والے ہیں۔ شوبز سے جڑے لوگوں کو عوام بے انتہا پسند کرتے ہیں اور اُن کی ذاتی زندگی کے بارے میں



جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں اس لیے بعض اوقات جھوٹی خبریں بھی پھیلائی جاتی ہیں مگر ان کا مقصد دل آزاری سے زیادہ خواہش محسوس ہوتا ہے۔ اب دیکھیے یہ دونوں خبریں افواہیں رہتی ہیں یا سچی خبر بن جاتی ہیں۔

Donkey King

جیو فلم کے زیر اہتمام تیار کی جانے والی اینیمیٹڈ فلم پورے طمطراق کے ساتھ ملک بھر کے سینما ہالز پر چھا گئی ہے۔ فلم نے ریلیز کے پہلے دن ہی ریکارڈ



بزنس کیا۔ بظاہر تو فلم بچوں کے لیے بنائی گئی ہے مگر ریلیز سے قبل کچھ سیاسی محسوس ہونے لگی تھی۔ فلم کے مختلف کرداروں کی آوازوں کے لیے مشہور اداکاروں کا انتخاب کیا گیا جیسے ڈونکی کی آواز جان ریمبو یعنی افضل خان کی ہے۔ ان کے علاوہ حنا دل پذیر، عرفان کوسٹ، جاوید شیخ، شفاعت علی، عدیل ہاشمی، مانی اور کئی فنکار شامل ہیں۔ فلم کی نمائش سے پہلے اس کی خوب پبلسٹی کی گئی تھی مگر ہمارے ہاں ایک نیا چلن آ گیا ہے کہ مشہور کرنے کے لیے Controversy ضرور پیدا کی جاتی ہے وہ کہتے ہیں نا کہ بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔

آج کا ڈرامہ

آج کل مختلف چینلز سے جو ڈرامے پیش کیے جا رہے ہیں ان میں کچھ ہر اعتبار سے اچھے ڈراموں کی فہرست میں آتے ہیں کچھ کمزور اسکرپٹ کی وجہ سے وہ جگہ نہیں بنا پاتے جس کی امید ہوتی ہے اور کچھ میں اداکاری کمزور ہوتی ہے۔ مگر آج کل ایک نئی مشکل بھی سامنے آ رہی ہے، ڈرامے میں معاشرتی برائیوں کو بہت کھول کر دکھایا جاتا ہے کیا کسی نے سوچا کہ ایسے ڈرامے دیکھنے والے کم عمر بچوں پر کیا اثر ڈالتے ہوں گے۔ وہ بچی جو ایسے ڈرامے میں کام کر رہی ہوتی ہے وہ کیا سوچتی اور سمجھتی ہوگی۔ ہمارا ماننا یہ ہے کہ معاشرتی برائیوں کی نشاندہی ضرور ہو مگر بے حیائی کو بڑھاوا نہیں ملنا چاہیے۔ بات ڈھکے چھپے انداز میں بھی کی جا سکتی ہے اور وہ سمجھ میں بھی آتی ہے۔ یہاں کچھ ڈراموں کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے جیسے حیوان، میرے خدایا، میری باجی، اڈاری وغیرہ شامل ہیں۔ جن کی کاسٹ بلاشبہ بہترین ہے، مسئلے کو بھی اجاگر کیا گیا مگر تکلیف دہ مناظر کو فلمانا ضروری نہیں تھا۔

اونچی اڑان

صبا قمر نے ہالی وڈ فلم سائن کر لی۔ جی ہاں یہ افواہ نہیں بلکہ پکی خبر ہے۔ صبا قمر آج کل لاہور میں رہائش پذیر ہیں اور جلد امریکہ کے لیے اڑان



بھرنے والی ہیں جہاں وہ ہالی وڈ کے سپر اسٹار Ben Afflec کے مدمقابل اپنا کردار نبھائیں گی۔ اس سے قبل صبا نے بالی وڈ فلم میں عرفان خان کے مدمقابل اداکاری کے جوہر دکھائے تھے بلاشبہ فلم ہندی میڈیم میں صبا کی اداکاری قابل تعریف ہے شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں امریکہ سے اتنی بڑی فلم کی آفر آئی صبا ابھی فلم کے بارے میں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتیں مگر ان کا کہنا ہے کہ میرے فینز کو مایوسی نہیں ہوگی۔

☆☆......☆☆